ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

مارچ-اپریل ۲۰۱۹ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۹-۱۰ | رجب-شعبان ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00 روپے
سالانہ: 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00 روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdur Rehman Naeem, Mob. 9546692993; email-arehman412@yahoo.in

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

فہرست مجموعۂ مقالات سیمینار

۱۔	ابتدائیہ	اظہار تشکر	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴
۲۔	خطبۂ استقبالیہ	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ-افکار وخدمات	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶
۳۔	کلیدی خطبہ	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی-ایک مفکر اور دانشور	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۰
۴۔	تاثرات	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	۱۵
۵۔	// //	مولانا واضح رشید ندوی-تاریخ ادب کا ایک روشن باب	پروفیسر اقبال حسین ندوی	۱۸
۶۔	صدارتی خطاب	مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۲۰
۷۔	سلسلۂ مقالات	مولانا واضح رشید حسنی ندوی اور قرآنیات پر ان کی تحریریں	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۲۲
۸۔	// //	سنگِ بنیاد-مولانا محمد واضح رشید ندویؒ	پروفیسر ابوسفیان اصلاحی	۲۵
۹۔	// //	مولانا واضح رشید ندویؒ بہ حیثیت مربی	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۳۱
۱۰۔	// //	جلیل القدر مربی-واضح رشید ندویؒ	پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی	۳۴
۱۱۔	// //	حضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ-حیات وخدمات	محمد قمر الزماں ندوی	۳۷
۱۲۔	// //	مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ بحیثیت ادیب وماہر زبان	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۴۱
۱۳۔	// //	إلی نظام عالمی جدید-ایک تفصیلی مطالعہ	محمد غزالی ندوی	۴۶
۱۴۔	// //	مغربی افکار ونظریات پر مولانا واضح رشید ندوی کی تنقید	محمد طارق رامپوری ندوی	۵۲
۱۵۔	// //	مولانا واضح رشید حسنی ندوی اپنے افکار کے آئینہ میں	محمد پاشا ندوی	۵۵
۱۶۔	// //	مولانا واضح رشید حسنی کی فکر کے تشکیلی عناصر	محمد فرید حبیب ندوی	۶۵
۱۷۔	// //	..... "صور و اوضاع" کی تحریروں کے آئینے میں	محمد عبداللہ بن شمیم ندوی	۶۷
۱۸۔	// //	نظام تعلیم وتربیت، اندیشے تقاضے اور حل: ایک مطالعہ	ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی	۷۶
۱۹۔	// //	مولانا محمد واضح رشید ندوی کی تحریروں میں قرآنی استدلال	ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی	۸۱

۲۰۔	// //	ادب اہل القلوب کی فنی عظمت	پروفیسر سید احتشام احمد ندوی	۸۹
۲۱۔	// //	''اِلی نظام عالمی جدید'' ایک معروضی مطالعہ	ڈاکٹر شاکر فرخ ندوی	۹۴
۲۲۔	// //	الغزو الفکری-ایک تجزیاتی مطالعہ	ابوسعد اعظمی	۹۹
۲۳۔	// //	مختصر تاریخ ثقافت اسلامی-ایک مطالعہ	محمد جرجیس کریمی	۱۰۲
۲۴۔	// //	الدعوۃ الاسلامیۃ و مناھجھا فی الھند-ایک مطالعہ	محمد انس صدیقی	۱۰۵
۲۵۔	// //	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی بحیثیت مفکر و دانشور	ابوفہد، نئی دہلی	۱۱۱
۲۶۔	// //	''تعلیم و تربیت'' اور مولانا واضح رشید حسنی کا موقف	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	۱۱۷
۲۷۔	// //	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی تحریروں میں قرآنی فکر	ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری	۱۲۴
۲۸۔	// //	نظام تعلیم و تربیت-ایک مطالعہ	کمال اختر قاسمی	۱۳۰
۲۹۔	// //	مولاناؒ کی فکر "صور و أوضاع" کے آئینہ میں	ڈاکٹر محمد ریحان ندوی	۱۳۴
۳۰۔	// //	مصادر الأدب العربی ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی	۱۳۸
۳۱۔	// //	''محسن انسانیت'': ایک مطالعہ	ڈاکٹر ندیم اشرف	۱۴۰
۳۲۔	// //	منہج تربیت اور مولانا واضح رشید حسنی ندوی رحمہ اللہ کا نظریہ	محمد شعیب ندوی	۱۴۴
۳۳۔	// //	مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ ایک مفکر و دانشور	ڈاکٹر ریحان اختر	۱۴۷
۳۴۔	// //	مولانا کے تحریر کردہ پیش لفظ اور مقدمے-ایک جائزہ	عبدالہادی اعظمی ندوی	۱۵۱
۳۵۔	// //	ادب نبوی اور استاذ محترم مولانا واضح صاحب کا نقطہ نظر	غیاث الاسلام صدیقی ندوی	۱۵۶
۳۶۔	// //	أعلام الأدب العربی فی العصر الحدیث-ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر فخر عالم	۱۶۱
۳۷۔	// //	نظامِ تعلیم و تربیت (اندیشے، تقاضے اور حل)-ایک جائزہ	محمد حماد	۱۶۳
۳۸۔	// //	تاریخ در گذشت-دانشمندِ بزرگ.....	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۱۶۸

☆☆☆

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

ابتدائیہ

اظہار تشکر

ندائے اعتدال کا شمارہ بابت مارچ-اپریل آپ کے ہاتھوں میں تاخیر سے پہنچ رہا ہے، اصولی طور پر اس کا اعلان پہلے سے کرنا چاہیے تھا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں، دراصل جو کچھ ہوا اچانک ہوا، مشیت الٰہی اور توفیق الٰہی سے ہوا، ۲۴ فروری کو مدرسۃ العلوم الاسلامیہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق معتمد تعلیم **"حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی- افکار و خدمات"** کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کیا گیا، اور اتنی خاموشی سے منعقد کیا گیا کہ مدعو حضرات کے علاوہ کسی کو اطلاع نہیں دی گئی، قلت وسائل اور موضوعیت کا لحاظ پیش نظر ہونے کے سبب یہ طریقہ اختیار کیا گیا، سیمینار میں تقریباً ۳۳ مقالات پڑھے گئے اور متعدد بزرگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، کہنا یہ چاہیے کہ صاحبِ سیمینار جس قدر خاموش طبیعت کے مالک تھے اسی قدر خاموشی سے یہ سیمینار ہوگیا۔

یہ یک روزہ سیمینار الحمدللہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب رہا، اس قدر قلیل مدت میں اتنے مقالات جمع کر لینا کوہ کنی سے کم نہیں، پھر ایک دن میں سارے مقالات کو پیش کرنے کا وقت ملنا خواہ تین چار منٹ میں تلخیص ہی پیش کی گئی، عام صورتحال کو دیکھتے ہوئے یہ خود ہی بہت مشکل کام ہے، جو بحسن خوبی انجام پا گیا، سیمینار کو ہم نے علی گڑھ تک محدود رکھا تھا، بیشتر نوجوان اہل قلم سے درخواست کی تھی جن میں کئی ایک راقم سطور کے شاگرد عزیز تھے، ان کے مقالات دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی اور دل سے دعائیں نکلیں، ہماری خوش قسمتی تھی کہ دہلی سے بھی بعض نوجوان دانشور اور اہل کرم بزرگ تشریف لے آئے، سہارنپور سے ہمارے ایک دوست آ گئے، جس کے سبب یہ ایک مختصر سیمینار کامیاب اور جامع نیشنل سیمینار ہوگیا، فالحمدلله على ذلك۔

سیمینار میں مولانا کی مختلف کتابوں کا تجزیہ پیش کیا گیا، ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کے افکار کو موضوع بنایا گیا، اور یہ سب اس مشکل کے باوجود ممکن ہوا کہ مولانا کی کتابیں عام طور پر دستیاب نہیں ہیں، حتی کہ مسلم یونیورسٹی کے مکتبات بھی مولانا کی قیمتی تحریروں سے خالی ہیں، پی ڈی ایف سے سب لوگ استفادہ نہیں کر پاتے اور کرنا بھی نہیں چاہیے، اصل کتاب سے استفادہ کی بات ہی کچھ اور ہے، یہی وجہ ہے کہ موضوعات میں تکرار بھی ہوا ہے، لیکن اس تکرار سے بھی نئے پہلو سامنے آئے ہیں، سب سے زیادہ لوگوں نے مولانا کی کتاب "نظام تعلیم وتربیت" کو موضوع بنایا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع کے تئیں لوگوں میں کس قدر حساسیت اور اضطراب پایا جاتا ہے، مولانا کی اس کتاب پر لکھے گئے مقالات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی فکر کس قدر پختہ روشن اور سلیم تھی، ضرورت ہے کہ اس موضوع کو آگے بڑھایا جائے اور مولانا کے فکری خاکوں میں رنگ بھر کے عملا ان سوالات کا جواب دیا جائے جو اس کتاب کے مطالعہ سے بے ساختہ پردۂ ذہن پر ابھرتے ہیں، بہرحال اب جو کچھ بھی ہے اور جس معیار کا ہے وہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، امید ہے کہ قارئین ان مقالات سے استفادہ بھی کریں گے اور اپنے مفید آراء اور مشوروں اور دعاؤں سے بھی نوازیں گے۔

اس سیمینار کی کامیابی کے لیے ہم اپنے بزرگوں، سرپرستوں اور منتظمین کے شکر گذار ہیں جن کی دعائیں ہمیشہ شامل حال رہتی ہیں، اپنے رفقاء کار کے لئے سراپا سپاس ہیں جو مخلصانہ طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، سب کے سب

راقم سطور کا ہر طرح تعاون کرتے ہیں، اس موقع پر بھی سب نے الگ الگ طریقہ سے محنت کی اور بھرپور انداز میں اپنی ذمہ داری پوری کی، وہ رفقاء دوہرے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے سیمینار میں مدرسہ کی علمی زندگی کی کامیاب اور بھرپور نمائندگی کرتے ہوئے عمدہ اور معیاری مقالات سپرد قلم کیے، اللہ ان سب حضرات کو دن دونی رات چوگنی ترقیات سے نوازے، وہ لوگ ہر طرح سے ہمارے اور ہمارے ادارہ کے شکریہ کے مستحق ہیں جن کی آمد سے اس مذاکرہ علمی کے وقار میں اضافہ ہوا، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب، اپنی مصروفیت کے باوجود تشریف لائے اور پُر مغز ومخلصانہ گفتگو سے افتتاحی نشست کو یادگار بنادیا، پروفیسر سعود عالم قاسمی صاحب نے نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کی بلکہ بہت بلیغ وجامع خطاب کیا اور اپنی مرتب گفتگو سے تمام سامعین کو متاثر کیا، پروفیسر اقبال حسین ندوی بھی حسن اتفاق سے شریک سیمینار ہوئے اور اپنی عالمانہ گفتگو سے مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا، پروفیسر محسن عثمانی صاحب کے کلیدی خطبہ کا کیا کہنا کہ وہ نہ صرف رشکِ قلم وقرطاس تھا بلکہ اس کی بعض تعبیرات کانوں میں رس گھول رہی تھیں اور دلوں پہ دستک دے رہی تھیں، اللہ ان سب بزرگوں کو سلامت رکھے اور ان کی عمریں دراز فرمائے، پروفیسر محمد راشد ندوی جو مولانا اور مولانا کے خانوادہ سے بڑا قریبی تعلق رکھتے ہیں اپنی علالت کے سبب تشریف نہ لا سکے، جس کا افسوس رہا۔

دہلی سے پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی تشریف لائے، ایک نشست کی صدارت کی، مولانا کی ادبی، صحافتی اور انسانی خصوصیات پر بلیغ انداز سے روشنی ڈالی، بعد میں اپنی اس تقریر کو خود ہی تحریری شکل میں ارسال فرمادیا، پروفیسر ظفر الاسلام صاحب اپنی علالت اور خاندانی حادثہ کے باوجود نہ صرف تشریف لائے بلکہ دیر تک شریک رہے، اور ایک اچھی گفتگو کی، ہم نے اس کو رکارڈنگ سے نقل کرانے کا اہتمام کیا ہے، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک قیمتی مضمون لکھا، ایک نشست کی صدارت کی ذمہ داری قبول کی اور آخر میں مولانا کی ذاتی صفات پر تفصیل سے روشنی ڈالی، ہم ان تمام حضرات کا جس قدر شکریہ ادا کریں کم ہے، اور جو حضرات بھی تشریف لائے اور انھوں نے ہماری درخواست پر اپنی قیمتی تحریر کے ساتھ اس سیمینار میں شرکت کی وہ ہر طرح سے ہمارے شکریہ، اعتراف اور تقدیر واحترام کے مستحق ہیں خواہ اساتذہ ہوں یا ریسرچ اسکالر، ناموران علم وتحقیق ہوں یا نو وارد اہل قلم ہمارے لیے سب کا یکساں طور پر شکر واحترام واجب ہے، جو حضرات اپنی شدید خواہش کے باوجود بوجوہ شریک نہ ہو سکے ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب ان ہی لوگوں میں تھے جنہوں نے خوشی کا اظہار کیا، حوصلہ افزائی کی، مقالہ بھی لکھا، اتفاق یہ ہوا کہ وہ شریک نہ ہو سکے، بہت سے محبین ومخلصین ومتعلقین کو ہم نے بحیثیت سامع مدعو کیا تھا، دیر تک ان حضرات کی موجودگی ہمارے لیے بہت حوصلہ افزا تھی، اللہ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے، ہمارے جن عزیزوں (مولوی محمد عالم سلمہ، مولوی محمد سہیل سلمہ نے کچھ تقاریر کو رکارڈنگ سے کاغذ پر نقل کیا ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں، اسی طرح عبدالرحمٰن ندوی کے شکر گذار ہیں جنھوں نے بڑی تندہی سے اس کی ترتیب وتزئین کا عمل انجام دیا۔ آخر میں اس بابت معذرت بھی پیش کرنا ضروری ہے کہ قصداً ہم کو قلت وسائل کے سبب حروف (font) چھوٹا رکھنا پڑا، ورنہ مواد کی وجہ سے ضخامت بڑھ جاتی، اگر پڑھنے میں دقت ہو تو ہمیں معاف فرمائیں۔

فجزاهم الله جميعا خير الجزا
ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم

والسلام
محمد طارق ایوبی

خطبۂ استقبالیہ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ-افکار وخدمات

حضرات گرامی!

آج ہم سب علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، علی گڑھ کے تحت چلنے والے اداروں میں نمائندہ ادارے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ میں جمع ہیں، ظاہر ہے کہ جس عنوان پر جمع ہیں اس کے ذکر سے دلوں کا مضطرب ہونا لازمی سی بات ہے، مگر دستور قدرت سے کس کو رستگاری ہے، اب تو جانے والی شخصیت کے افکار وخیالات ہیں، ان کی تحریریں ہیں، ان کے منصوبے ہیں جن میں رنگ بھر کر انھیں زندہ رکھا جاسکتا ہے، یہ سیمینار جو علاقائی سطح کا ہے، لیکن اگر دہلی سے تشریف لائے ہوئے اصحاب علم وواحباب کی طرف توجہ کی جائے تو قومی سطح کا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، ہم اس موقع پر اپنی جانب سے اور اپنی انتظامیہ کی طرف سے، اپنے اساتذہ وطلبہ کی جانب سے آپ سب کا استقبال کرتے ہیں، آپ سب کو خوش آمدید کہتے ہیں، آپ کا استقبال اپنے ڈاکٹر سکریٹری سعد ماحی کی طرف سے کرتے ہیں جو قطر میں مقیم ہونے کے سبب شرکت نہیں کرسکے، مگر ان کے برادر خورد احمد حماد یاسر صاحب بذات خود یہاں آپ کے استقبال کے لیے موجود ہیں، ہمارے سرپرست فاؤنڈیشن کے خازن پروفیسر مسعود خالد صاحب آپ حضرات کے استقبال کے لیے یہاں موجود ہیں، فاؤنڈیشن کے تمام ارکان کی جانب سے ہم آپ حضرات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر بانی ادارہ ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی مرحوم بہت یاد آرہے ہیں، ان کی سرپرستی میں اس چھوٹے سے ادارے نے دو بڑے بڑے سیمینار کیے، جنوری ۲۰۱۳ء میں رابطہ ادب اسلامی کا سالانہ سیمینار بعنوان ''بیسویں صدی میں اردو کا سوانحی ادب اور تعمیری قدریں'' ہوا، جس میں ملک بھر سے محترم شخصیات اور اہل قلم جمع ہوئے، پھر فروری ۲۰۱۴ء میں اس نوخیز ادارے نے ایک تاریخ رقم کی، ''معاصر افکار اور مولانا علی میاں کا موقف- تقابلی مطالعہ'' کے عنوان سے ایک عالمی کانفرنس منعقد کی، جس میں ۱۶ ممالک سے ۵۴ افراد شریک ہوئے، عرب یونیورسٹیز کے ۳۶ پروفیسرز واسکالرز تشریف لائے، ملک بھر سے کم وبیش ڈیڑھ سو افراد شریک ہوئے، اس کانفرنس کی پروسیڈنگ ۱۶۰۰ صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں شائع ہوئی، یہ سب ڈاکٹر صاحب کے خلوص اور ان کی تگ ودو کا نتیجہ تھا، آج کے اس سیمینار میں بھی ملک کی نمائندہ شخصیات اور معروف اہل قلم شریک ہورہے ہیں، اگرچہ ان کا تعلق ہمارے اسی شہر یا دہلی سے ہے، ہم ان سب کے شکر گزار ہیں، اور اپنے ذمہ داروں کے شکر گذار ہیں، جنھوں نے اس کی تیاری کے لیے مفید کوششیں کیں، اس سیمینار کو انتظامی امور میں آسانی اور قلت وسائل کے سبب مختصر ضرور رکھا گیا مگر امید ہے کہ آپ حضرات کی شرکت اور آپ کے بیش قیمت مقالات کے سبب اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگی، ظاہر ہے کہ اس مختصر سی نشست میں مولانا کی تمام جہات کا احاطہ نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی مولانا کے تمام نظریات کا تجزیہ ممکن ہے، لیکن امید ہے کہ ان مقالوں میں موضوعیت ہوگی، اور بڑی حد تک مولانا کے افکار کا خلاصہ آجائے گا۔

جہاں تک **مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ** اور ان کے افکار وخدمات کا تعلق ہے تو ان کا شمار صف اول کے علماء میں ہوتا تھا، وہ ہندوستان میں اپنے علم وفضل، اپنے نقد ونظر، اپنی وسیع النظری اور فکری اعتدال نیز اپنے ادب وانشاء کے سبب منفرد شخصیت کے مالک تھے، ابھی چند ماہ قبل پروفیسر محسن عثمانی صاحب نے فکر اسلامی کے علمبرداروں کا اپنے ایک مضمون میں تذکرہ کیا تھا تو مولانا مرحوم کو بحیثیت مفکر ودانشور سرفہرست رکھا تھا، مگر افسوس کہ فکر کا یہ سوتا بھی خشک ہوگیا، علم وادب کا یہ آفتاب بھی غروب ہوگیا، جس سے نہ جانے کتنے ستاروں نے روشنی حاصل کی تھی، وہ سمندر بھی آج خاموش ہوگیا، جس سے نہ جانے کتنے دریا نکلتے تھے، اب کون مغرب کی سازشوں کا پردہ فاش کرے گا، کون عالم اسلام کی سیاست پر ناقدانہ تبصرہ کرے گا، مغربی مصادر پر کس کی نظر ہے مولانا کی طرح، کون اب "صور و اوضاع" کے کالم میں بصیرت کے موتی بکھیرے گا۔

مولانا مرحوم کی زندگی سادگی، تواضع، فنائیت اور نفس کشی سے عبارت تھی، وہ انتہائی خلیق وشفیق انسان تھے، وہ شفیق مربی، کامیاب معلم اور بالغ نظر عالم وناقد تھے، وہ ماہر لسانیات تھے، عربی وانگریزی پر ان کو زبردست قدرت تھی، عربی زبان کی نزاکتوں کے محرم راز تھے، قدیم ندویوں سے ملیے تو وہ مولانا کی مدح میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، ہر ایک کی زبان پر یہی ہوتا ہے کہ ہمیں قلم پکڑنا مولانا نے سکھایا، مولانا کا انداز تربیت عجیب تھا، مولانا کی علمی مجلس سے کبھی سیری نہیں ہوتی تھی، مولانا کے تربیت یافتہ قلم کاروں کی بڑی تعداد ہے، جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے، اس دور آخر میں عوارض اور ضعف کے باوجود بھی مولانا بولتے تھے تو علم وفضل کے موتی بکھیرتے جاتے تھے، گویا الفاظ ومعلومات کا سیل رواں ہوتا جو رکنے کا نام نہیں لیتا، مولانا بہت کم بولتے مگر جب بھی بولتے تو گھنٹوں کی تقریروں کو پانچ دس منٹ کے خطاب میں سمیٹ دیتے، یعنی دریا کو کوزے میں سمو دیتے، عربی زبان وادب مولانا مرحوم کا خاص موضوع تھا، درس وتدریس اور تجزیہ وصحافت آپ کی دلچسپی کے میدان تھے، قدرت کی طرف سے آپ کو لکھنے کا جو ملکہ عطا ہوا تھا وہ بے پایاں وبے مثال تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ دوسروں کو آگے بڑھایا اور خود کو پیچھے رکھا، اپنے کو فنا کیا اور دوسروں کو جلا بخش دی، مولانا کی پوری زندگی کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ کی مصداق تھی، انھوں نے ''جو بڑھ کر ہاتھ میں اٹھالے مینا اسی کا ہے'' کے فلسفہ کو اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا تھا، وہ اس کو کوتاہ دستی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایثار وقربانی خیال کرتے تھے، اور یہ ان کی وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر تلاش کرنے سے بھی ملنی مشکل ہے۔

مولانا عربی انشاء پردازی کے شہسوار تھے، انھوں نے عربی کے علاوہ کبھی دوسری زبان میں شاید کچھ لکھا ہی نہیں، وہ بالغ نظر مفکر تھے، وہ ماہر تعلیم اور کامیاب معلم ومربی تھے، وہ انگریزی مصادر اور مغربی مفکرین کی تحریروں کا براہ راست مطالعہ کرتے تھے، The Economist جیسے عالمی میگزین کے وہ مستقل قاری تھے، سرکاری نوکری چھوڑ کر انھوں نے ندوۃ العلماء میں خدمت تدریس کو اپنایا تھا، مطالعہ ہی مولانا کا مشغلہ تھا، ان کی سطر سطر سے علمیت ٹپکتی ہے، ان کی تحریروں میں فکر اسلامی کی ترجمانی، قرآنی آیات سے استدلال اور مغربی افکار وآراء کے براہ راست حوالوں کے ساتھ ان پر تنقید ہوتی تھی ورنہ عام طور پر مغربی تہذیب پر نقد کرنے والے علماء نہ اس کے مصادر سے واقف ہوتے ہیں نہ اس کی اصلیت سے۔

مولانا نے اپنے تعلیمی نظریات کو بھی پیش کیا ہے، جدید نظام تعلیم کے نتائج، نفسیاتی وفکری اثرات کا بھی تجزیہ کیا ہے، اس سے کیا لینا ہے، کتنا لینا ہے اس کی تعیین کے لیے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، قدیم نظام تعلیم کے نقائص اور منافع کا بھی ذکر کیا ہے، جدید وسائل کی نفع رسانی کا بھی اعتراف کیا ہے، مولانا نے ذرائع ابلاغ کی حقیقت، اہمیت، نقصان وافادیت پر بھی گفتگو کی ہے، وہ اس راہ کی مشکلات سے واقفیت کے باوجود بھی اس کے خواہاں تھے اور دوسروں کو ابھارتے تھے کہ اس حوالے سے مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بنگلور کی اپنی ایک تقریر میں مولانا نے فرمایا تھا کہ ''جب تک مسلمان علمی تقسیم کو ختم کر کے وحدانی نظام تعلیم کی طرف نہیں لوٹتے تب تک ان کے عروج کی کوئی شکل نہیں پیدا ہوگی، جس دن وہ علم کی تقسیم کو ختم کر دیں گے اس دن وہ عہد ظلمت سے نکل کر عصر النور میں داخل ہو جائیں گے''، راقم سطور نے اس موقع سے یہ سوال کیا تھا کہ آخر اس کی ابتدا کیوں نہیں ہو پاتی، جہاں سے عملی طور پر ہونی چاہیے وہاں سے کیوں نہیں ہوتی، راقم سطور نے مولانا مرحوم کی اس تقریر کو بنیاد بنا کر ایک اداریہ بھی لکھا تھا، مولانا نے اپنی تحریروں میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اسلام میں علم کی تقسیم صرف نافع اور غیر نافع کی ہے، باقی دیگر تقسیمات درست نہیں، مولانا جب معتمد تعلیمات مقرر ہوئے تھے تو انھوں نے ندوہ کے ترجمان ''تعمیر حیات'' میں فضلائے ندوہ کے لیے متعدد سوالات لکھے تھے جو ان کے ایک مکتوب کے ساتھ شائع ہوئے تھے، اس مکتوب میں انھوں نے ذکر کیا تھا کہ ان کے پیش نظر ایک منصوبہ ہے جس کی تکمیل کے لیے فضلائے ندوہ کے جوابات ضروری ہیں، ان سوالات میں تبدیلی نصاب اور منہج تعلیم وتربیت بھی موضوع تھا، اور مولانا کی طرف سے یہ کوئی قابل تعجب بات نہ تھی، کیوں کہ ان کی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ نصاب کو تغیر پذیر سمجھتے تھے، ان کے نزدیک تبدیلی ناگزیر تھی، وہ قدیم وجدید کی بحثوں سے بالا تھے، وہ دراصل عقل ودل کے امتزاج کے قائل اور بذات خود اس کی جیتی

جاگتی تصویر تھے، ان کے پیش نظر تحریک ندوۃ العلماء کا احیاء تھا، ان سوالات میں اس کا بھی ذکر تھا، مگر بصد حسرت کہ مولانا کے یہ سب انقلابی افکار اب اوراق تاریخ میں ہی محفوظ ہیں، ان پر عمل درآمد سے ان فکری خاکوں کو زندۂ جاوید کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کی علمی ومطالعاتی زندگی کا خلاصہ الرائد والبعث الاسلامی میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اور بلند پایہ تجزیے تھے، ان مضامین میں مولانا کی وسعت نظری، باریک بینی، علمی گہرائی، تنقیدی شعور، استنباط واستنتاج اور تجزیہ نگاری، خطرات کا ادراک، پختہ استدراک، قوت عرض اور اسلامی تعلیمات پر غیر متزلزل یقین جیسی خصوصیات نظر آتی ہیں، مولانا نے ان مضامین میں اسلامی تہذیب کو بھی پیش کیا ہے، مغربی تہذیب کے فکری تانے بانے کا بھی گہرا مطالعہ پیش کیا ہے، عالم اسلامی اور بالخصوص عالم عربی کی سیاست سے بھی پردہ اٹھایا ہے، مغرب کی جارحیت، دوغلی پالیسی اور اس کی دسیسہ کاریوں کا علمی وفکری تجزیہ کیا ہے، مولانا مسلسل کم وبیش چالیس سال تک اپنی بالغ نظری کے ساتھ، مفکرانہ شان سے قلمی وفکری رہنمائی کرتے رہے، اسباب زوال کا تذکرہ کرتے رہے، قرآن وسنت کی روشنی میں راہ عمل کی تعیین کرتے رہے، عالمی منظر نامہ کو سامنے رکھ کر رہزنوں کی رہزنی، اور منافقوں کے نفاق کی نشاندہی کرتے رہے، جملہ مسائل کے حل کے لئے الی الاسلام من جدید کا طاقتور اور سرسبز وشاداب نعرہ لگاتے رہے، اور اس اٹل حقیقت اور ابدی وسرمدی اصول کو پوری قوت کے ساتھ بغیر کسی مرعوبیت کے پیش کرتے رہے، مگر افسوس کہ نفسانفسی کے اس دور میں کون سنتا ہے، کون پڑھتا ہے اور کون کان دھرتا ہے، مولانا واقعی ایک مفکر اسلامی تھے، ان کی تحریریں ٹھوس علمی تجزیات پر مبنی ہوتی تھیں، قرآن وسیرت سے وہ اپنی فکر کے لیے روشنی حاصل کرتے تھے، یوں بھی قرآن وسیرت سے انھیں بڑا والہانہ لگاؤ تھا، انھوں نے ایک مفکر کا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے عہد حاضر کی فکری کشمکش پر گفتگو کی، ''موجودہ تہذیب وتمدن اور عالم اسلام'' کے موضوع پر قلم اٹھا کر اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا، صلیبی وصہیونی ریشہ دوانیوں کو صراحت سے بیان کرنے کے لیے عالم اسلام پر فکری یلغار کو موضوع بنایا، ان کی کتاب "إلى نظام عالمي جديد" ان کی دوراندیشی اور مستقبل کے خطرات وخدشات اور نئے عالمی نظام میں مسلمانوں کے کردار سے واقفیت کی دلیل ہے، مولانا کی تحریروں میں علمیت اور ہوشمندی کا عنصر غالب ہوتا تھا، ان کی تحریریں بڑی اثر پذیر ہوتی تھیں، انھوں نے مغرب ومشرق کو قریب سے دیکھا تھا، اپنے خال معظم کی معیت میں انھیں یہ موقع میسر آیا تھا، انھوں نے الغزو الفكري پر گفتگو کرتے ہوئے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ خال معظم کی تحریروں سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے، اس کے علاوہ بھی ان کی فکر پر معاصر اسلامی عرب مفکرین کا پرتو نظر آتا ہے، ان کی تحریروں میں بیسویں صدی کے نامور اہل قلم اور اسلامی مفکرین کی تحریروں کے حوالے ہوتے ہیں۔

مولانا واضح رشید حسنی تجاویز وکانفرنسوں کے بجائے عملی قدامات پر یقین رکھتے تھے، ان کا ایک بڑا طاقتور رسالہ من صناعة الموت إلى صناعة القرارات ہے، جس میں انھوں نے جہد مسلسل اور یقین پیہم کا فلسفہ پیش کیا ہے، اس امت کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے جو پورے عالم کی قیادت کے لیے برپا کی گئی تھی، بالخصوص عربوں کی بزم آرائی کو موضوع بنایا ہے جو کبھی رزم گاہوں کے مردان حر ہوا کرتے تھے، مولانا نے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ عالم اسلام کو قوت ارادی، تحریک عمل اور جذبہ صادق کی ضرورت ہے، جس کو علماء اور عوام سب فوت کر چکے ہیں، اور بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ حکام سے اس کی کیا امید کہ ان کے سلسلہ میں تو سب گمان سچ ثابت ہوئے، مولانا نے اس میں مجاہدین اور اقدام کرنے والے فاتحین کا نمونہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ احتجاج ومظاہرے، قراردادیں اور تجاویز، میٹنگیں اور مشورے، سمپوزیم اور کانفرنس یہ سب چیزیں کمزوری اور وہن کی علامت ہیں، مسلمان اپنی طویل تاریخ میں ان چیزوں اور طریقوں کا بار بار تجربہ کر چکے ہیں، لیکن انھوں نے دیکھا ہے کہ ان کے بلند بانگ نعروں اور زبردست مظاہرے کسی ساکت وصامت کے لبوں کو جنبش دینے پر بھی مجبور نہیں کر سکے، اور کوئی موقف نہیں تبدیل کر سکے، اس لیے مسلمانوں کو مضبوط موقف، جذبہ صادق، شوق شہادت اور قوت عمل کی ضرورت ہے کہ ان ہی عناصر کی بدولت تاریخ اسلامی مجاہدین وابطال اور فاتحین کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔

مولانا نے اختصار کے ساتھ تاریخی تسلسل اور مرحلہ واریت کے لحاظ سے قضیہ فلسطین کا تعارف کرایا ہے، آخر میں یہ ضرور کہا ہے کہ حسن انجام اہل حق کے لیے ہے مگر بہت وضاحت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ''قضیہ فسلطین کے مذکورہ بالا تاریخی جائزہ سے ثابت ہوتا ہے کہ

اسرائیل کے قیام اوراس کے استحکام میں مغربی سامراج، عربوں کا افتراق، عرب حکام کی بے توجہی اور بروقت فلسطین کی حفاظت کی کاروائی نہ کرنا اور فلسطینی مزاحمتی تحریکوں کو مدد اور وسائل بہم نہ پہنچانے کا کلیدی رول رہا ہے.....'' مولانا نے اپنے مختصر تجزیہ کے بعد لکھا ہے کہ ''ایسی صورت حال میں کسی نصرت غیبی کا انتظام ہوجائے تو مسئلہ فسلطین حل ہوسکتا ہے، وما ذلك على الله بعزيز''۔

عہد اخیر میں عالم اسلام میں جو بھونچال آیا اس میں لوگوں نے یہ تاثر قائم کرلیا اور محض اپنی ناواقفیت اور حقائق تک پہنچنے اور مطالعہ کرنے سے عدم دلچسپی کے سبب سمجھ لیا کہ مولانا تنقید نہیں کرتے تھے، مولانا کے اندر عالم عربی کے حالات سے کوئی اضطراب نہیں تھا، وہ ملی اور دینی مصالح پر حکومتوں کے مصالح اور مواقف کے مؤید تھے، یہ لوگوں کی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، مولانا کا وسیلۂ اظہار عربی زبان تھی، جواب بیشتر فضلائے مدارس کی دسترس سے بھی باہر ہوتی جارہی ہے، مولانا ہمیشہ کھل کر لکھتے تھے، لیکن ان کی تنقید میں اصلاح وعلمیت کا رنگ غالب ہوتا تھا، وہ جارحیت کے قائل نہیں تھے، انھوں نے کبھی حکام کی پالیسیوں کو آنکھ بند کرکے یا محض خوش فہمی میں قبول نہیں کیا، وہ تغیرات ونظریات کا گہرا تجزیہ کرتے تھے اور پھر صراحت سے لکھتے تھے، یہ الگ بات کہ بعض مواقع پر بعض مصالح کے سبب سکوت کا موقف اختیار کیا، وہ عام طور پر نام لے کر تنقید نہیں کرتے تھے، بلکہ موقف ونظریات، پالیسی اور اقدامات کو موضوع تنقید بنایا کرتے تھے، اس لیے بھی سہل نگاری کے اس دور میں لوگوں کو سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، مولانا نے ایک مخلص ومومن صحافی کی طرح ہمیشہ حق کو پیش کیا اور باطل کو باطل کہا، انھوں نے عالم عربی میں برپا انتشار اور قتل وخون پر عرب حکومتوں کی تنقید کی، عرب قومیت کے بت کو عربوں کے زوال کی دیوی قرار دیا، انھوں نے عربی صحافت پر بہت پہلے صرف اس لیے تنقید کی تھی کہ وہ اپنے لیڈروں کو ہیرو، نجات دہندہ اور نابغۂ روزگار بنا کر پیش کرتی ہے، مولانا نے لکھا کہ عربی اخبارات ورسائل پڑھنے والے کو اس حرکت سے وحشت ہوتی ہے، اور یہ وحشت اس وقت دوبالا ہوجاتی ہے جب یہ تمام القاب وآداب جوان کی نسبت لکھے جاتے ہیں وہ کھوکھلے اور بے معنی نظر آتے ہیں، بایں معنی کہ ان القاب وآداب کی حیثیت کھوکھلے دعووں کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی، ان لیڈروں کے اقوال وافعال خود ان کی نفی کرتے نظر آتے ہیں، ماضی میں عربی صحافت جمال عبدالناصر، انور السادات صدام حسین اور معمر قذافی جیسے حکمرانوں کے لیے یہ رول ادا کرچکی ہے، مصریوں کی رذالت نے تو جمال ناصر کو نبی تک بنادیا تھا، آج صورت حال اس سے بدتر ہوگئی جبکہ سعودی ولی عہد کو خالدؓ بن الولید اور منبر حرم سے عمر بن الخطابؓ سے تشبیہ دی جانے لگی، اس کے غیر اسلامی اور غیر اخلاقی اقدامات کو کھینچ تان کر سند جواز عطا کی جانے لگی، مولانا نے اپنی تحریروں میں ان تغیرات کا نوٹس لیا، اگر مولانا کا یہ نظریہ ملحوظ رہے تو بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی، کہ مولانا ٹکراؤ کا موقف نہیں رکھتے تھے بلکہ اصلاح وتنقید پر یقین رکھتے تھے، کیوں کہ ان کا یہ ماننا تھا کہ حکمرانوں کی ذہنیت تقریبا یکساں ہوتی ہے، ان کو ہر حال میں صرف اپنا اقتدار عزیز ہوتا ہے، اس کو بچانے کے لیے وہ قتل وخون کو بھی روا سمجھتے ہیں، اور جو بھی کرسکتے ہیں وہ کر گذرتے ہیں، اسی امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اصلاحی وتعمیری اور تعلیمی تحریک وانقلاب کی دعوت دیتے تھے اور ناموں کے اظہار کے بجائے پالیسیوں کی تنقید کرتے تھے، ابھی کچھ مہینوں قبل ہی قیادت کے فقدان پر ان کا ایک مضمون ملک کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ میں چھپا تھا، جس میں نام تو کسی کا نہیں تھا مگر ملت اسلامیہ کی ابتری اور قیادت کی ناعاقبت اندیشی اور اس کے فقدان پر انھوں نے بہت واضح تحریر لکھی تھی، جسے کسی نے اپنے ایک نوٹ ''لب بستگی کو تاب سخن کون دے گیا'' سے سوشل سائٹس پر بھی بہت وائرل کیا تھا۔

مولانا کی جہات وخصوصیات کا تذکرہ اور پھر ہر جہت کا تذکرہ اس مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں، مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بالغ نظر مفکر، باشعور صاحب قلم، مومنانہ صحافت کے علمبردار، بلند پایہ ادیب وانشاء پرداز تھے، ان کی تواضع، انکساری، شہرت طلبی سے اجتناب، زینت محفل بننے سے گریز وپرہیز، زہد واستغنا، تعلق مع اللہ، قرآن مجید سے شغف، وسیع النظری، توسع پسندی اپنے آپ میں ایسی مثال ہے کہ معاصر زمانہ میں تلاش بسیار کے بعد بھی کسی ایک شخصیت میں یہ صفات یکجا نہیں مل سکتیں، انھوں نے جب تک ان کی صحت نے ساتھ دیا تصنیف رجال کا وہ کارنامہ انجام دیا جس کی زندہ مثالیں دنیا بھر میں پھیلی نظر آتی ہیں، آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

کلیدی خطبہ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ - ایک مفکر اور دانشور

نوٹ: پروفیسر عثمانی صاحب کا آنا طے نہیں تھا۔ شدید خواہش کے باوجود وہ آ بھی نہ سکے مگر کلیدی خطبے کی ذمہ داری پوری کی۔ افتتاحی نشست میں اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ (ادارہ)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی
(سابق پروفیسر ای ایف ایل یونیورسٹی، حیدرآباد)

معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا محمد واضح حسنی ندوی کا ۱۶ جنوری ۲۰۱۹ کو انتقال ہوگیا۔ یہ بہت بڑا حادثہ ہے۔ یہ حادثہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کا ذاتی حادثہ ہے کہ یہ ان کے لئے ویسے ہی تھے جیسے حضرت موسی کے لئے حضرت ہارون۔ حضرت مولانا رابع حسنی کا کوئی سفر شہر میں ملک میں اور ملک سے باہر مولانا محمد واضح حسنی کے بغیر نہیں ہوتا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ مولانا رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کو اپنے بھائی پر ناز اور ان کے صائب مشوروں پر اعتماد تھا۔ یہ حادثہ ندوۃ العلماء کے لئے بھی سخت ہے کہ مولانا واضح حسنی معتمد تعلیم تھے اور ندوہ کے تعلیمی روح رواں تھے۔ یہ حادثہ علمی اور ادبی دنیا کا بھی بڑا حادثہ ہے کہ وہ ایک مفکر ایک دانشور اور عربی زبان کے بے مثل ادیب اور نقاد تھے اور عربی ادب پر کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے اور رابطہ ادب اسلامی کے سکریٹری جنرل تھے۔ عالم اسلام کے حالات پر ان کی جس درجہ بصیرت مندانہ نظر تھی بہت کم لوگوں کی تھی۔ ذاتی طور پر وہ ان اوصاف کے مالک تھے جو تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتے ہیں۔ ان اوصاف کی تلاش اس زمانہ میں عنقا کی تلاش یا بال ہما کی جستجو ہے۔ بہترین علمی وفکری اور ادبی صلاحیتوں کے باوصف ہمیشہ خود کو سب کے پس پشت رکھنا اور خودنمائی اور خودستائی سے مکمل گریز، خود افروزی اور دوسروں کی خوردہ گیری سے مکمل اجتناب، کبھی سبقت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا ہمیشہ خود کو پیچھے رکھنا مستقل عادت اور وظیفہ حیات۔ شاد عظیم آبادی کا ایک شعر ہے:

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس شعر میں جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے مولانا واضح حسنی کی طبیعت میں اس کا بالکل انکار تھا، ہمیشہ کوتاہ دست رہنا اور دوسروں کو فائدہ پہونچانا اور فائدہ پہونچا کر خوش ہونا ان کی زندگی کا معمول تھا، نرم خو، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو ان کی شخصیت کی پہچان تھی۔ ان کی ہر تحریر ان کی جودت فکر کی آئینہ دار ہوتی تھی کوئی اہم علمی اور فکری کتاب عربی یا انگریزی میں شائع ہو اور ان کے مطالعہ سے نہ گذرے یہ ممکن نہ تھا اس لئے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا وہ انگریزی اردو اور عربی کی علمی اور فکری کتابوں کا مطالعہ بہت اہتمام سے کرتے تھے، عالم اسلام کے حالات پر اور تاریخ پر ان کی نظر تھی۔ صلیبی اور استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے وہ واقف تھے اسی لئے ان کی تحریروں میں علمی اور فکری وزن ہوتا تھا اور اس کا نمونہ ان کی کتاب عالم اسلام پر فکری یلغار (الغزو الفکری) ہے، مولانا محمدؒ واضح حسنی ندوی قلم کے شہسوار تھے لیکن ان کا اسپ قلم ''تازی'' تھا، رہوار قلم عربی تھا، انداز بیان ہوشمندانہ اور سنجیدہ تھا اس دور میں تو بہت سے اسپ تازی (عربی گھوڑے) کے شہسوار مجروح اور دیوار زندان کے قیدی بنا دئے گئے ہیں، کوئی ایک نام ہو تو بتایا جائے ''تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں'' مولانا واضح رشید حسنی ندوی کی ایک اور فکر انگیز کتاب ''موجودہ تہذیب وتمدن اور عالم اسلام'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے وہ بھی ان کی عربی کتاب کا ترجمہ تھا، مسلمانوں میں اچھے مفکرین کی شدید ضرورت ہے جو مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں کیونکہ مسلمانوں کا عمومی رویہ اکثر مسائل میں جذباتی غیر منطقی اور کبھی جارحانہ بن جاتا ہے اور مولانا واضح حسنی کا اسلوب بیان منطقی اور تجزیہ دانشورانہ ہوتا تھا۔ مولانا کی تحریریں عالمی حالات کو سامنے رکھ کر لکھی جاتی تھیں، ان میں جوش کا عنصر بہت کم اور ہوش کا عنصر بہت غالب ہوتا تھا۔ یہ تحریریں یہ کتابیں مفکرانہ انداز

میں بتاتی ہیں کہ ''قافلہ کیوں لٹا'' اور ''رہزن'' کون تھا اور اس نے رہزنی کیسے کی اور مسلمانوں کو اب کیا کرنا چاہئے، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے؟ مولانا کی عربی کتاب ''الغزو الفکری'' اور ''الی نظام عالمی جدید' بلاشبہ قلب سلیم، فکر مستقیم اور ذہن حکیم کا نمونہ ہے۔ مولانا محمد واضح حسنی ندوی کی زیادہ تر تحریروں کا موضوع یہی ہے کہ مسلمانوں کی عزت وعظمت کا روشن چاند شکست وزوال کے بادلوں میں کیسے روپوش ہوگیا، اسلامی تہذیب وتمدن کا بیڑا کیوں کر غرق ہوا، اب عظمت رفتہ کی باز آفرینی کیسے ممکن ہے۔ مسلمانوں کو درپیش چیلنج کیا ہے اور اس پر آشوب زمانہ میں ان کو کیا کرنا ہے۔ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی لیکن اس موضوع پر چند کتابوں کا انتخاب کیا جائے گا تو مولانا واضح رشید حسنی ندوی کی کتابوں کا نام ضرور لیا جائے گا۔ جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یورپ نے غلبہ کیسے حاصل کیا اور اس کی برتری کا راز کیا ہے اس وقت تک ہم اپنی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ کوئی دل دردمند اور فکر ارجمند رکھنے والا شخص اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا ہے۔ اسی لئے مولانا واضح حسنی کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ مولانا اپنی نظریاتی عمارت کی تعمیر کے لئے قرآن وحدیث کا مواد استعمال کرتے ہیں اور اسلامی مفکر کو یہی کرنا چاہئے۔

مولانا واضح حسنی مفکر اسلام تھے۔ مفکر اسلام کا کردار اور مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے، اس کی ثقافت اور آگہی کا سرچشمہ قرآن اور سنت نبوی ہوتا ہے، وہ عصر حاضر سے بھی واقف ہوتا ہے۔ وہ عصر حاضر کے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے قرآن وسنت کے سرچشموں سے اکتساب کرتا ہے اس کی فکر میں وسعت ہوتی ہے، وہ مثل خورشید سحر اپنی روشنی دنیا میں پھیلاتا ہے، اپنی تحریر کے جام جمشید میں ماضی اور حال کی تاریخ کی تصویر پیش کرتا ہے وہ صفحہ قرطاس کے آئینہ میں قوموں کے عروج وزوال کا منظر دکھاتا ہے اور عبرت کا درس بھی سناتا ہے وہ مصنف اور صاحب قلم ہوتا ہے وہ مضامین نو کے انبار لگاتا ہے اور ہزاروں انسان اس کے خرمن فکر کے خوشہ چیں ہوتے ہیں۔ مفکر درحقیقت وہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کی نہضت اور نشاۃ ثانیہ کے لئے اپنے کچھ نئے خیالات پیش کرے۔ اور یہ بتائے کہ اسلامی قوتوں کا غلبہ آج کے حالات میں کیسے ممکن ہے۔ برصغیر میں کئی مفکرین منظر عام پر آئے ہیں جیسے سرسید، مولانا قاسم نانوتوی شیخ الہند محمود حسن، مولانا ابوالاعلی مودودی اور خود مولانا واضح رشید کے خاندان کے بزرگ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالمحاسن سجاد اور ان سے بھی پہلے علامہ شبلی اور علامہ اقبال اور عصر حاضر میں اور معاصرین میں مولانا وحید الدین خان۔ یہ سب لوگ مفکر تھے اور مفکر کے لئے بالکل ضروری نہیں ہوتا ہے کہ اس کے افکار سے سب متفق بھی ہوں اور تمام افکار درست بھی ہوں، مولانا واضح رشید حسنی ندوی بھی مفکر تھے لیکن مذکورہ بالا بیشتر اشخاص کی طرح وہ عملی مفکر نہیں تھے مولانا ابوالکلام آزاد عملی مفکر تھے انہوں نے حزب اللہ قائم کی، متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کیا اور اس پر عمل کر کے دکھایا، مولانا مودودی نے حزب اللہ کے نمونہ پر جماعت اسلامی قائم کی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا یہی خیال ہے کہ مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کا تصور حزب اللہ سے لیا تھا، مولانا مودودی کے اسلامی ریاست کے نظریہ کی بازگشت عالم اسلام کے ملکوں تک پہونچی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے عالم عرب میں رابطہ ادب اسلامی کی تحریک برپا کی ہندوستان کی سطح پر برادران وطن سے خطاب کرنے کے لئے پیام انسانیت کے جلسوں کا سلسلہ شروع کیا یہ ساری کوششیں ان کو مفکر اسلام کی سطح پر کھڑا کرتی ہیں۔ غلبہ اسلام کے لئے ان کے نظریات اور مفکرانہ خیالات ''ماذا خسر العالم'' میں بھی موجود ہیں حالیہ تاریخ میں وہی لوگ مفکر اسلام اور عملی مفکر کہے جانے کے مستحق ٹھہرے جو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے معمار تھے جنہوں نے عروج کی بازآفرینی اور عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے اپنا فلسفہ وفکر پیش کیا اور اپنی فکر کو عمل کے سانچہ میں ڈھالا، مولانا شبلی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، مولانا مودودی مولانا علی میاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ عملی مفکر تھے جو اصابت فکر کے ساتھ عمل کے میدان میں بھی آئے اس لئے وہ عملی مفکر کہلانے کے مستحق ہیں انہوں نے فکر کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ حضرات صاحب ''سیف'' اور صاحب قلم تھے لیکن نہ مولانا وحید الدین خان نے کوئی عملی اقدام کیا اور نہ مولانا واضح حسنی ندوی نے۔ یہ دونوں حضرات بلاشبہہ مفکر ہیں لیکن عملی مفکر نہیں، ان دونوں نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کو اپنا موضوع ضرور بنایا لیکن کوئی عملی اقدام نہیں کیا۔

مولانا وحید الدین خاں سے برصغیر کے مسلمان پورے طور پر واقف ہیں ان کے افکار پر تنقیدیں بھی کئی گئی ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا مفکر ہونے کے لئے تمام افکار کا درست ہونا ضروری نہیں، صاحب قلم ہونا

ضروری ہے اور نشاۃ ثانیہ کو موضوع بنانا ضروری ہے اور زوال کے اسباب کی نشان دہی کرنا ضروری ہے۔ وحیدالدین خان نے اردو کو اپنے خیالات وافکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور مولانا واضح حسنی ندوی نے عربی زبان کو۔ وحیدالدین خاں کی تحریریں اردو میں تھیں اس لئے ان کے خیالات کی عام اشاعت ہوئی اور مولانا واضح حسنی ندوی اگرچہ کہ نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور بہترین اوصاف سے متصف تھے لیکن ان کے قیمتی افکار و خیالات عربی میں ہونے کی وجہ سے اور صرف ہندوستان میں بیٹھ کر لکھے جانے کی وجہ سے کاغذی قبروں میں مدفون ہوگئے۔ کاغذی قبروں میں مدفون ہونے کی تعبیر کچھ اچھی نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ ان کے افکار کی پذیرائی جیسی ہونی چاہئے تھی نہ ہوسکی ان کے تمام عربی مضامین کو الرائد سے نکال کر کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان مضامین سے کوئی شعلہ بلند ہو اور وہ شعلہ پھر شعلہ جوالہ بن جائے۔ ''فونکس'' یونان کا ایک اساطیری پرندہ ہے اس کی بہت طویل عمر ہوتی ہے اس کے آتشیں نغمہ دلسوز سے آگ لگ جاتی ہے اور وہ پرندہ جل کر مر جاتا ہے اور پھر اسی کے خاکستر سے ایک دوسرا فونکس پیدا ہوتا ہے۔ مولانا واضح حسنی ندوی کے مدفون مضامین سے بھی ایک دوسرا واضح حسنی، ایک انقلاب انگیز عملی مفکر پیدا ہوسکتا ہے۔ زبان وبیان کی حیثیت سے بھی اس دور کی اعلی صحافتی زبان کا نمونہ ان کی تحریریں ہیں اس لئے ان کے مضامین کو جمع کرکے شائع کرنے اور مدارس میں طلبہ کے مطالعہ کے کورس میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ مدارس میں مغربی تہذیب کے مطالعہ کا ایک کورس ہونا چاہئے اور اس میں علامہ اقبال مولانا مودودی محمد اسد مولانا علی میاں اور مولانا واضح حسنی کی کتابوں کو داخل نصاب کرنا چاہئے۔ مولانا واضح حسنی نے خود کوئی تحریک برپا نہیں کی لیکن تحریکوں کی فکری رہنمائی کی۔ وہ نظریاتی مفکر تھے اور بڑے مفکر تھے اور صرف عربی میں لکھتے تھے۔ اور ہندوستان میں رہتے تھے، ان کو عالم عربی کا وہ اسٹیج میسر نہیں آیا جو مولانا ابوالحسن علی ندوی کو حاصل تھا۔ اس کی وجہ مولانا واضح ندوی کی افتاد طبیعت تھی اور ان کا متصوفانہ مزاج تھا۔ خموشی ان کی گفتگو تھی اور بے زبانی ان کی زبان تھی، صریر خامہ ہی ان کے لئے بانگ رحیل اور سکوت لب ہی صور اسرافیل تھا، اس مزاج کے لوگ میر کارواں نہیں بنتے ہیں اور قافلہ سالاری نہیں کرتے ہیں، لیکن خاموشی کے ساتھ فکری قیادت کرتے ہیں اور اس قیادت پر قناعت بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطبوعہ مضامین کو پڑھ کر مستقبل میں قائدین پیدا ہوسکتے ہیں اگر انھیں یکجا کرکے شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔

مولانا واضح حسنی فکری قیادت میں بھی یہ احتیاط برتتے تھے کہ ضبط غم کے بندٹوٹنے نہ پائیں اور کسی پردہ نشین کا، عرب دنیا کے کسی حکمراں کا، نام نہ آنے پائے اور پردہ نشیں کو پردہ نشیں رہنے دیا جائے حالانکہ وہ جفا پیشہ حکمراں پردہ نشیں نہیں ہے اور بے حجابانہ اور بیباکانہ اسلامی قدروں کی مذمت کرتا ہے اور مولانا واضح حسنی کے لفظوں کے چلمن سے بھی بے حجاب نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا واضح صاحب زبان حال سے اور زبان قال سے اشاروں میں بس یہی کہتے رہتے ہیں:

یہ غم کس نے دیا ہے پوچھ مت اے ہم نشیں ہم سے
زمانہ لے رہا ہے نام اس کا ہم نہیں لیں گے

مولانا واضح صاحب کبھی صراحت کے ساتھ اسلام دشمن حکمرانوں کا نام نہیں لیتے ہیں، وہ صرف شاعرانہ انداز میں اشارے کرتے ہیں بقول شاعر:

کہہ کہ کچھ لالہ وگل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

وہ جناب شیخ کا بھی نام نہیں لیتے ہیں لیکن تحریروں میں جناب شیخ کی جانب اشارہ کرتے ہیں ان کی عربی تحریروں کو غور سے پڑھنے والے اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا رہوار قلم کس خطہ زمین سے گذر رہا ہے۔ ہوائی جہاز کے مسافروں کو تجربہ ہوا ہوگا کہ اکثر سامنے کی سیٹ کے پیچھے اسکرین لگا رہتا ہے اور وہ خاص بٹن دبانے سے یہ دکھاتا ہے کہ ہوائی جہاز کن ملکوں کے اوپر سے گذر رہا ہے بعینہ یہی احساس مولانا واضح حسنی ندوی کی عربی تحریروں کو پڑھ کر ہونے لگتا ہے۔ انہوں نے عرب حکمرانوں کو موردالزام ٹھرایا لیکن نامزد کرکے نہیں، وہ کلیم عاجز کے انداز میں کہتے رہے:

جناب شیخ پر افسوس ہے ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نا محرم نہیں ہوں گے

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مفکر تھے انہوں نے اپنے فکر جمیل کو صرف عربی زبان میں پیش کیا۔ ان کے مضامین کے ترجمے ضرور ہوئے پھر بھی ان کے افکار کی عمومی اشاعت نہ ہوسکی اور ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود رہا، اردو پڑھنے والوں کا حلقہ، اور خاص طور پر ندوۃ العلماء سے

وابستہ رہنے والوں کا حلقہ ان کی شرافت نفس کا اور بلند اوصاف کا قائل تھا لیکن ان کے تمام افکار عالیہ سے واقف نہیں تھا۔ مولانا واضح حسنی نے مغربی افکار اور نظریات کا گہرا تجزیہ اپنی تحریروں میں پیش کیا ان کی کتاب ''الغزو الفکری'' کا موضوع یہی ہے، انہوں نے مغربی تہذیب کا گہرا تجزیہ کیا اور یونانی اور رومی تہذیبوں پر تبصرہ کیا، کیونکہ یہ وہ دو تہذیبیں ہیں جن سے مغرب کی قبائے دو رنگ تیار ہوئی ہے، انہوں نے تفصیل سے اس کتاب میں بتایا کہ مغرب کی تہذیب اپنی سرشت میں اسلام کے خلاف ہے، انہوں نے یورپ میں اسلام کے خلاف جو تحریکیں اٹھیں اور مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو محاذ سنبھالا ان کا مفکرانہ اور ناقدانہ جائزہ لیا ہے، انہوں نے کتاب میں یورپ کی منفی قدروں کی یلغار کے خلاف اسلام کو ایک اخلاقی ڈھال کی طرح پیش کیا۔ انہوں نے اقبال کی طرح مغرب کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا، لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے منصفانہ نقطہ نظر بھی اختیار کیا ہے مغرب نے سائنس اور ٹکنولوجی اور صنعت کے میدان میں جو غیر معمولی پیش رفت کی ہے اور اس سے عالم انسانیت کو جو فائدہ پہونچا ہے اس کا اعتراف کیا ہے اور مسلم ملکوں کی پسماندگی پر افسوس کا اظہار ہے اور تمام تر علمی اور سائنسی ترقی کے باوجود انسانیت اور شرافت پر جو زوال آیا ہے اس کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے مغرب کی جمہوریت پر بھی تنقید کی ہے کہ یہ کیسی جمہوریت ہے جس کے ذریعہ کہیں اسلامی نظام کے علم بردار برسر اقتدار آتے ہیں تو وہاں جمہوریت ختم کر کے استبدادی نظام مسلط کر دیا جاتا ہے مولانا واضح حسنی نے اس کی بہت سے مثالیں دی ہیں۔ انہوں نے ترکی کا نام لیا ہے، لیکن کسی عرب ملک کی واضح نشان دہی نہیں کی ہے۔ جہاں مولانا واضح حسنی ندوی کی زبان (عربی زبان) سمجھی جاتی ہے یہ احتیاط اور یہ ایمائیت مولانا واضح حسنی کے اسلوب کی خاص پہچان ہے۔

مولانا واضح حسنی کا ایک دوسرا رخ یہ ہے کہ عربی زبان کے ادیب اور انشا پرداز تھے، سادہ و پرکار تحریر ان کے اسلوب کی پہچان تھی۔ ان کے تبصرے بہت مفکرانہ ہوتے تھے اور جدید عربی صحافت کے معیار پر پورے اترتے تھے ان کا اسلوب لائق تقلید تھا، ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مولانا محمد واضح حسنی ندوی کی کئی کتابیں عربی ادب اور تنقید کے موضوع پر ہیں، مصادر الادب العربی، اعلام الادب العربی اور تاریخ الادب العربی اور ادب اہل القلوب، یہ وہ کتابیں ہیں جو ان کو اعلی ادبی منصب پر فائز کرتی ہیں۔ وہ عربی زبان کے مایہ ناز صاحب قلم تھے اور اسلامی رنگ کی عربی صحافت کی آبرو تھے۔ الرائد کے وہ ایڈیٹر تھے اور البعث الاسلامی میں ''صور واوضاع' کے عنوان سے مستقل مضامیں لکھتے تھے اور یہ مضامین اہل نظر کے درمیان پسند کئے جاتے تھے۔ وہ ندوہ میں عمید کلیۃ اللغۃ تھے اور انہوں طلبہ کی تربیت کی اور انہوں نے طلبہ میں عربی زبان کا ذوق پیدا کیا۔ ندوہ میں بہت سے لوگ ملیں گے جو عربی میں لکھتے ہیں اور وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا عربی انشا کا ذوق مولانا واضح حسنی صاحب کی دین ہے۔ مولانا واضح حسنی ندوی کی کتاب ''اعلام الادب العربی فی العصر الحدیث'' ایک بے مثال کتاب ہے اور دعوی کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عالم عرب میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ عرب ملکوں میں معاصر ادب کے جو نمونے دئے جاتے ہیں ان میں اسلامی بیداری کے ادیبوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس کتاب میں اسلام پسند ادیبوں کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔

''الغزو الفکری'' کے علاوہ ان کی دوسری کتاب ''الی نظام عالمی جدید'' میں بھی ایک اچھے مفکر کی شان نظر آئے گی انہوں نے اس کتاب میں مغربی استعمار اور اس کے اقتصادی استحصال اور نظریاتی استغلال کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مغربی سیاست دین سے جدا ہو کر کس طرح انسانیت کش بن گئی ہے، انہوں نے اس کتاب میں نصرانیت کی تاریخ بھی بیان کی ہے اور قدیم نصرانیت اور جدید نصرانیت کا فرق بیان کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ جدید نصرانیت استعمار اور سیاسی تسلط کے ذریعہ پھیلائی جارہی ہے اور اسلام کے خلاف پروپگنڈہ بھی اس میں شامل ہے مغربی تہذیب کے غلبہ سے کیا معاشرتی نقصانات ہوئے ان کی تفصیل بھی اس کتاب میں بیان کی گئی ہے۔ مغربی تہذیب کا پورا پوسٹ مارٹم اس کتاب میں موجود ہے، یہ کتاب پڑھنے کے لئے ہے اور بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ مغربی تہذیب کی تنقید و تحلیل پر جو چند بہتر کتابیں ہیں ان میں یہ ایک کتاب ہے، مغربی تہذیب کا ناقدانہ مطالعہ جو شخص کرنا چاہے اسے مولانا واضح صاحب کی یہ کتاب پڑھنی چاہئے۔ جس طرح اردو میں مولانا مودودی کی ''تنقیحات'' مغربی تہذیب کی تنقید کے موضوع پر ایک مینار ادب کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح مولانا واضح حسنی کی یہ عربی کتاب

بھی مغربی تہذیب کی تنقید کے موضوع پر بہت اہم کتاب ہے۔مولانا واضح حسنی ندوی کئی بہترین فکری کتابوں کے مصنف ہیں الغزوالفکری اور الی نظام عالمی جدید کے علاوہ تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ بھی اہم کتاب ہے جس میں اسلامی تہذیب کے خدوخال بیان کئے گئے ہیں اوراس کتاب میں بھی مغربی تہذیب کے منفی پہلوؤں کا ذکر ہے۔ان خالص فکری کتابوں کے علاوہ ادب الصحوۃ الاسلامیۃ بھی اہم کتاب ہے۔سیرت نبوی سے متعلق بھی انکی نگارشات موجود ہیں ایک کتاب کا نام ہے محمد رسول اللہ وصحابتہ۔جس شخص نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے چشمہ فکر سے فیضان حاصل کیا ہواور صاحب قلم ہووہ سیرت کے موضوع سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے۔پھرانہوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی سے اکتساب فکر کا قرض بھی ادا کیا ہے،ان کی دو کتابیں مولانا کی شخصیت پر ہیں ایک ''الشیخ ابوالحسن علی ندوی قائدا وحکیما'' اور دوسری کتاب ''ابوالحسن علی الندوی، منابع فکرہ ومنہجہ''ان کتابوں کے علاوہ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں مثال کے طور پر الرحلات الحجازیۃ،لمحات من السیرۃ النبویۃ،مختصر الشمائل النبویۃ،اوران کے علاوہ کئی اردو کتابیں۔انہوں نے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی کتاب ''فضائل قرآن'' کا عربی میں ترجمہ بھی کیا ہےاور اس تصنیفی کام کی چھاپ مولانا واضح حسنی کی زندگی میں نظر آتی ہے قرآن کی تلاوت کرنا قرآن کی تلاوت سننا قرآن کے معانی میں تدبر کرنا ان کا بہترین مشغلہ تھا،قرآن سے ان کا والہانہ تعلق پیدا ہوگیا تھا۔

ایک عظیم مفکر یا مفکر اسلام یا مفکر ملت کا لقب مولانا واضح صاحب کے شایان شان نظر آتا ہے۔بہت کم لوگ ہوتے ہیں مفکر اسلام کی قبا ان کی شخصیت پر راست آتی ہے،مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام کے ساتھ مفکر اسلام لکھا جاتا رہا ہے وہ بجا طور پر مفکر اسلام تھے۔مولانا واضح حسنی ندوی نے ان سے پورا اکتساب کیا تھا اور وہ ان کے سچے جانشین تھے۔لیکن انہوں نے کبھی نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی اور اپنے لئے کسی لقب کو پسند نہیں کیا،آج جس طرح زمین اور جائداد اور مکان پر کچھ لوگ طاقت کے بل پر قبضہ کرلیتے ہیں اور انہیں ''لینڈ گریبرس'' کہا جاتا ہے اسی طرح سے علماء کے طبقہ میں بھی کچھ لوگ القاب پر ''غاصبانہ قبضہ'' کرنے لگے ہیں وہ مفکر اسلام ہونے کا کوئی ثبوت اپنی کسی کتاب سے نہیں دے سکتے نظریات کی اس رزمگاہ میں وہ کہیں صاحب کتاب وقلم اور صاحب فکر کی حیثیت سے اپنا وجود ثابت نہیں کرسکتے ہیں۔وہ نہ کتاب خواں ہیں اور نہ صاحب کتاب،صرف منصب دار ہیں لیکن ان کی خواہش ہوگی کہ لوگ ان کو مفکر اسلام کہیں اور لکھیں" یحبون أن یحمدوا بمالم یفعلوا" کی قرآنی تہدید ان کے پیش نظر نہیں ہوگی اوروہ اپنے نام کے ساتھ وہ القاب اپنے ماتحتوں سے لکھوانے لگے ہیں جس کے وہ مستحق نہیں،ان کے نام کے ساتھ ''مفکر اسلام'' کا لقب دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کسی نابالغ طفل خوردسال کو کسی قدآور شخصیت کی قبائے زرکار اور طرہ پر پیچ وخم والی دستار پہنا دی گئی ہے۔ایسے عزت دار علماء کو چاہئے کہ پہلے اپنے آپ کو نظریہ ساز شخصیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں تاکہ مفکر کا لقب کوئی انہیں عطا کرے تو وہ موزوں لگے پھر بھی بقلم خود مفکر لکھنے سے اجتناب کریں۔میں اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے یہ احتساب کرنا چاہئے یا نہیں،پھر دل یہ کہتا ہے جس شخص نے شہنشاہوں کے گریبانوں کو پکڑنا سیکھا ہے اسے کمتر لوگوں کا احتساب ضرور کرنا چاہئے۔تاکہ ایسا نہ ہو کہ معاشرہ میں کوئی برائی پنپ رہی ہواوراس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔

شہرت پسندی اور نام ونمود کے مزاج کے بالکل برعکس سادگی،گوشہ نشینی ،گمنامی تواضع حلم اور نرمی اور خاموش مزاجی مولانا واضح حسنی کی شناخت تھی جس کا اعتراف ہر شخص کرتا ہے۔ان کے مزاج میں ندویانہ رواداری اور توسع کی صفت بھی تھی۔ایک بار ہندوستان،حالات حاضرہ اور ملت کی اجتماعی کوششوں پر گفتگو ہورہی تھی میں نے کہا کہ اس دور کی اسلامی تحریکات اور قدیم مکتب فکر کے علماء میں اتنی دوری ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی خدمات سے واقف نہیں ہیں۔یہ سن کر افسوس کے ساتھ کہنے لگے نہ صرف یہ کہ واقف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ برسرعداوت ہیں،جیسے سامنے کوئی غنیم کی فوج ہو۔وہ اس پر افسوس ظاہر کررہے تھے۔مولانا واضح حسنی کے یہاں غیر معمولی طور پر توسع اور رواداری کا جذبہ تھا جو قدیم انداز کے دینی مدارس میں عام طور پر نہیں پایا جاتا ہے،اقبال کا یہ شعر ان پر صادق آتا تھا:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جداسب کا رفیق

☆☆☆

تاثرات

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی
سابق ڈین فیکلٹی آف دینیات، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

نوٹ: پروفیسر سعود عالم صاحب نے یہ خطاب افتتاحی نشست میں کیا، مولانا عالم ندوی نے اسے نقل کیا، پروفیسر صاحب کی نظر ثانی کے بعد اسے نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

حمد وصلوۃ کے بعد،

صدر عالی مقام! اور اہل علم حضرات!

میں سب سے پہلے تو ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب کو دلی مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک انتہائی خاموش مگر سمندر سے زیادہ وسیع اور پرعزم شخصیت کے لئے ایک علمی مذاکرے کا اہتمام کیا۔

شیخ سعدی نے کہا تھا کہ

نام نیکوں رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نیکت برقرار!

یعنی نیک لوگوں کے نام کو ضائع مت کرنا، باقی رکھنا اور آگے بڑھانا تاکہ تمہارا بھی نام بعد میں باقی رہے۔ میں نے بھی ایک حدیث پڑھی تھی زندہ لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ نے فرمایا جو کسی بزرگ کی عزت کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی بزرگی میں یعنی عمر درازی میں اضافہ کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو پیدا کرتا ہے جو اس کی عزت کرتے ہیں۔ شیخ سعدی نے غالبا اسی حدیث سے متاثر ہو کر یہ بات کہی ہے میں اپنے زمانہ طالب علمی کی بات عرض کرتا ہوں کہ ہم نے جب عربی کی شُد بد حاصل کی دارالعلوم دیوبند میں النادی العربی کے نام سے طلبہ کی انجمن ہوتی تھی، اب بھی ہے۔ وہاں عربی کے رسائل آتے تھے اور البعث الاسلامی بھی ہمارے یہاں آتا تھا اور اس کے سرورق پر ایک چھوٹا سا جملہ لکھا ہوتا تھا إلى الاسلام من جديد وہ متوجہ کرتا تھا کہ از سر نو اسلام کی طرف واپسی کرو۔ وہ پیغام یہ دیتا تھا کہ یہ دنیا جو اسلام کو چھوڑ کے مغرب کی طرف، مادیت کی طرف، الحاد کی طرف، دہریت کی طرف جارہی ہے اسے آواز دو۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اس کو بلائیں کہ نہیں تم لوٹ کر کے آؤ، از سر نو اپنے گھر کی طرف آنا ہے، تمہاری منزل یہ ہے۔ اس میں کالم ہوتا تھا صور و اوضاع کے نام سے۔ ہمارے ایک دوست ہوتے تھے جو اس وقت ندوہ میں استاد ہیں۔ ہم دونوں بیٹھ کر کے اس کو پڑھا کرتے تھے، اور مولانا واضح رشیدؒ کی فکر سے استفادہ کرتے تھے، خاص طور سے ان کا وہ متین لب ولہجہ اور ان کی جو تنقید مغربی افکار پر مغربی نظریات پر وہ کرتے تھے اور پھر موجودہ حالات پر جو تبصرہ وہ کرتے تھے وہ نقش آج بھی دل میں باقی ہے۔ میں نے ندوہ میں کبھی تعلیم حاصل نہیں کی، لیکن مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمۃ کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جس کو میں نے توجہ سے نہ پڑھا ہو، وہ میرے روحانی استاد ہیں۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ بہت سے مصنفین ہیں جو میرے معنوی استاد ہیں جیسے علامہ شبلی نعمانیؒ، سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندوی میں نے ان حضرات سے براہ راست استفادہ نہیں کیا لیکن ان کی کتابیں میری روحانی وعلمی تربیت کا ذریعہ بنیں مولانا واضح رشیدؒ اس خانوادے سے متعلق تھے جس نے ہمیشہ علم کی خدمت کی جس کو ہم کہتے ہیں کہ این خانہ ہمہ آفتاب است۔

جو شخصیت میں نے واضح صاحب کی دیکھی وہ یہ تھی ایک خاموش آدمی انتہائی متانت کے ساتھ شرافت کے ساتھ مولانا رابع صاحب کے ساتھ وہ بیٹھے ہوتے تھے، بہت کم بولتے تھے، نہایت معقول اور متین اور شریف پیرائے میں اپنی بات کہہ دیتے تھے۔

تین باتیں ہیں جو میں نے ان کی تحریروں سے حاصل کیں جو میرے لئے رہنما بنیں، پہلی بات تو تعلیم کا ایک ایسا نظام جو اسلام کے شایان شان ہو۔ طارق ایوبی صاحب نے جس کی طرف تھوڑا سا

اشارہ کیا، ندوہ کی بنیاد اس لئے پڑی تھی کہ:

قدیم صالح اور جدید نافع کو اختیار کیا جائے۔ بقول علامہ اقبال

مشرق سے بے زار نہ مغرب سے حذر کر
قدرت کا اشارہ ہے کہ ہ رشب کی سحر کر

ندوۃ العلماء کا مزاج تھا کہ جذبات کو عقل کے ماتحت رکھئے اور تعصب کو تحقیق کے ماتحت رکھئے۔ وہ مزاج علامہ شبلی نعمانی نے بنایا تھا، علامہ شبلی نعمانی وہاں سے الگ ہوگئے لیکن وہ مزاج ندوہ کا آخر تک رہا۔ میرے عزیز تھے مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ، فتاویٰ دار العلوم انھوں نے مرتب کی، ندوہ کے بھی وہ طالب علم رہے تھے اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کے وہ استاد تھے دار العلوم دیوبند میں ان کو بلا لیا گیا۔ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ دیوبند تشریف لائے، دار العلوم کی مسجد میں ان کی ملاقات ہوئی، مولانا نے پوچھا: ظفیر الدین تم یہاں آ گئے، انہوں نے کہا کہ مہتمم صاحب یعنی قاری طیب صاحب نے بلا لیا۔

مولانا علی میاں نے فرمایا ایک بات یاد رکھنا دار العلوم ایک بڑا ادارہ ہے، لیکن اس کے مزاج میں شدت ہے ندوہ کے مزاج میں اعتدال ہے تو اس کو باقی رکھنا، دیوبند کے علم میں کوئی کلام نہیں ہے اس کے مقام میں مرتبہ میں کوئی کمی نہیں، صرف لب ولہجہ میں شدت ہے، ندوہ کا جو مزاج تھا وہ پورے اس خانوادے کا تھا، یعنی اعتدال یہ اعتدال مولانا واضح رشیدؒ کی تمام تحریروں میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب پہ تنقید کی اور خاص طور سے، اخوان کے معاملے میں عرب حکمرانوں پر تنقید کی، لیکن بہت اعتدال کے ساتھ، لب ولہجہ کی شیرینی کے ساتھ۔ دینی تعلیم کا جو معاملہ ہے اس میں مولانا واضح صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بنیادی علوم میں تبدیلی نہ کی جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہم نے اختیار کر لیا ہے، اس سے زیادہ مفید چیزیں آ گئی ہیں، ان کو اختیار کر لیا جائے، یعنی قرآن وسنت اور فقہ کو باقی رکھئے اور باقی علوم میں اسے اختیار کیجئے جو نفع بخش ہو۔

جموں کشمیر میں میرا ایک بیان تھا کہ اسلام دین دنیا کی تفریق کا قائل نہیں ہے، اسلام علم نافع اور علم غیر نافع کی تقسیم کرتا ہے، و أما ما ينفع الناس فيمكث في الارض مدارس کے سب لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ جو موجودہ نظام تعلیم ہے، وہ اس ضرورت کو پورا نہیں کر رہا ہے کہ جس سے ہم ایسی شخصیت تیار کریں، جو معاشرہ کے اندر خدمت کا، انقلاب کا، اصلاح کا فریضہ انجام دے، مولانا نے اپنے ایک مضمون میں قیادت کے مسئلے پر گفتگو کی اور دینی تعلیم کو امت کی قیادت کا ذریعہ بنانے پر زور دیا۔ ہم نے جو نظام اختیار کیا ہوا ہے اس میں مافی الذات کو باقی رکھتے ہوئے مافی الضمیر میں تبدیلی کر دی جائے۔ سارے مدارس اس بات کو محسوس کر رہے ہیں لیکن گھنٹی کون باندھے گا، بڑے مدارس آگے بڑھیں گے تو چھوٹے مدارس آگے بڑھیں گے، مگر بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ امام غزالی اسی نصاب سے پیدا ہوئے امام رازی اسی سے پیدا ہوئے، حکیم الاسلام، حکیم الامت اور سارے بزرگان دین اسی سے پیدا ہوئے، میں کہتا ہوں کہ اللہ نے ان کو صالحیت سے ان کی استاد کی تربیت سے ان کی اپنی محنت سے پیدا کیا۔ مولانا واضح رشیدؒ نے تعلیم پر نظر ثانی کی جو بات فرمائی وہ مدارس کے ایجنڈے میں شامل ہونا چاہیے۔

طلبا کی شخصیت انفرادی طور پر اجتماعی طور پر ملی قیادت کے طور پر جو چیز بنا سکتی وہ یہ کہ آپ اپنے بنیادی ایشوز کو باقی رکھیں، لیکن جو فی زمانہ ضروری ہے اسے اختیار کیجئے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس نصاب پر گفتگو کی تھی، اب دوبارہ ہم اس پر غور کر نہ کریں، تو کم از کم جو مسائل قدرت نے ہمارے سامنے رکھے ہیں ان کا انکار نہ کریں۔ مولانا واضح صاحب نے ندوۃ العلماء کے فضلاء سے اس سلسلہ میں کچھ سوالات کیے تھے۔ عرض ہے کہ ندوہ کے فضلاء کو جس بات کا احساس دلایا جا رہا ہے، اس بات کا احساس تمام علماء کو کرایا جائے اور ان کو مجبور کیا جائے کہ وہ ایسا نصاب بنائیں، جو وقت کے چیلنج کو پورا کر سکے، اور باطل کا مقابلہ کر سکے، مولانا واضح کی تجویز بڑی اہمیت کی حامل ہے، اور اس کانفرنس کو ایک ریزولوشن پاس کرنا چاہیے، کہ مولانا کی اس فکر کو آگے بڑھایا جائے، دوسری بات ''صورٌ واوضاعٌ'' کے حوالہ سے یہ ہے کہ مغرب کا براہ راست مطالعہ کیا جائے، آج ہمارے مدارس میں مطالعہ کو خارجی وداخلی دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، مطالعہ ایک نعمت ہے، اس سے انسان کی شخصیت بنتی ہے، اور اگر مسائل پر آپ کی نظر نہیں ہوگی تو آپ محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ اقبال نے کہا ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج بھی نہ سکے گا حریف سنگ

مغربی تہذیب کا تجزیہ کرتے ہوئے دوسری بات مولانا یہ کہتے

تھے، کہ آج جس چیز کے اثرات براہِ راست عالم اسلام پر پڑ رہے ہیں، ان سے کسی بھی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، مغرب جو کچھ کرتا ہے، عالم اسلام اس کی جگالی کر رہا ہے، جتنی بیہودگیاں مغرب کرتا ہے، وہ ہمارے حکمرانوں کے ذریعہ ہمارے معاشرہ میں داخل ہو رہی ہیں، مجھے خوشی ہے کہ اس کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگ ندوہ میں آئے تو اہل ندوہ نے ان سے معذرت کر لی۔ علماء کا کام یہ ہے کہ حق کا راستہ بتاتے رہیں، اگر آپ میں اتنی جرأت نہیں کہ آپ برملا تنقید کر سکیں تو اپنے آپ کو سائڈ کر لیں کہ اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ آج جو عالم اسلام میں اضطراب ہے، اور جو لوگ اس بیہودگی کی حمایت کر رہے ہیں، وہ کل رسول کے سامنے جواب نہ دے سکیں گے، قیامت میں وہ رسوا ہوں گے۔

ہمارے ائمہ میں ابو حنیفہؒ کا کیا بڑا مقام تھا، وہ جیل گئے، امام مالکؒ کو جیل میں ڈالا گیا، امام شافعیؒ کو بھی جیل میں ڈالا گیا، امام احمدؒ کو کوڑوں سے پیٹا گیا، یہ وہ ائمہ اربعہ ہیں جن کے نام پر ہماری عظمتیں ہماری ٹوپیاں جھکتی ہیں، یہ صرف کتاب لکھنے سے امام نہیں ہوئے، انہوں نے حاکموں کی غلط باتوں پر سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ جیل کی سلاخیں منظور کیں لیکن امت محمدیہ کی وہ ذمہ داری جو نائب رسول ہونے کی حیثیت سے اللہ کے رسول نے ہمارے اوپر ڈالی ہے، اس کو ہم شرمندہ نہیں ہونے دیں گے، اور قیامت کے دن ہم اللہ کے رسول کے سامنے سرخرو ہو کر جائیں گے۔ اب یہ ہمارے مدارس ہمارے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کردار کو نبھائیں۔

عالم اسلام پر جو اثرات پڑ رہے ہیں، ان پر نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے، عربی صحافت کا مولانا نے محاسبہ کیا، یہ عربی صحافت ہی تو ہے جس نے جمال عبد الناصر کو، قذافی کو، ان سب کو امیر المومنین بنا دیا تھا، اسلامی صحافت کو بے لاگ صحافت ہونا چاہیے، اور مولانا نے اس پر گفتگو کی ہے۔ میں اپنے نوجوان فضلا سے کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا کی یہ بات سمجھ لو، تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو، اور عالم اسلام میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر نظر رکھو، کیوں کہ ہم قرآن وسنت کے نمائندہ ہیں کسی ملوکیت کے نمائندہ نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ مولانا کا ادب سے رشتہ بہت مضبوط تھا، مولانا انگریزی کے عالم تھے، عربی اور اردو کے آدمی تھے، اظہار خیال کا جو سلیقہ ان کو آتا تھا، وہ ہمارے طلبہ کو آنا چاہیے، ادب کا رشتہ تعلیم سے کاٹ دیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مذہب آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ ادب کے ایک وسیع اصطلاح ہے۔ زندگی میں ادب، شخصیت کا ادب، نشست و برخاست کا ادب، استاد کا ادب، زبان کا ادب۔ مولانا واضح صاحب ادیب تھے، انھوں نے بہت مضبوطی کے ساتھ مذہبی ادب کو پیش کیا ہے، جو حضرات ان کی صحبت میں رہے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں۔ امام حسن عسکری کا ایک قول ہے لیس الیتیم من مات والده ان الیتیم یتیم العلم والادب، یتیم اس کو کہا جاتا ہے جس کا والد مرجائے والد کے مرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے، نان ونفقہ کا نقصان ہوتا ہے، جبکہ رزق کا مالک تو اللہ ہے، باپ روزی رساں نہیں ہے، روزی دینے والا اللہ ہے۔ بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچہ علم وادب سے محروم رہ جائے۔ مولانا واضح صاحب کی شخصیت اور ان کی تحریروں میں جو ادب کی دعوت ہے وہ ہمارے مسلمانوں اور نئی نسلوں تک پہنچنی چاہیے، یہاں پر یونیورسٹی کے لوگ ہیں۔ سب سے زیادہ بے ادبی یونیورسٹی میں آگئی ہے۔ قرآن میں ہے: کلا إن الانسان لیطغی ان راٰہ استغنی، آدمی سرکش اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے کہ میرے پاس پیسہ آگیا، علم آگیا، نوکری آگئی۔ لیکچرر، پروفیسر، ڈین، چیرمین سب کچھ ہو گئے۔ جب یہ سب چیزیں آتی ہیں تو انسان کے اندر سرکشی آتی ہے۔ اور اس سے آدمی کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے، علاج کیا ہے: إن إلی ربك الرجعی اللہ کی طرف پلٹو۔ یہی پیغام مولانا واضح رشید صاحب دیتے تھے، یعنی الی الاسلام من جدید.

خشیت وانابت: انابت اختیار کرو۔ یہ مولانا کی ذاتی زندگی میں تھی۔ اور اس کی وہ دعوت دیتے تھے، اسی نکتہ کو مولانا روم نے اس شعر میں بیان کیا ہے

ادب تا جیست از لطف الٰہی
بنہ برسر برو ہر جا کہ خواہی

ادب اللہ کی مہربانی سے ایک تاج ہے، اسے پہنو اور جہاں چاہو جاؤ۔ ادب کا تاج اگر ہمارے سروں پر ہوگا تو ہماری عزت ہوگی، اگر یہ نہیں ہوگا تو ذلیل کہے جائیں گے۔

☆☆☆

تأثرات

مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ

تاریخ ادب کا ایک روشن باب

پروفیسر اقبال حسین ندوی
ای ایف ایل یونیورسٹی، حیدرآباد

نوٹ: پروفیسر اقبال صاحب لکچرز کے لئے شعبہ عربی میں مدعو تھے، یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ وہ شریک سیمینار ہوئے اور افتتاحی نشست میں خطاب کیا۔ (ادارہ)

مولانا سید واضح رشید ندوی کی شخصیت ایک عظیم اہل قلم، زبان و ادب اور علم وثقافت کی علامت اور زندگی کی اعلی قدروں کی شناخت ہے، ان کا ذکر جب بھی کیا جائے گا، ایک ایسے انسان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آئے گی، جس کی مثال اسی دور میں اب جیسے ناپید ہو، وہ انسان جس نے ہندوستان جیسے ملک میں آنکھیں کھولی ہوں، اس نے عربی زبان و ادب کے میدان میں عربی ممالک کے کسی بھی بڑے ادیب کی ہمسری میں کوئی کمی نہیں کی ہے، زبان و بیان اور فکر وخیال کی سطح ان کے پاس نہایت بلند ہے، ہندوستان کی عربی زبان وادب کی تاریخ میں ان کا کام نہایت روشن ہے، زبان و ادب کی اس عظیم شخصیت کی عظمت ان کی تحریروں کے علاوہ ان کی ذات والا صفات میں جس طرح پائی جاتی رہی ہے، اس دور میں کم از کم عنقا ہے، وہ نہایت ہی بلند اخلاق اور اعلی کردار کے انسان تھے، ان کی اس خوبی سے کون واقف نہیں ہے کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہمیشہ دسروں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتے تھے، کسر نفسی کی ایسی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

ان کا قلم علم و ادب کی آبیاری کے لئے وقف تھا، ان کے قلم کا دائرہ، الرائد، البعث الاسلامی کے ارد گرد گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے، اس لئے لوگ ان کو ایک صحافی کی نظر سے دیکھتے ہیں، جو ایک محدود تصور کی علامت ہے۔

ان کا قلم زبان وادب، تاریخ وفلسفہ، تہذیب وثقافت، اور فکر ونظر کا جس انداز سے تحلیل و تجزیہ کرتا ہوا نظر آتا ہے، اور اس تحلیل و تجزیہ میں ایمان وصداقت کا عنصر جس قدر نمایاں ہے، وہ ایک منفرد انداز تحریر اور منفرد اسلوب تحریر ہے، اس اسلوب میں ادب کی جمالیات بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔

ان کی تصنیفات میں تاریخ الادب العربی، العصر الجاہلی میرے نزدیک علمی وادبی اعتبار سے ایک گرانقدر تصنیف ہے، ہندستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ پر لکھی جانے والوں کتابوں میں وہ ایک منفرد کتاب ہے۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ تاریخ ادب ہونے کے ساتھ عربی زبان کے نشو ونما میں لسانیاتی تحلیل نے اس کو لسانیاتی تجزیاتی کتاب بھی بنا دیا ہے، کتاب میں عربی زبان کی ترقی اور اس کی خصوصیات پر مختصر لیکن جامع بحث شامل ہے، عربی زبان کو اسلام سے قبل بھی اہمیت حاصل تھی، اسلام کی آمد کے بعد صرف جزیرہ عرب کی زبان نہیں رہ گئی، ایک عالمی زبان بن گئی، اس زبان کی وسعت اور الفاظ کی کثرت، اور معمولی سے معمولی چیزوں کے لئے الفاظ کا استعمال، انسانی احساسات کا زندگی سے تعلق، اس کے اظہار کے لئے تعبیرات اور ہمہ گیری کے بارے میں مولانا نے جو نکتہ سنجی کی ہے، بڑی خوبی کی بات ہے۔

زبان میں معانی کو سمو لینے کی صلاحیت پر مثالیں پیش کی گئی ہیں، اور عربی زبان کے ترقی پذیر ہونے کی خوبی پر لسانیاتی انداز میں کتاب

میں بحث کی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں اہل عرب کے وطن سے متعلق معلومات اور وہاں کی جغرافیائی خصوصیات کا تذکرہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے، تاریخی حقائق پر عالمانہ اور محققانہ گفتگو کتاب میں شامل ہے، اسی کے بعد عربی زبان کے وجود اور اس کی خصوصیات پر سیر حاصل بحث ہے۔

بحیثیت تاریخ ادب عربی کے کتاب کی اہمیت اس کے مندرجات، انداز بیان، تنقیدی بصیرت، فکری تحلیل، اور تاریخ ادب کے اصولوں کی روشنی میں نمایاں ہے، اس موضوع پر جرجی زیدان کی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ سے لے کر آج کے دور تک بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اور یہ کتاب کیوں لکھی گئی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد رابع ندوی اور خود مصنف کے مقدمہ سے اس کتاب کے لکھنے کی غرض و غایت پر نظر پڑتی ہے۔

بنیادی طور پر ادب کو مختلف مکاتب فکر کے افراد نے اپنے اپنے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی اور اس پر خامہ فرسائی کی، اس کی وجہ سے مختلف رجحانات سامنے آئے، ادب کو زندگی کی تعبیر اور اس کا آئینہ سمجھا گیا ہے، جو ادب برائے ادب یا جمالیاتی ادب کی بات کرتے ہیں وہاں بھی بنیادی طور پر ادب کی وابستگی، زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ سے ہوتی ہے، بہر حال زندگی کی جمالیاتی کیفیت ہو یا کچھ اور، زندگی سے ہی اس کا واسطہ ہوتا ہے، اس لئے کہ زندگی ہر رنگ میں نظر آتی ہے، لیکن دین اور خاص طور سے دین اسلام میں زندگی کے حسن کا جو تصور ہے، وہ کہیں شاید ہی نظر آتا ہے، جنت کا تصور ہو یا اللہ کے جمال کا تصور، وہ ایک حسن کا منفرد تصور ہے، جو انسان کو زندگی میں خوبصورت تصور کے ساتھ زندگی گذارنے کا خوبصورت سلیقہ سکھاتا ہے، اور زندگی حسین سے حسین تر ہو جاتی ہے، مولانا سید واضح رشید ندوی نے ایک ہی فصل میں ادب کی تعریف، اس کی قسمیں اور ادب وعلم اور دین میں باہم کیا رشتہ ہے، اس پر بہت ہی عالمانہ ادبی گفتگو کی ہے، جس سے ادب کا خوبصورت تصور سامنے آجاتا ہے۔

اسی کے بعد کسی بھی ادب کو سمجھنے کے لئے اس دور کے اجتماعی اور ثقافتی حالات کو جاننا نہایت ضروری ہے، عصر جاہلی کے عربی نثر و نظم کے مطالعہ کے لئے اور سمجھنے کے لئے اس دور کے اجتماعی، ثقافتی اور دینی خصوصیات پر گفتگو کی ہے، تاکہ اس دور کے ادب کو سمجھا جا سکے، اس کے ساتھ ہی نثر کے نمونے شامل کئے گئے ہیں، ایک فصل میں جاہلی شاعری اور اس دور کے شعراء کو موضوع سخن بنایا گیا ہے، اسی طرح دور کے اعتبار سے مضامین کی رعایت کرتے ہوئے، عناوین قائم کئے گئے ہیں اور ہر ایک عنوان کے تحت شعراء کی زندگی اور ان کے فن پر گفتگو کی گئی ہے، جیسے المعلقات اور اہم شعراء پر گفتگو کرنے کے بعد عنوان ہے، شعراء آخرون، الشعراء الاقدمون، اسی طرح عناوین میں الشعراء الفرسان، الشعراء الصعالیک، الشعراء الحکماء، الشعراء الأجواد، شعراء الیھود، والنصاری، الشعراء النصرانیون، نقد کتاب شعراء النصرانیۃ۔

پھر آخری باب میں شعری روایت یعنی جاہلی شاعری تحریر میں آنے سے پہلے روایت کی بنا پر دوسری نسلوں تک منتقل ہوتی رہی ہے، اصل شاعری کی روایت اور اس میں لوگوں کے اضافہ کرنے کے موضوع پر گفتگو تحقیق کے پیرائے میں کی گئی ہے، اس دور کی شاعری کی شرح، عربی خط، اس کی تاریخ، شعر کو تحریر میں لانے کی تاریخ اور اس سے متعلق معلومات تحقیقی بنیاد پر کتاب میں شامل ہے۔

اس لحاظ سے کتاب اپنے موضوع پر اہم اور منفرد ہے، اتنی جامعیت اور اختصار سے علمی ادبی گفتگو بہت کم کتابوں میں نظر آتی ہے، مولانا سید واضح رشید ندوی کے علمی اور تحقیقی ذوق ومعیار اور زبان و بیان کی خوبیوں کو تلاش کرنا ہو تو دقت نظر کے ساتھ اس کتاب کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

صدارتی خطاب

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

نوٹ: پروفیسر ظلی صاحب کی یہ گفتگو مولوی سہیل ندوی نے رکارڈنگ سے نقل کی جو ان کی نظر ثانی کے بغیر شامل اشاعت کی جارہی ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈائریکٹر شبلی اکیڈمی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

میرے بزرگ پروفیسر احتشام صاحب، پروفیسر اقبال صاحب، سعود عالم صاحب، برادر محترم قاری عبداللہ صاحب، محترم حضرات اور عزیز طلبہ۔

میں سراپا سپاس ہوں طارق ایوبی صاحب کا اس عزت افزائی کے لئے، اور اس حقیقت سے واقف ہوں کہ دو اداروں کے درمیان جو غیر معمولی تاریخ اور اشتراک اور محبت کا رشتہ رہا ہے، دراصل اس کے ذریعہ سے میری یہ عزت افزائی کی گئی ہے، دارالمصنفین، ندوۃ العلماء یہ داستان ایک دوسرے میں کچھ اس طرح پیوست ہے کہ اس کو ایک دوسرے سے الگ کرنا اور جدا کرنا ممکن نہیں ہے، مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ وقت بہت کم ہے، بہت سے مقالات آپ کو سننا ہے، اور افتتاحی نشست کا جو وقت تھا وہ بھی گزر چکا ہے، اس لئے بہت ہی اختصار کے ساتھ چند باتیں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا، مولانا واضح رشید حسنی صاحب دراصل اس تعلیم کا ایک نہایت خوبصورت نمونہ تھے، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مقصد تھا، علامہ شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''مسلمانوں کی تعلیم نہ جدید ہے، نہ قدیم بلکہ دونوں کا ایک معجون مرکب ہے''، یہ وہی بات ہے جس کو علم نافع یا غیر نافع کے نام سے پیش کیا گیا تھا کہ جو بھی علم نافع ہے ہمیں اس کو اختیار کرنا چاہیے، اور جو علم غیر نافع ہے اس سے ہمیں دستبردار ہوجانا چاہیے، اور یہ دونوں کا مجموعہ ہی دراصل ہمارے تمام امراض کا علاج ہے اور حل ہے، مولانا واضح رشید صاحب کی بے نفسی خاکساری کا ایسا عجیب عالم تھا کہ واقعۃً دیکھنے والوں کے لئے اس پر یقین کرنا مشکل ہے، ایسا صاحب علم، ایسی غیر معمولی بصیرت رکھنے والا، حال اور ماضی پر ایسی گہری نگاہ رکھنے والا، اور اپنے آپ کو اس طرح رکھے جیسے اس کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے، خبر ہی نہیں ہے، وہ دارالمصنفین اپنے برادر اکبر کے ساتھ بار بار تشریف لائے، بڑی خواہش ہوتی تھی اس ناچیز کی اور وہاں موجود تمام لوگوں کی کہ مولانا کی زبان سے کچھ سنا جائے، لیکن وہ مولانا رابع صاحب کے سامنے کبھی کچھ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ایک مرتبہ بہت مشکل سے چند جملے انھوں نے کہے، ان دونوں بھائیوں کی محبت بھی عجیب وغریب محبت تھی، اس کی مثال کم از کم ہمارے زمانہ میں ملنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، انھوں نے اپنے آپ کو اپنے بڑے بھائی کے لئے جس طرح فنا کر دیا، اور اب واقعہ یہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی کو ان کی عدم موجودگی میں جو خلا محسوس ہوتا ہوگا اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، ابھی گزشتہ چند دنوں قبل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تعزیت کے لئے، تو کوئی بھی وہاں جا کر دیکھنے والا، بات کرنے والا یہ احساس کرسکتا ہے کہ وہ کس کرب اور درد سے گزر رہے ہیں، مولانا واضح رشید ندوی صاحب نے مختلف سوتوں سے فائدہ اٹھایا، مختلف سوتوں سے سیراب ہوئے، ندوۃ العلماء کے بہترین فرزند اور علی گڑھ سے انگلش لٹریچر میں ایم۔اے کیا، اور وہ بھی بہت پہلے، اور دیگر مختلف لوگوں نے مولانا شبلی کی زیر سرپرستی رہ کر انگریزی تعلیم

حاصل کی تھی، یہاں تک کہ ان کے شاگرد مولانا عبدالباری ندوی فلسفی کو یہ درجہ ملا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جس کے ہاتھ پر فلسفہ نے اسلام قبول کیا ہے، وہیں دوسری طرف علامہ سید سلیمان ندوی نے انگریزی کی اتنی شد بد حاصل کی تھی کہ انگریزی لٹریچر سے استفادہ میں ان کو کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی، لیکن یہ روایت پھر کمزور پڑتی چلی گئی اور پھر اسی روایت کو مولانا واضح صاحب نے جس انداز سے زندہ کیا اس کی مثال مشکل ہے، اور پھر ان کو ریڈیو اسٹیشن سے وابستگی کا موقعہ ملا، اور جنرلزم سے سابقہ پڑا، اور وہاں رہ کر دنیا بھر کے حالات سے ان کو جو واقفیت حاصل ہوئی، اور ان کی سوچ کے اندر جو گہرائی آئی وہ عدیم المثال ہے، کیوں کہ مولانا کی شخصیت کا خمیر ہی عجیب وغریب طریقہ سے تیار ہوا تھا، ہماری علمی دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کو زبان و بیان پر ایسی زبردست قدرت ہو، اور ادب کے ماہر ہوں، اور حالات وکوائف پر اتنی گہری وعمیق نظر ڈال کر اس کا تجزیہ کرنے کے اہل ہوں۔

ایک بڑی پریشانی ہمارے سامنے آج کی دنیا میں یہ بھی ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے اس کو تو ہم دیکھتے ہیں، لیکن دراصل جو سامنے ہو رہا ہے، وہ اصل نہیں ہے، اس کے پس پردہ بہت ساری طاقتیں ہیں، اس کی ڈور کھینچنے والا نہ جانے کون ہے؟ دراصل اس میں جو لوگ پیش پیش ہیں ان کے مقاصد کیا ہیں؟ بظاہر نظر کیا آرہا ہے؟ اور باطن میں مقصد کیا ہے؟ ان چیزوں سے اکثر لوگ واقف نہیں ہوتے۔

داعش نے سر اٹھایا تو بہت سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ خلافت زندہ ہوگئی، اور اسی طریقہ سے بہت سی چیزیں ہمارے سامنے ہیں یہ تو صرف ایک نام ہے، اور روزانہ ہم چشم دید حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، ان تمام چیزوں کے پس پردہ جو مقاصد دراصل ہیں، ان کے پس منظر میں جو چیزیں پنپ رہی ہیں، جن کا نمونہ ہمارے سامنے آرہا ہے، ان کی نقاب کشائی واقعی بہت مشکل کام ہے، اور ہمارے یہاں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو ان چیزوں کو سمجھتے ہیں، ڈونالڈ ٹرمپ آج کل کیا کر رہا ہے وہ پاگل ہے؟ یا بیوقوف؟

دراصل وہ اس وقت سب سے بڑا داعی ہے، وہ ایک بڑا مقصد اپنے مذہب کی تبلیغ میں اور اس کو پورا کرنے میں مہنمک ہے، آپ جانتے ہیں کہ یہ بات عیسائی حلقہ میں مشہور ہے، اور ان کا عقیدہ ہے کہ جب تک یہودیوں کا مکمل غلبہ یروشلم پر نہیں ہوجائے گا۔ القدس پر نہیں ہوجائے گا، تب تک ان کے اپنے عقیدے کے مطابق عیسیٰ مسیح کی تشریف آوری اس دنیا میں نہیں ہوگی، وصایا کا انتظار ان کو بھی ہے، وصی کا انتظار سب کو ہے، لیکن ان کے یہاں جو وصایا کا انتظار ہے وہ اس پر منحصر ہے کہ یروشلم پر پہلے یہودیت کا غلبہ مکمل ہو، تو ڈونالڈ ٹرمپ اس کام کو انجام دینے کی کوشش کر رہا ہے، مولانا واضح صاحب کو اللہ نے یہ بصیرت دی تھی، یہ فراست عطا کی تھی، یہ لیاقت وصلاحیت عطا کی تھی کہ وہ ان تمام اور ان جیسے حالات کا صحیح تجزیہ کر سکتے تھے، اور لوگوں کے سامنے حقیقی باتوں کو پیش کرتے تھے، مولانا کی شخصیت ان تمام خوبیوں سے تیار کی گئی تھی، مولانا اپنی مثال آپ ہیں، آج کے اس گئے گذرے دور میں اب مولانا بھی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طریقہ سے آج اسلام کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں، اسلام کے خلاف کوششیں ہو رہی ہیں ان کے مقابلہ کے لئے اور ان سے نبرد آزمائی کے لئے ہمارے درمیان مولانا کی شخصیت کی طرح ایک ٹیم ہو، ایسے اور افراد موجود ہوں جو زمانہ کی رہنمائی کر سکیں، علم کے ساتھ، بصیرت کے ساتھ، لیاقت وصلاحیت کے ساتھ ورنہ اس کے بغیر ہمارے لئے، ہماری شریعت اسلامیہ کے لئے بڑا خطرہ ہے۔

لہذا ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان ایسے ہی نبض شناس پیدا کرے، اور ان سے کام لے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

☆☆☆

سلسلۂ مقالات

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ اور
قرآنیات پر ان کی تحریریں

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
(سابق ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

نوٹ: پروفیسر اصلاحی کے متعلق ذکر کیا جا چکا کہ وہ علالت کے سبب مقالہ نہ لکھ سکے، مگر نکات کی روشنی میں گفتگو کی، مولوی عالم نے اس کو نقل کیا۔ اب ان کی نظر ثانی کے بغیر شامل اشاعت ہے۔ (ادارہ)

محترم صدر مجلس، معزز حاضرین کرام، عزیز طلبہ!

صورت حال یہ ہے کہ میں ابھی پانچ چھ دن کے سفر سے واپس ہوا ہوں، سفر کی برکات کے ساتھ ساتھ کچھ آزمائشیں بھی ہو جاتی ہیں، اور کچھ عوارض بھی مجھ کو لاحق ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں یہاں آؤں، اور چند گھنٹے بیٹھ سکوں، لیکن اس مدرسہ سے جو تعلق ہے، اور پھر میں نے بھی ساتھ آٹھ سال تقریبا مدرسہ کی ہی چٹائی پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے تعلق کا باقی رکھنا اور برقرار رہنا یہ فطری بات ہے، دوسرے مولانا مرحوم کی زندگی سے جو بہت سے قیمتی اسباق ملتے ہیں ان میں ایک بڑا سبق ایثار و قربانی کا بھی ہے، اپنے آرام کو قربان کر دینا یہ ان کے سامنے بہت معمولی سا ایثار ہوگا۔ اسی کے پیش نظر میری یہاں حاضری ہو رہی ہے، میری مختصر سی بات چیت کا عنوان ہے:

مولانا کے برادر معظم ومکرم مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ العالی کی کتاب ''قرآن کریم انسانی زندگی کا رہبر کامل'' پر مولانا واضح صاحب کا مقدمہ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا کی نگارشات کا ایک بڑا اور قیمتی وقیع حصہ ان کے مقدمات، دیباچے، تقریظات، اور ابتدائی تحریریں ہیں، جو مختلف کتابوں پر موجود ہیں۔

میں نے ان کی چند کتابیں دیکھی ہیں، اور چند ہی کتابیں میرے پیش نظر رہی ہیں، جن میں ان کا مقدمہ ملتا ہے مولانا سید محمد رابع صاحب کی دوسری کتاب سیرت نبوی سے متعلق ہے ''سراجا منیرا'' ''رہبر انسانیت'' ان پر بھی مولانا کا مقدمہ ہے، اس کے علاوہ سید محمود حسنی ندوی صاحب کی دو کتابیں ہیں، ایک ''تاریخ اصلاح و تربیت'' اور ایک ''حیات الباری'' ان کے ابتدائی حصہ میں بھی مولانا کی قیمتی تحریریں ہیں، یہ میرے لئے سعادت کی بات ہے کہ چاروں کتابیں مصنفین گرامی کی ہدیہ کردہ میرے ذاتی ذخیرہ میں موجود ہیں، ادب اور صحافت، تعلیم و تربیت، تاریخ ان سب کے ساتھ ساتھ مولانا کا گہرا تعلق قرآن و سنت سے بھی رہا ہے، اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں، مجھے ان کی کتابوں کو کم پڑھنے کا موقع ملا ہے، لیکن جو مقدمات میں نے ابھی ذکر کئے ہیں، ان میں بہت مناسب انداز میں برمحل قرآنی آیات کی تشریح و ترجمانی کی گئی ہے، اور میرے نزدیک مولانا کے قرآن کریم سے گہرے ربط کا ثبوت اور بہت واضح ثبوت مولانا کی عملی زندگی ہے، مولانا کے اوصاف جلیلہ، مولانا کے صفات عالیہ، مولانا کے اطوار پسندیدہ دراصل قرآنی کی نظر میں مطلوبہ صفات ہیں، اور مومن کے مطلوبہ صفات کے آئینہ دار ہیں، میں نے مولانا کے بارے میں ان کے ہم درس حضرات کی، ان کے تلامذہ کی تحریریں پڑھی ہیں، اور ان سب میں قدر مشترک کے

طور جو پر ملتا ہے جیسا کہ آپ نے سنا بھی ہوگا اور واقف بھی ہوں گے، سادگی، تواضع وانکساری، بے نفسی، نام ونمود سے دوری یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کا ذکر تمام لوگوں نے کیا ہے۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ رب العزت نے سورہ فرقان کے آخر میں اللہ کے نیک بندوں کی جو صفات بیان کی ہیں، ان میں سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ جو لوگ زمین پر چلتے ہیں تو نرم روی اختیار کرتے ہیں، نرم چال چلنا یہ نشانی ہے تواضع کی، انکساری کی، سادگی کی، اور اکڑ کر چلنا غرور اور تکبر کی علامت ہے، اور نرم روی سے چلنا تواضع اور انکساری کا نمونہ ہوتی ہے۔ اور قرآن کی صفت کا پرتو ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہنا چاہوں گا کہ مولانا کی حالات حاضرہ پر گہری نظر تھی اور عالم اسلام اور عالم مغرب اور دیگر ممالک کے احوال پر نظر اور ان پر بے لاگ تبصرہ کے حوالہ سے ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ وہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے، کہ ؎

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

لیکن میں مولانا کی صفات عالیہ اور اوصاف محمودہ کے حوالہ سے یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ مولانا صحیح معنوں میں علامہ اقبال کے اس شعر کے زیادہ مصداق تھے کہ

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اور مزید کہوں گا کہ مولانا کے معمولات یومیہ میں تین چار پارے پڑھنا ضرور شامل تھا، اور جب ان کی بینائی کمزور ہوگئی تو ایک دو پارے خود پڑھتے تھے اور دو تین پارے دوسروں سے سنتے تھے، اور یہ بھی بڑی قابل فخر بات ہے کہ آخری وقت میں جب وہ بیمار ہوئے تو انھوں نے اپنے گھر والوں سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا کہ فلاں ڈاکٹر بلاؤ یا فلاں نرسنگ ہوم لے چلو بلکہ اپنے گھر والوں سے یہ کہا کہ قرآن کی تلاوت کرو اور اپنے صاحبزادے مولانا سید جعفر صاحب سے کہا کہ قرآن پڑھو وہ قرآن جو "شفاء لما فی الصدور" ہے، وہ قرآن جو "ما ھو شفاء ورحمة للمؤمنین" ہے، اس سے اندازہ لگتا ہے اور میں یہاں ایک بڑی اہم بات کہنا چاہوں گا کہ تقریبا ۲۹ سال پہلے ان کے ایک شاگرد نے ان سے ایک انٹرویو لیا تھا ۱۹۸۷ء میں۔ ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کی محسن کتابیں کون سی ہیں، تو مولانا نے بہت خوبصورت انداز میں یہ جواب دیا کہ جو کتاب بھی آپ کے مطالعہ میں آئے اور آپ کے دل ودماغ کو متاثر کرے، وہی محسن کتاب ہے، اور اس کے بعد ایک جملہ مزید کہا وہ قابل غور اور قابل توجہ ہے کہ قرآن وحدیث سے بڑھ کر محسن کتاب اور کون سی ہوسکتی ہے۔

یہ مقدمہ جو ہے تو بہت مختصر لیکن مولانا نے بہت اچھے انداز میں قرآن کے بارے میں ساری معلومات جمع کی ہیں، سب سے پہلے قرآن کے مضامین کا تعارف، قرآن کی خصوصیات، قرآن کی فصاحت وبلاغت، اعجاز بیانی پر تبصرہ، اور اسی کے ساتھ ساتھ اور اس لحاظ سے بھی اظہار خیال کہ اقوام سابقہ کا اس میں تذکرہ، اور ذریعہ رشد وہدایت اور حق و باطل کی پہچان، اور خلق خدا کی خصوصیات یہ تمام چیزیں بیان کی ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ مولانا نے اعجاز بیانی پر تمام قدیم کتب کا ذکر اور ان کے مصنفین کے نام اور ان کے سن وفات کے ساتھ ساتھ تقریبا پندرہ کتابیں ذکر کی ہیں جن کے تعلق سے مولانا نے اسلوب بیان سے بھی بحث کی ہے، اور اس میں زبان وبیان پر جو تالیفات ہیں، ''غریب القرآن'' کے عنوان سے ''مشکلات القرآن'' کے عنوان سے ''اعجاز القرآن'' کے عنوان سے انھوں نے اس کو بھی مقدمہ میں ذکر کیا ہے، تفصیلی کتب جو قدماء نے لکھی

ہیں ان کے انداز تالیف پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے، اسی طریقہ سے مولانا نے یہ واضح کیا ہے کہ ہر دور میں قرآن کریم مطالعہ کا مستقل ایک موضوع رہا ہے، دینی علمی اور ہر حیثیت سے قرآن پاک کا موضوع زیر بحث رہا ہے، اور مولانا نے واضح کیا ہے کہ قرآن کریم کے خلاف جنگ جاری ہے، بعض ممالک کی جانب سے اس کی تعلیمات کو محرف انداز میں پیش کر کے یہ دکھایا جا رہا ہے کہ قرآن کریم سے نعوذ باللہ، تشدد، خوں ریزی اور تباہی کو فروغ مل رہا ہے، اس صورت حال میں اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ قرآن کی ان تعلیمات کو علمی انداز میں پیش کیا جائے، جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر و اصلاح سے تعلق رکھتی ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ مولانا نے یہ بھی واضح کیا ہے اس مقدمہ میں کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کا انتہائی اہم مسئلہ اور اہم موضوع رہا ہے، اور قرآن نے اپنے نزول یا امتیازات جو بیان کئے ہیں وہ "ھدی للناس" ہے، "شفاء لما فی الصدور" ہے، اور بیان للناس ہے اور مولانا نے مزید اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان اصول وضوابط کو عام کیا جائے اور ان کو منظر عام پر لایا جائے، اور مولانا نے آخر میں لکھا ہے کہ زیر تعارف کتاب برادر معظم کی یہ گراں قدر تالیف ہے، اور یہ تالیف وتصنیف وقت کے پس منظر میں ہے اور حالات کو دیکھتے ہوئے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، یہ بھی مولانا نے واضح کیا ہے کہ ان کو جو قرآنی ذوق ملا وہ ان کے خال معظم مولانا علی میاں ندوی کی تربیت کا ہی فیض ہے، جس کا انھیں وافر حصہ ملا تھا، تیسرے مولانا نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ کتاب کے مصنف گرامی کو ان موضوعات کو زیادہ ہائی لائٹ کرنے یا نمایاں کرنے کے کیا محرک اور وجوہ ہیں، تو اس میں خاص طور سے مولانا نے لکھا ہے کہ پیام انسانیت سے طویل وابستگی، غیر مسلموں سے تبادلۂ خیال کرنے کے نتیجہ میں مولانا نے اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا۔

آخری بات یہ کہنا چاہوں گا کہ اس چھوٹے سے مقدمہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کس طریقہ سے مقدمہ یا دیباچہ لکھا جائے۔ بڑے اچھے انداز میں اس کو پیش کیا جا سکتا ہے، صرف تین چار نکات میں اس کو میں بیان کر رہا ہوں۔

(۱) زیر تعارف کتاب کے موضوع کی اہمیت اور قدر و قیمت کی وضاحت۔

(۲) متعلقہ موضوع پر مختلف زبانوں کی تصانیف و تالیفات کا تعارف۔

(۳) موجودہ حالات کے پیش نظر کتاب کے موضوعات نے کن کن پہلوؤں کی تشریح وترجمانی کی، ان پر اظہار خیال۔

(۴) زیر تعارف کتاب کے مشتملات کے حوالہ سے یہ وضاحت کہ یہ کتاب ضرورت کو پوری کرتی ہے، کتاب کے موضوع یا اس کے ترجیحی مباحث میں مصنف کی دلچسپی کے کیا وجوہ وعوامل تھے، اس کو بھی واضح کیا گیا ہے، کتاب کے خاص خاص موضوعات یا مباحث کی فہرست جیسا کہ اس مقدمہ میں دی گئی ہے، کتاب کے خصوصی مقاصد یا اس کی تالیف کی وجہ اور اس تأثر کا اظہار کہ یہ کتاب کس حد تک مقصد پورا کرے گی، یا کر سکتی ہے۔ انہی کلمات کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کا قرآن کریم سے مضبوط تعلق قائم فرما دے، اور قرآن کا صحیح فہم عطا فرماوے۔

☆☆☆

سنگِ بنیاد-مولانا محمد واضح رشید ندویؒ

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایک جلیل القدر اور صاحبِ مرتبت استاذ کی پہچان یہ ہے کہ مخلص ہو اور اسے حصول علم کا شوق ہو۔ اخلاص کے بغیر دینی اور دنیوی ہر کام بے معنی ہے۔ دین اسلام کی بنیاد اخلاص پر ہے۔ قرآن کریم نے بار بار اخلاص کی قدر و قیمت کا اعلان کیا ہے۔ ''مخلصین لہ الدین'' کا مفہوم یہی ہے۔ سورہ اخلاص میں یہی فلسفہ مذکور ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں سے ایسے اخلاص کی ضرورت ہے جو اس کی وحدانیت کے اعتراف میں کام آئے۔ مولانا محمد واضح رشید ندوی صاحب (۱۹۳۳ء-۲۰۱۹ء) اپنی تدریس میں کامل نمونۂ اخلاص تھے۔ ان کی فکر مندی اور کوشش ہوتی کہ تدریس کے جو اوصاف و اسباق انھیں یاد ہیں وہ سب طلبہ کے ذہنوں میں بٹھا دیں۔ تدریس دراصل اچھی ترسیل اور خوبصورت توضیح کا نام ہے۔ انھیں وہ تمام طریقے معلوم تھے کہ باتیں پہنچائی اور منوائی کیسے جاتی ہیں۔ وہ ایسے الفاظ، تراکیب اور تمثیلات سے اپنی تدریس کو عبارت کرتے کہ طلبہ پوری طرح مولانا کی تدریس سے مطمئن ہو جاتے۔ تدریس دراصل تبلیغ ہے۔ پیغام رسانی کے لیے ضروری ہے کہ تبلیغی مناہج پیش نظر ہوں۔ ایک قابل قدر استاذ کی پہچان یہ ہے کہ اس کے چہرے پر تناؤ اور آواز میں شدت وحدت نہ ہو۔ بوقت تحدیث مولانا کے چہرے بشرے پر مسرتیں لوٹتی پوٹتی ہوئی نظر آتیں۔ آواز میں مٹھاس ہوتی، ان دونوں صفتوں سے قوتِ ترسیل بڑھ جاتی ہے اور تدریس نتیجہ خیز بن جاتی ہے۔ مولانا انشاء اس طرح پڑھاتے کہ طلبہ حسن تحریر کے رموز سے واقف ہو جاتے۔

اگر انسان کے اندر اخلاص ہے تو دیگر محاسن خود اس کے اندر مجتمع ہونے لگتے ہیں۔ اخلاص ضد اشتہار ہے۔ صاحب اخلاص کو معلوم ہے کہ قربانیوں اور کارگزاریوں کا ہرگز ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ شہرت سمیٹی جائے۔ اپنی عظمت و رفعت کا ڈنکا پیٹا جائے۔ اور خود کو اقدار عالیہ کا حامل بتایا جائے۔ مولانا محمد واضح رشدی ندوی صاحب سنگ بنیاد تھے۔ جس پر پُرشکوہ عمارات اور شاندار محلات ٹکے رہتے ہیں۔ تاج محل ایسی ہی اینٹوں پر کھڑا ہے۔ تاج محل کی داستان سرائی ہر زبان میں کی گئی۔ اس کے حسن، چاندنی راتوں میں ساحل جمنا پر لہراتی ہوئی اس کی تصویر، اس پر لکھی ہوئی آیات اور ندرت سنگ تراشی کی تصویر کشی صاحبانِ شعر و ادب نے خوب خوب کی ہے۔ ہمارے طنطاوی صاحب نے بھی بن دیکھے تاج کے محاسن کو اپنی عربی نظم میں قید کر دیا۔ لیکن کیا کسی نے اس کے سنگہائے بنیاد کی بھی قصیدہ خوانی کی ہے؟ جواب نفی میں ہے۔ یقیناً مولانا سنگ بنیاد تھے۔ اس پر نہ جانے کتنے قصور تعمیر ہوئے۔ مولانا کا وظیفہ حیات رہا کہ خاموشی سے نونہالانِ ملت کو سینچا جائے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت کی جائے اور چپ چاپ بذریعہ قلم و قرطاس دین اسلام کی خدمت کی جائے۔ آج آپ کے قلمی نقوش جا بجا صفحات پر ستاروں کی مانند جھلملا رہے ہیں۔

ایمانی قدروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ خوش مزاجی صاحبِ ایمان کا اساسی وصف ہے۔ حدیث رسول ہے کہ ایک صاحب ایمان

جب کسی صاحبِ ایمان سے ملتا ہے تو اس کے چہرے پر بکھاہٹ اور مسکراہٹ ہوتی ہے۔ راقم جب مولانا سے ملتا تھا تو لگتا جیسے مانند گلاب کھل گئے ہوں۔ اور اس کی خوشبو مجلس کو معطر کر رہی ہو۔ مولانا مجھ سے مستقل فرماتے کہ تم جب لکھنؤ آو تو یہاں ہی ٹھہرا کرو۔ میری اکثر کوشش ہوتی کہ ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ ہی میں قیام کروں۔ کبھی قیام ہفتہ دس دن ہوجاتا۔ مولانا اکثر اساتذہ کرام اور طلبہ سے معلوم کرواتے کہ سفیان کو کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟ ناشتہ اور عشائیہ انھیں وقت پر ملتا تو ہے؟ کبھی کبھی ذمہ دارانِ کچن کو بھیجتے کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا سفیان کو کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟ ظہرانے پر مولانا سے خود ملاقات ہوتی۔ آپ کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کا شرف حاصل ہوتا۔ یہ مواقع شرف بار بار حصے میں آئے۔ مولانا خود اپنے ٹفن کے ساتھ دسترخوان پر نمودار ہوتے۔ مولانا کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ ندوۃ العلماء کا کوئی دانہ جسم فانی کا حصہ نہ بننے پائے اور ادارے کا کوئی حبہ جیب میں سرایت نہ کرنے پائے۔ یہی زندگی بھر ندوے کے ساتھ آپ کا برتاؤ رہا۔ دسترخوان پر بچنے کی تدبیر کرتے کہ کوئی لقمہ منھ میں نہ جانے پائے۔ لیکن کامن دسترخوان پر ایسا کیوں کر ممکن ہوتا۔ اگر کوئی لقمہ اندر مجبوراً چلا جاتا تو اپنے ٹفن کے کئی لقمے مہمانوں کو لینے پر مجبور کردیتے۔ مہمانوں کی پلیٹ میں اپنے ہاتھ سے بوٹیاں ڈالتے۔ دسترخوان پر موجودہ لذیذ ڈشز سے مہمانوں کی پلیٹ کو بھر دینے کے لیے کوشاں رہتے۔ مولانا آدابِ ضیافت سے خوب واقف تھے۔ مہمانوں کا دل جیتنا جانتے تھے۔ جب دو تین روز ندوہ میں قیام ہوتا تو صبح نو بجے چائے کے لیے اپنے کمرے میں بلاتے۔ خاص قسم کی چائے ہوتی اور جب مولانا کے دسترخوان سے ہوکر یہ گزرتی تو اس کی لذت دوبالا ہوجاتی۔ مولانا آزاد اگر اسے ایک بار پی لیتے تو ''غبارِ خاطر'' کے صفحات میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوجاتے اور یہ چائے غبار خاطر کی ادبیت وانشائیت میں مزید رنگ بھر دیتی۔ مولانا کی چائے وائے کے ساتھ ہوتی۔ مولانا ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن بوقت ضیافت مثالی انکساری ہوتی۔ دھیرے دھیرے مجلس علمی رخ اختیار کرلیتی۔ مہمان سے اس کی علمی سرگرمیوں کے متعلق پوچھتے۔ اس کی تحریروں کو سراہتے۔ پہلے اس کی تصنیفی قدر و قیمت پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ اپنی تصانیف کو پیش کرتے۔ ان تصانیف کا زیادہ تر تعلق ندوہ کے نصاب میں شامل شدہ کتابوں سے ہے۔ مولانا کی تصانیف اور مقالات کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟ اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ آپ کی تحریر میں خاص قسم کا رچاؤ ہوتا۔ ایسی رعنائی اور کشش کہ قاری اس میں کھو جاتا۔ ندوۃ العلماء کی عربی نگارشات کے حاملین کی ایک بڑی تعداد ہے لیکن نگارشِ رشید کو جو امتیاز حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ یہ امتیاز رشید پورے عربی نگارانِ ہند کے سامنے کھڑا ہے۔ اور بیک زبان اس امتیازِ رشید کا معترف ہے۔ عربی کے معروف ادیب اور صاحب زبان استاد محترم پروفیسر محمد راشد ندوی نے مولانا کے طرزِ تحریر کی ثناخوانی کی ہے۔ مولانا کی تدریس میں بڑا حسن، تحریر میں جاذبیت، گفتگو میں عجیب مقناطیسیت اور صحبتِ رشید میں کیا لطف ولذت تھی۔ لیکن آج یہ گنجہائے گرانمایہ تہہ خاک ہوئے۔

یہ بات اوپر آچکی ہے کہ مولانا اشتہاری دنیا سے بہت دور تھے۔ عالم متقشف تھے، گہر کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ تہہ میں ہوتا ہے، خود کو صدف میں بند کرلیتا ہے۔ اسے اظہار واشتہار سے کوئی غرض نہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ ظلمتِ بحر (فی بحر لجی) کو اس نے اپنا مسکن قرار دیا۔ لیکن یہ لالچی انسان صدف سے موتی کو کسی نہ کسی طرح نکال کر باہر لاتا ہے۔ مولانا حقیقتاً مشتاق یوسفی کی زبان میں ''آبِ گم'' تھے۔ ہمیشہ اپنے بڑے بھائی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے خود کو دو قدم پیچھے رکھتے۔ ایسا احترام اور برادر بزرگ کا ایسا اکرام کم دیکھا۔ ہر جگہ انھیں کو آگے بڑھاتے۔ انھیں اسٹیج پر جلوہ افروز کرکے خود سامعین میں کہیں دبک جاتے۔ ایسا ایثار اور ایسی بے نفسی عہد حاضر میں مفقود ہے۔ اس قحط الرجال میں ایسے لوگوں کا چلا جانا کس قدر باعث رنج ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں ان سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ خوب باتیں ہوئیں۔ رک رک باتیں کرتے۔ مسکراتے اور مخاطب کو معطر

کردیتے۔

بہت سالوں پہلے کی بات ہے۔بھٹکل میں رابطہ عالم اسلامی کا سمینار تھا۔آپ کی صدارت میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کی ''مختارات'' پر ایک مقالہ پیش کیا۔اس کتاب کی ترتیب پر گفتگو کرتے ہوئے اس مسئلے کو اٹھایا کہ اسلامی ادب کا یہ ہرگز مفہوم نہیں کہ اس کا تخلیق کار مسلمان ہو۔اس میں کسی عیسائی ادیب کی تحریر کو شاید اسی بنیاد پر شامل نہ کیا گیا۔جب کہ بہت سے ایسے عیسائی ادیب ہیں جنھوں نے صالح ادب کو تخلیق کیا ہے۔خلیل جبران کی بہت سی ایسی تخلیقات ہیں جو تعمیری ادب کے زمرے میں آتی ہیں۔مختارات کے اور بہت سے گوشوں کو اس تحریر میں موضوع بحث بنایا گیا تھا۔مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں راقم کے تجزیاتی انداز کو بہت پسند کیا۔اختتام جلسہ کے بعد جب ہم چلنے لگے تو مولانا نے فرمایا ارے بھائی سفیان! تم نے تو اپنے اس تجزیہ میں بہت سے ایسے زاویوں کو پیش کیا جنھیں میری چشم شعور نے دیکھا بھی۔مولانا نے اس دیانت دارانہ نقد کو پسند کیا۔انھیں کسی طرح کی ناخوشگواری کا احساس نہ ہوا۔یہی ایک علم دوست کی پہچان ہے۔وہ حقائق کا بہرحال معترف ہوتا ہے۔صاحب علم خود پر ہونے والے نقدِ صادق کو پسند کرتا ہے لیکن عالمِ بے ظرف ابال کھاتا ہے۔مولانا محمد واضح رشید صاحب علوم ومعارف سے لدے ہوئے تھے۔انھیں ابال کھانا آتا ہی نہ تھا۔دریا چیختا، چلاتا اور اچھلتا کودتا ہے لیکن سمندر خاموش رہتا ہے۔مولانا کی ذات گرامی مثل بحر تھی۔شور وشغف اور اپنے آپ کو منظر عام پر لانا انھیں آتا ہی نہ تھا۔کسر نفسی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔مولانا کی ہر ساعت زندگی یہی پیغام دیتی ہے۔

کیف پیدا کر سمندر کی طرح
وسعتیں، گہرائیاں ، خاموشیاں

مولانا تقریر سے گریز کرتے ، ایسا نہیں کہ قوت خطابت سے عاری تھے۔ہاں آپ شعلہ بیان مقرر تو نہیں تھے، ہاں سنبھل سنبھل کر اپنی بات کہتے۔اس میں تاثیر اور مواد دونوں ہوتے۔سامعین مولانا کی باتیں غور سے سنتے ،صفحات قلوب پر ٹانکتے ،آپ کی متعدد صدارتی تقاریر سے بھی محظوظ ہوا ہوں۔مقالات کو آپ بغور سنتے ، ان کے محاسن ومعائب کو اجاگر کرتے ، صدور حاضر باتیں کرتے ہیں ، مقالات کو سنتے نہیں۔صدارتی کلمات کے نام پر اپنی علمی انانیت لے کر ضرور کھڑے ہوجاتے ہیں۔اگر پروفیسر ہے تو اپنے چھوٹوں پر خوب دست درازی کرتا ہے، اگر منصب میں بڑا ہے تو فوائد منصب کو سمیٹنے کے لیے طویل ترقصائد لے کر کھڑا ہوجاتا ہے۔اگر مجلس میں شیخ الجامعہ ہیں تو انھیں امام حکمت اور قائد فہم وفراست بتاتے ہوئے اس کی زبان تھکتی نہیں۔ایسے ناعاقبت اندیش صدور کو کیا معلوم کہ زبان، کلمات اور جذبات امانت ہیں۔انھیں کار عبث کے لیے استعمال کروگے تو مندرجہ نتیجۂ اخروی کے لیے تیار رہو۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (یٰس:۳۶/۶۵)

آج کے دن ہم ان کے منھ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں گواہیاں دیں گے۔ان کاموں کا جو وہ کرتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی پر ندوۃ العلماء میں ایک سمینار کا انعقاد ہوا۔علامہ شبلی نعمانی کتب خانہ میں اجلاس ہورہے تھے خاکسار نے بھی ایک مقالہ پیش کیا۔جس میں مولانا ندوی سے اختلافات بھی کیے گئے تھے۔یہ چیز مرحوم پروفیسر اجتباء ندوی صاحب اور مکرم پروفیسر ضیاء الحسن ندوی صاحب کو بہت گراں گزری۔ایک پروفیسر اور تھے مگر ان کا نام لینا مناسب نہیں۔تینوں صاحبان پروفیسرز نے بندۂ عاجز کو گھیر لیا۔طفل مکتب کو ڈانٹ ڈپٹ بھی پلائی۔مودب بنا کھڑا رہا۔ہمت جٹا کر گویا ہوا کہ یہ سمینار ہے جلسہ نہیں جب مولانا محمد واضح رشید ندوی صاحب کو معلوم ہوا تو میرے پاس آئے اور فرمانے لگے ''آپ ہمارے مہمان ہیں جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا اس پر ہم پشیمان ہیں۔ہر مقالہ نگار کو اپنی بات کہنے کا حق ہے''۔ایسی صداقت اور ایسا اعتراف عنقا ہوتا جارہا ہے۔عالم دین کا فریضہ ہے کہ صداقت کو اپنا معیار و

شعار بنائے۔ یہی شعار دین اسے مشکلات سے لڑنا سکھاتا ہے۔ آج شعار اسلامی امت سے رخصت ہو چکا ہے جس کی وجہ سے امت نیز علماء دلدل میں دھنستے جارہے ہیں۔ مولانا محمد واضح رشید صاحب کی طبیعت شعار پسند تھی۔

اسلامی شعار پرستی سے مولانا کی شخصیت جڑی ہوئی تھی۔ زندگی کے ابتدائی بیس سال دلی کے ریڈیو اسٹیشن سے جڑے رہے۔ ایک اچھے اناؤنسر اور ترجمہ نگار کی حیثیت سے نام کمایا، لیکن والد محترم کا کہنا تھا کہ تم ایک خادم دین بن کر آخرت کے لیے نام کماؤ اور وہاں کے لیے کچھ جمع کرو۔ ''قدموا لأنفسكم'' (تم سب اپنے نفوس آئندہ کے لیے پونجی جمع کرو) والد محترم کے اس فرمان کی تعمیل کے لیے نہ انھیں اپنی لمبی تنخواہ کی پرواہ رہی۔ نہ اپنے کیریر کی فکر اور نہ ہی دارالسلطنت کی زرق برق زندگی والد محترم کے حکم میں آڑے آئی۔ دلی چھوڑا اور اپنے جدامجد مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کی راہ پر چل پڑے جو انسانوں کو راہ علم وتحقیق کی طرف لے جاتی ہے۔ اپنے بڑے ماموں ڈاکٹر عبدالعلیؒ کے نہج حیات پر رواں دواں ہوگئے جو ندوہ کی تعمیر وترقی کی طرف لے جاتی ہے اور مغرب ومشرق کی نامور شخصیت، معروف صاحب قلم، ادیب، سیرت نگار، مؤسسِ پیامِ انسانیت اور تذکرہ نویس مولانا ابوالحسن علی ندوی کے طرزِ حیات کو اپنانے کے لیے عازم سفر ہوئے جن کی پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزری اور اپنے بڑے بھائی مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی قربت کے حصول کے لیے پابہ رکاب ہوئے۔ دنیائے دنی ان کے پیروں سے لپٹنا چاہتی تھی پیروں کی زنجیر بننا چاہتی تھی۔ لیکن والد محترم کی خواہش کے سامنے انھیں خواہشاتِ زندگی کو قربان کرنا خوب آتا تھا کیوں کہ ان کے سامنے سے قرآن کریم کا یہ فرمان ضرور گزرا ہوگا۔

''أن اشكرلي ولوالديك''

میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو۔

اس آیت کریمہ میں شکر ربانی کے فوراً بعد شکر والدین کا ذکر کیا گیا ہے جس سے والدین کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ اس تشکر میں یہ بات مضمر ہے کہ والدین کے احکام کی تابع داری اولاد پر فرض ہے۔ مولانا محمد واضح رشید ندوی کے ذہن میں یہی حکم ربانی تھا جس نے انھیں والدین کے ہر حکم کے لیے تڑپایا۔ ایسے صالح صاحب خشیت اور درویش صفت باپ کے جانے پر بیٹے جناب جعفر مسعود حسنی ندوی زاروقطار روتے رہے۔ یقیناً مولانا کے جانے سے ملت، ندوۃ العلماء اور دنیائے علم وادب کا ایک بڑا نقصان ہوا۔

ندوۃ العلماء کا ایک کلچر مجھے بہت پسند ہے کہ طلبہ اساتذہ کرام کے کمروں میں باادب کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے حکم کی بجاآوری کے لیے ایک پیر ایستادہ۔ ان کے لیے چائے کا انتظام کرنا، کھانا بنانا اور ان کے کمروں کی صفائی ان کے اشغالِ حیات کا حصہ ہے۔ یہی کام مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اپنے استاذ گرامی مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے لیے کرتے تھے۔ ان کی چائے بناتے، سردیوں میں ان کے لیے پانی گرم کرتے، انگیٹھی دہکاتے اور استاذ محترم کے ساتھ نماز تہجد ادا کرتے۔ جب مولانا فراہی اپنے گھر چلے جاتے تو خاموشی سے نقوش پا کی اتباع کرتے ہوئے خدمت کے لیے وہاں بھی پہنچ جاتے۔ بہر کیف مجھے تو یہ کہنا ہے کہ طلبہ مولانا محمد واضح رشید صاحب کے کمرے میں بھی ایستادہ رہتے اور مولانا کی جنبشِ لب پر حرکت میں آجاتے۔ مولانا کے یہی طلبہ جواب مادر علمی میں مسند تدریس پر فائز ہیں۔ لیکن ان کی استاذیت استاذ محترم کی خدمت کے لیے کبھی آڑے نہیں آئی۔ مولانا ان کے ساتھ چائے نوش کرتے، مسکراتے ہوئے باتیں کرتے۔ انھیں علمی مشورے دیتے اور ان کے علمی مشورے قبول کرتے۔ یہی ایک خوبصورت اور مخلص اور فکرمند استاذ کی پہچان ہے۔ ایک استاد اپنے تلامذہ کے لیے پتوار ہوتا ہے۔ مولانا اپنے تلامذہ کے لیے ناخدا تھے۔ کاش یہی ناخدائی عصر حاضر کے اساتذہ کرام کو مل جاتی۔

مولانا محمد واضح رشید ندوی کی زندگی کا ایک تابناک پہلو یہ تھا کہ ملت کے انحطاط پر رہ رہ کر ان کے دل میں درد اٹھتا تھا اور عالمی سطح پر ان کے خلاف مغرب کی چیرہ دستیاں اور سازشیں ان کے لیے باعث

اذیت تھیں، سیلابِ مغرب ان کے لیے ایک اضطراب تھا آپ کی اس ذہنی اذیت اور فکری درد کی علامت آپ کی تصنیف ''الغزوالفکری'' ہے اس میں استشراق کی فتنہ سامانیوں، یہودیت کے ناپاک عزائم اور عیسائیت کی دسیسہ کاریوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ملت اسلامیہ کو چہار جانب سے گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مولانا نے مغرب کی علمی اور مادی دونوں جعل سازیوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ یہ کتاب مغرب کی کریہہ صورت کو جاننے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کتاب میں بیک وقت بے شمار موضوعات اٹھائے گئے ہیں لیکن ان پر تفصیلی بحث نہیں ہوسکی ہے جس کی وجہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کتاب عربی مآخذ پر مشتمل ہے۔ اگر انگریزی مصادر سے استفادہ کیا جاتا تو اس کی افادیت اور علمیت بڑھ جاتی۔ پڑھتے ہوئے شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اہل مغرب کے اسماء اور ان کی تصانیف کے عناوین انگریزی میں بھی دیئے جاتے تاکہ قارئین براہ راست ان سے استفادہ کرنا چاہیں تو کرسکیں۔ عربی میں نام ہونے کی وجہ سے براہ راست استفادہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ مولانا کی یہ علمی خدمت توضیحی اشاریہ کے مثل ہے لیکن اس سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ ملت اسلامیہ شدید بحران سے دوچار ہے۔ عربوں کے مابین اپنے اپنے بقا اور تحفظ کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ انھیں ملی وقار اور اسلامی تشخص کے تحفظ کی فکر نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جس علاقائیت اور وطنیت پر تیشہ زنی کی تھی آج عربوں میں وہی چیز پھر پنپ رہی ہے۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں صموئیل زویمر (Zweimer) کی اسلام مخالف سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے:

''صموئيل زويمر رئيس إرسالية التبشير العربية فى البحرين ورئيس جمعيات التنصير فى الشرق الأوسط، كان يتولى إدارة مجلة ''العالم الإسلامى'' الإنجليزية التى أنشأها سنة ۱۹۱۱م والتى ما تزال تصدر إلى الآن من هاتيفورد، دخل البحرين عام ۱۸۹۰م، ومنذ عام ۱۸۹۴م قدمت له الكنيسة الإصلاحية الأمريكية دعمها الكامل، وأبرز مظاهر عمل البعثة التى أسسها زويمر كان فى حقل التطبيب فى منطقة الخليج، وتبعاً لذلك فقد افتتحت مستوصفات لها فى البحرين، والكويت، ومسقط، وعمان، وبعد زويمر من أكبر أعمدة التنصير فى العصر الحديث۔

كنث كراج (K. Cragg) خلف صموئيل زويمر على رئاسة مجلة ''العالم الاسلامى'' وقام بالتدريس فى الجامعة الأمريكية بالقاهرة لفترة من الوقت وهو رئيس قسم اللاهوات المسيحى فى هارتيفورد بأمريكا، وهو معهد للمبشرين، ومن كتبه ''دعوة المئذنة'' صدر عام ۱۹۵۶م''۔ (الغزوالفكرى، الاستاذ محمد واضح رشيد الندوى، ص:۱۰۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہی کہ اپنی صحافتی اور طبی خدمات کے توسط سے کتنی سرعت سے اس نے بحرین کویت، مسقط اور عمان کو اپنی گرفت میں لے لیا یہ بات اب پچاس برس پہلے کی ہے۔ آج پورا عرب یہودیت اور عیسائیت کے دائرہ کار میں ہے۔ اسی اثرات کی وجہ سے فلسطین یتیم و مسکین بنا ہوا ہے۔ عربوں کے ہاتھ پیر کو یہی یہودیت اور عیسائیت چلاتی ہیں۔ ملت اسلامیہ سے ان عربوں کی لیے دعا کی درخواست ہے۔ اللہ ان کی اسلامی اور ملی شعور کو بیدار کردے۔ مولانا محمد واضح رشید ندوی نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ عربوں کو بیدار کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ یہ کتاب ان کی داخلیت کا پتا دیتی ہے۔ کہ انھیں اسلام اور اہل اسلام سے کتنا جذباتی تعلق تھا۔ یہ راہ مولانا کو مولانا ندوی نے دکھائی تھی۔ اپنے مختلف رسائل میں عربوں کے حالات پر اظہار افسوس کیا ہے۔ بالخصوص سلاطین عرب کو کھری کھری سنائی ہے۔ ان کی بے حسی، مغرب زدگی اور دین اسلام سے لاتعلقی پر دوٹوک انداز

میں اظہار تاسف کیا۔ مولانا محمد واضح رشید ندوی کا ملی درد یوں بھی اٹھتا کہ جب جب آپ سے احقر کی ملاقات رہی ہمیشہ آپ نے ادارہ سرسید کے لیے دعائیں کیں کہ اللہ اسے نظر بد سے بچائے اور مخالفین ادارہ سرسید کی ناپاک سازشوں کو ناکام بنائے۔ یہ سچ ہے کہ مولانا علی میاں ندوی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا محمد واضح رشید ندوی وہ سلاسل الذہب ہیں جنھوں نے ہندی مسلمانوں کی تعمیر وترقی میں اہم رول ادا کیا۔ خاندان حسنی کی علمی اور دعوتی خدمات حروف زر سے رقم کی جانے کے لائق ہیں۔ یقیناً ۱۶؍جنوری ۲۰۱۹ء کی صبح میرے لیے انتہائی ناخوشگوار تھی جب اپنے ایک شاگرد کی زبانی یہ جاں گسل خبر سنی تو پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اپنے عزیز دوست صدر شعبہ عربی پروفیسر محمد سمیع اختر کو فون پر اس حادثہ فاجعہ کی خبر دی کہ آج ہی شعبہ میں تعزیتی نشست کا انعقاد کیا جائے۔ چنانچہ پروفیسر محمد راشد ندوی، پروفیسر احتشام احمد ندوی، پروفیسر عبدالباری، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی اور خاکسار نے مولانا کی تدریسی، صحافتی اور تصنیفی خدمات پر روشنی ڈالی۔ بالخصوص آپ کی عربی نگارشات کی خصوصیات کا بار بار ذکر آیا۔ ''الرائد'' میں مستقلاً چھپنے کی وجہ سے ہندوستان اور دنیائے عرب کا ادبی حلقہ آپ کا شیدائی بن گیا تھا۔ ندوۃ العلماء کی صحافتی تحریک میں آپ نے نفخ روح کا کام کیا اور ایک ایسی ٹیم چھوڑ کر گئے جو عربی میں سوچتی اور عربی ہی میں اپنے خیالات کو قلم بند کرتی ہے۔ ہندوستان میں جدید عربی کی ترویج کرنے والے علامہ شبلی نعمانی ہیں اسی طرح مکاتیب شبلی کے صفحات گواہ ہیں کہ ندوۃ العلماء کو جدید عربی زبان کی مزار پر چڑھانے والے یہی نعمانی ہیں اور رشید رضا مصری کو عربی تقریر سے ششدر کردینے والے علامہ کے شاگرد مولانا سید سلمان ندوی ہیں۔ شبلی کے شجرہ طیبہ کی ایک شاخ مولانا محمد واضح رشید ندوی بھی ہیں جنھوں نے عربی زبان وادب کو نہ صرف سنوارا بلکہ کتنے سنوارنے والوں کو کھڑا بھی کردیا۔ استاذ کا اکتساب حقیقی یہ ہے کہ وہ مصنف اور مصنف گر ہو، مولانا ایسے ہی استاذ تھے، انھیں امت کو بنانے کی فکر رہی۔ آپ کا ہدف، آپ کا فکری مطاف اور ذہنی ارتکاز ندوۃ العلماء اور طلبہ ندوۃ العلماء رہے۔ معمارانِ ندوہ میں آپ کو اختصاص حاصل ہے۔ بڑی سادگی سے بلکہ زینت الحیاۃ الدنیا سے بے پرواہ ہوکر پیام انسانیت لے کر بڑھتے رہے۔ سادگی اور خشیت مولانا کی زندگی کا جزء لاینفک تھی۔ انھیں دیکھ کر سادگیٔ سلف کا تصور نظروں میں گھوم جاتا۔

ایک بار کیرالہ رابطہ عالم اسلامی کے سمینار میں شرکت کے لیے جارہا تھا، مولانا ہی کی بوگی میں میں بھی سوار تھا۔ اچانک مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی مجھ حقیر پر نظر پڑی تو مولانا میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے: ابوسفیان کھانا وغیرہ مت خریدنا، ہمارے ساتھ ہی کھانا، اس کے بعد مولانا محمد واضح رشید ندوی چلے آرہے ہیں۔ آپ کا بھی یہی اصرار کہ ہمارے ساتھ ہی زحمتِ تناول اٹھانا، میں نے دل میں کہا کہ یہ تو رحمتِ تناول ہے۔ تقریباً دوروز مولانا کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ ہوتا رہا۔ عجیب سی سادگی، دلجوئی کا ہر سامان مولانا کی دسترس میں، مولانا مسکراتے ہوئے کبھی روٹی تھمارہے ہیں، کبھی رکابی میں بوٹیاں انڈیلنے کے لیے بے تاب، اختتام میں شیرینی کی باری آئی تو اسے بڑھانے کے لیے فکرمند، ایک شخصِ مجہول کے ساتھ پذیرائی کا یہ حال؟ جی ایک عظیم شخص کا یہی تشخص ہوتا ہے۔ سیادت اپنے ہر بول سے بندوں کا دل جیتنا چاہتی ہے۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ کرام عباداللہ کے دلوں میں بسنے کے ڈھنگ سے خوب واقف ہیں۔ یہ مہارت تامہ انھیں وراثت میں مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ملی ہے۔ اس وارثتِ ندوی کے ایک ''سنگِ میل'' ہمارے مولانا محمد واضح رشید ندوی بھی تھے پر افسوس کہ یہ وراثتِ ندوی سپرد خاک ہوئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ انھیں فردوس بریں نصیب ہو، اور ندوۃ العلماء کو آپ کا نعم البدل عطا ہو۔

☆☆☆

مولانا واضح رشید ندویؒ بہ حیثیت مربی

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

اسلامی تاریخ میں بہت سی شخصیات ایسی گزری ہیں جنھوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ اپنی تحقیقات سے علمی سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور ان کے علم و فضل کا زمانہ معترف ہے۔ لیکن ایسی شخصیات معدودے چند ہی گزری ہیں جنھوں نے ذاتی طور پر علمی و دینی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ تصنیف وتالیف اور تحقیق وترجمہ کرنے والوں کی ایک ٹیم بھی تیار کردی ہو، ان کی بھرپور تربیت کی ہو اور ان کی صلاحیتوں کو صیقل کر کے انھیں مجلّی ومصفّی بنا دیا ہو۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے 'تصنیفِ کتب' کے ساتھ 'تصنیفِ رجال' کی بھی خدمت انجام دی ہو۔ ماضی قریب میں اس کی نمایاں مثال علامہ شبلی نعمانیؒ کی ذاتِ گرامی ہے۔ انہوں نے ایک طرف خود سیرت وسوانح، تاریخ، علم کلام، ادب و شاعری اور دیگر موضوعات پر انتہائی وقیع کتابیں تصنیف کی ہیں تو دوسری طرف ایسے شاگرد تیار کیے ہیں جنھوں نے علمی میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ 'مکاتیبِ شبلی' میں محفوظ خطوط گواہ ہیں کہ علامہ شبلیؒ نے کس طرح اپنے شاگردوں کو قلم پکڑ کر لکھنا سکھایا، ان کی تحریروں کی اصلاح کی اور نوک پلک درست کی، انھیں معیاری تحریر وتصنیف کے لیے قیمتی مشورے دیے اور قدم قدم پر ان کی رہ نمائی کی۔

میرے استاذ گرامی مولانا واضح رشید ندویؒ کا شمار بھی اسی دوسری قسم کی شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک معتبر مصنف، مشہور ادیب اور نام ور صحافی تھے۔ انہوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے، لیکن انہیں شہرت اپنی عربی تحریروں کی وجہ سے ملی۔ ان کی تصانیف سیر وسوانح، تاریخ، تعلیم، فکر وثقافت اور خاص طور پر عربی ادب اور اس کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہیں۔ صحافت کے میدان میں ان کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ پندرہ روزہ عربی جریدہ 'الرائد' کی ادارت کے ساتھ وہ ماہ نامہ 'البعث الاسلامی' میں 'صور و أوضاع' کالم کے تحت حالاتِ حاضرہ پر مستقل مضامین تحریر کیا کرتے تھے۔ ان کی تصانیف اور تحریروں کا علمی جائزہ لیا جارہا ہے، آئندہ بھی لیا جاتا رہے گا اور ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے گی۔ اس وقت میں ان کی خدمات کے ایک دوسرے پہلو پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے ان کی مربیانہ حیثیت، ان کا اندازِ تربیت، اپنے شاگردوں سے ان کا خصوصی ربط و تعلق اور تحریر وتصنیف اور ترجمہ نگاری میں ان کی رہ نمائی۔ یہ وہ پہلو ہے جس میں وہ ندوہ کے اساتذہ میں بہت نمایاں تھے، بلکہ اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس معاملے میں ان کی ذات منفرد تھی، کوئی دوسرا ان کا مثیل نہ تھا۔

انشاء کی مشق اور تربیت :

راقم سطور کا ندوہ میں داخلہ پچاسی سالہ جشنِ تعلیمی (۱۹۷۵ء) کے بعد ہوا، اگرچہ اس وقت کے مہتمم مولانا محبّ اللہ لاری ندویؒ کی خصوصی اجازت سے چند ماہ قبل ہی رواقِ سلیمانی میں رہائش اور درجہ سوم عربی (موجودہ ثانویہ رابعہ) میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ چند برس مولانا واضح صاحب کو دور سے دیکھتے رہنے کا موقع ملا۔ ان سے

پہلا سابقہ انشاء کی کلاس میں ہوا۔ مولانا ہم طلبہ کے ساتھ بہت زیادہ شفقت کا مظاہرہ کرتے تھے ۔اگرچہ مولانا عبدالماجد ندویؒ کی کتاب 'معلم الانشاء' داخلِ نصاب تھی، لیکن وہ اس کی زیادہ پابندی نہیں کرتے تھے۔ کبھی وہ الگ سے اردو کی کوئی عبارت یا کسی اردو اخبار کی کٹنگ لاتے اور ہم سے اس کا عربی میں ترجمہ کرواتے ، پھر ہماری کاپیاں چیک کرتے ،غلطیوں کی اصلاح کرتے اور بتاتے کہ ہم نے کیا غلطی کی ہے؟ اور اسے کیسے درست کیا گیا ہے؟ وہ ہمیں یہ بھی بتاتے کہ ایک ہی عبارت کا کس طرح کئی انداز سے ترجمہ کیا جاسکتا ہے ۔مولانا کا اندازِ تدریس بڑا نرالا تھا۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے کہ عبارت کا اپنی طرف سے درست ترجمہ کردیں اور طلبہ سے کہہ دیں کہ اسے دیکھ کر وہ اپنے ترجمے کی اصلاح کرلیں، بلکہ ہر طالب علم کی کاپی چیک کرتے تھے اور مناسب اصلاح کر کے اس کے ترجمے کو درست کرتے تھے۔ ہمارا ترجمہ غلط ہوتو وہ اسے پورے طور پر قلم زد نہیں کردیتے تھے، بلکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ترجمہ کے زیادہ سے زیادہ الفاظ کو باقی رکھیں اور محض نحوی، صرفی اور تعبیری غلطیوں کی اصلاح کریں۔ یہ انداز ہم طلبہ میں اعتماد پیدا کرتا تھا۔

الرائد میں ترجمہ نگاری:

میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے کلاس کے باہر بھی مولانا سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ وہ پندرہ روزہ عربی جریدہ 'الرائد' کے ایڈیٹر تھے۔ اس جریدے میں دینی وعلمی مضامین کے علاوہ عالم اسلام اور ملک کی اہم خبریں شائع ہوتی تھیں۔ مولانا اپنے قریبی شاگردوں کو اردو یا انگریزی اخبارات میں اہم خبروں کو نشان زد کر کے دیتے اور ان سے عربی ترجمہ کرواتے۔ برادرانِ گرامی: حشمت اللہ، جو آج کل قطر میں ہیں اور محمد اکرم، جو آکسفورڈ میں رہ کر اہم علمی خدمات کی انجام دہی کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتے ہیں، اس معاملے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ہمارے دیگر ساتھی بھی حسبِ توفیق اس کام میں حصہ لیتے تھے۔ میں اپنی عزلت پسندی کے باوجود اپنے قریبی ساتھیوں کو دیکھ کر مولانا سے قریب ہوا اور یہ ان کی عظمت، شفقت اور شاگردنوازی تھی کہ انہوں نے مجھے بھی محروم نہیں رکھا۔ ہم جیسا ترجمہ کرتے، مولانا اس کی اصلاح کرتے، اسے خوب سے خوب تر بناتے اور الرائد میں شائع کردیتے۔ اس طرح مولانا سے ترجمہ نگاری کے اسرار ورموز سیکھنے کا ہمیں خوب موقع ملا۔

میرا پہلا ترجمہ الرائد میں یکم نومبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ۔غالباً یہ عالمیت کے تیسرے سال کا ابتدائی زمانہ تھا۔ بعد میں میرے کئی ترجمے شائع ہوئے ۔اس موقع پر دو ترجموں کا خصوصی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے مجھے ایک مضمون ترجمہ کے لیے دیا، جس میں سویت یونین میں مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم اور مسلمانوں کی استقامت کا تذکرہ تھا۔ میرے ترجمہ کا عنوان مولانا نے قرآن مجید کی اس آیت کو بنایا: **يُرِيدُونَ لِيُطفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفوَاهِهِم وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ** اور قوسین میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی: **أحوال المسلمين في الاتحاد السوفياتي** (۱۶؍جون ۱۹۸۰ء)۔ دوسرا مضمون پاکستان کے مشہور صحافی اور ایڈیٹر روزنامہ جسارت کراچی جناب محمد صلاح الدین کا تھا۔ یہ اصلاً لندن میں منعقدہ حج کانفرنس کی روداد تھی۔ انقلابِ ایران کو برپا ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ لندن کی اس کانفرنس پر ایرانی اثرات غالب تھے، جس کی شکایت صلاح الدین مرحوم نے اپنی روداد میں کی تھی۔ مولانا نے مجھ سے اس کا ترجمہ کروایا اور اسے **مؤتمر الحج فی لندن و تدخّل الایرانیین** (نومبر ۱۹۸۲ء) کے عنوان سے شائع کیا۔ ان دو مضامین سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کا انتخاب بہت عمدہ ہوتا تھا اور وہ ترجمہ کی مشق کرانے کے ساتھ ہم طلبہ کی فکری تربیت بھی کرتے تھے۔

خبروں کے علاوہ مولانا الرائد میں ہم طلبہ کے ذریعے کیے گئے دینی مضامین کے تراجم بھی شائع کرتے تھے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کی ایک مختصر تحریر 'لمحۂ فکریہ' کے عنوان سے تھی۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا تو مولانا نے اسے '**ساعة عمل و تأمّل**' کے عنوان سے شائع کیا۔ (یکم نومبر ۱۹۷۹ء) اسی طرح میں نے استاذ گرامی مولانا شمس الحق ندوی کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا تو اس پر مولانا نے '**مـــا**

یمیّز الانسان عن الحیوان فی الحیاۃ' کا عنوان لگایا اور اسے الرائد میں جگہ دی۔

عالمیت سال سوم کے ایک طالب علم کے مبلغِ علم، اس کی عربی دانی اور صلاحیتِ ترجمہ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مولانا ہی کا کمال اور ان کا اندازِ تربیت تھا کہ وہ ہمارے غلط سلط ترجمے کو ٹھیک ٹھاک کر کے اور اسے معیاری بنا کر الرائد کی زینت بناتے تھے اور ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیتے تھے کہ ہمیں ترجمہ کرنا اور عربی لکھنا آ گیا ہے۔

مولانا نے ہماری تربیت اردو سے عربی ترجمہ نگاری کے میدان میں کی۔ ترجمہ نگاری کا شوق پیدا ہوا تو ہم نے دورانِ طالب علمی عربی سے اردو ترجمہ کی بھی مشق کی۔ خود مولانا واضح صاحب کے ایک مضمون کا، جو غالباً البعث الاسلامی میں 'صور و أوضاع' کالم میں شائع ہوا تھا، اردو میں ترجمہ کیا، جو 'عالمی صحافت کا معاندانہ موقف' کے عنوان سے ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ (۱۳/دسمبر ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا۔ ترجمہ کا شوق اور بڑھا تو بات بعض کتابوں کے ترجمہ تک پہنچی۔ ندوہ میں طالب علمی کے دوران مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'اسلام کی دعوت' کا تنہا اور فراغت کے بعد جناب محمد صلاح الدین (کراچی) کی کتاب 'بنیادی حقوق' کا برادرِ محترم محمد اکرم ندوی کے ساتھ مل کر ترجمہ کیا۔ (افسوس کہ بعض اسباب سے ان دونوں تراجم کی اشاعت نہ ہو سکی۔) بعد میں علی گڑھ میں طالب علمی کے دوران میں مولانا سید جلال الدین عمری اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کے بعض مضامین کا عربی میں ترجمہ کیا، جو استاد محترم مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی کی عنایت اور نظرِ کرم سے البعث الاسلامی میں ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء کے شماروں میں شائع ہوئے۔ علی گڑھ میں طبیہ کالج میں طالب علمی اور وقت گزرنے کے ساتھ عربی زبان سے مناسبت کم سے کم تر ہونے کی وجہ سے میں نے آئندہ صرف عربی سے اردو ترجمہ نگاری تک خود کو محدود کر لیا۔ چنانچہ اسلامیات اور طب کی تقریباً دو درجن کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان کتابوں کو علمی حلقوں میں قبولِ عام حاصل ہوا اور ترجمہ کو معتبر سمجھا گیا۔ مجھے اعتراف ہے اور اسے میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ ترجمہ نگاری کے میدان میں استاذِ گرامی کی ذات سے جو فیض پہنچا تھا اور ان سے جو تربیت حاصل ہوئی تھی وہ ہر موقع پر میرے کام آئی۔

ہمت افزائی:

مربی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں خود اعتمادی پیدا کرے۔ مولانا اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ جو کچھ ہم سے ترجمہ کراتے، اسے ہمارے ہی نام سے شائع کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک اور واقعے کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ندوہ میں فضیلت سالِ آخر کے طلبہ کا الوداعی پروگرام ہوتا تھا۔ جب ہم سالِ آخر میں پہنچے اور الوداعی پروگرام کا موقع آیا تو میں نے سوچا کہ کوئی جدّت اختیار کی جائے۔ میں نے اپنے تاثرات کو عربی میں منظوم کیا۔ استاذِ گرامی مولانا سید محمد رابع حسنی سے اصلاح لی۔ جلسہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور اس میں یہ نظم پیش کی گئی۔ بعد میں اسے استاذ گرامی مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ نے مجھ سے لے کر اپنے دوست مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کو بھیج دی، جو عربی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے اس کی ہیئت ہی بدل دی۔ یہ قصیدہ (جو ۳۹/اشعار پر مشتمل ہے) میرے کاغذات میں محفوظ تھا۔ کئی برس کے بعد میں نے اسے استاذ گرامی کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے پورا قصیدہ الرائد (۱۶/ستمبر ۱۹۸۶ء) میں شائع کر دیا۔

مولانا مرحوم کے اندازِ تربیت کے سلسلے میں یہ صرف میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح ہزاروں فیض یافتگان ہیں جنھوں نے مولانا سے کسبِ فیض کیا ہے اور اب مختلف میدانوں میں علمی و دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی یہ خدمات مولانا کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں، جس کا اجر انھیں تا قیامت ملتا رہے گا۔

☆☆☆

جلیل القدر مربی-واضح رشید ندویؒ

پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی
(سابق صدر شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

عربی زبان و ادب کے نامور استاذ، مایۂ ناز ادیب، بصیرت افروز ناقد اور جلیل القدر مربی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ۱۶ جنوری ۲۰۱۹ کو ۸۵ سال کی عمر میں، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہمان خانے میں حسب معمول تہجد گزاری کے بعد تلاوت قرآن مجید کرتے ہوئے باوضو جسمانی و روحانی طہارت کے ساتھ نماز فجر کی تیاری کرتے کرتے مؤذن کی اذان پر لبیک کہتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہوگئے؛ اور پھر اپنی جائے ولادت تکیہ رائے بریلی (یوپی) میں اپنے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے قریب میں ہمیشہ کے لیے محوِ استراحت بھی ہوگئے، قابل ذکر ہے کہ مولانا واضح صاحبؒ کی ولادت اسی تکیہ، رائے بریلی میں ۲۰ نومبر ۱۹۳۳ کو ہوئی تھی، حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی صاحب بھی تو اسی طرح ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کے آخری عشرہ میں (۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ کو) اسی تکیہ شاہ علم اللہ و سید احمد شہید رحمہما اللہ کے دیار میں جمعہ کی نماز کی تیاری کر کے تلاوت قرآن کرتے ہوئے اُرحم الراحمین سے جا ملے تھے۔ اللھم اغفرلھم مغفرۃ واسعۃ.

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیم تھے، عربی زبان و ادب کی فیکلٹی کے ڈین، فکر اسلامی کے اعلیٰ ادارہ کے ڈائریکٹر، رابطہ ادب اسلامی عالمی کے جنرل سکریٹری، پندرہ روزہ عربی جریدہ کے چیف ایڈیٹر اور ماہنامہ البعث الاسلامی کے شریک ایڈیٹر تھے اور درجنوں عربی اردو کتابوں کے مؤلف بھی تھے:

چاندنی بے نور و گل بے رنگ اور نغمے اداس
اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہوگیا

مولانا واضح صاحب نے ندوے سے فاضل ادب کی سند ۱۹۵۱ میں حاصل کی تھی اس کے بعد ۱۹۵۳ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے پرائیوٹ پاس کیا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کے عربی یونٹ میں انگریزی عربی مترجم اور اناؤنسر مقرر ہوئے جہاں بیس (۲۰) سال تک مشغول رہے، مولانا واضح صاحب سے راقم کا تعلق بہت پرانا ہے، ۱۹۶۶ء میں راقم نے ندوے سے فاضل دینیات کی سند حاصل کر کے دہلی کا رخ کیا تھا، جہاں جامعہ ملیہ میں دو سال ہوسٹل میں رہ کر ہائر سیکنڈری اسکول پاس کیا۔ اس زمانے میں مولانا اجتباء ندوی صاحب جامعہ میں استاد تھے، ان کے یہاں مولانا واضح صاحب اور مولانا سید ابوبکر حسنی صاحب سے برابر ملاقات ہوتی تھی اور جب کبھی شہر جاتا، فراش خانے (محلے) میں ان کے گھر بھی جاتا، اس زمانے میں راقم نے آنے جانے والوں کے ساتھ حسنی خانوادے کی ضیافت، اخلاق اور تواضع کے مظاہر دیکھے اور متاثر ہوا، ایک بار ۱۹۶۸ء میں پروفیسر عبدالحلیم ندوی اور پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے عربی تقریروں کا ایک مسابقہ ''دور الطالب فی بناء الوطن'' کے عنوان سے کرایا۔ اس میں جج کے فرائض مولانا واضح رشید حسنی صاحب اور مولانا ابوبکر حسنی صاحب نے انجام دیئے جو بالترتیب آل انڈیا ریڈیو میں مترجم و اناؤنسر اور نہرو انٹرنیشنل سنٹر میں استاد تھے، مولانا ابوبکر صاحب جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس کے ویسٹ

ایشین سنٹر میں پروفیسر ہوگئے تھے۔اس مسابقے میں مشہور شامی سفیر، ادیب وشاعر عمر ابوریشہ کی صدارت میں انھیں کے بدست بحمداللہ اول انعام راقم سطور کو حاصل ہوا تھا، ان دونوں حسنی بزرگوں سے راقم نے نجی ملاقاتوں میں بہت کچھ سیکھا اور یہ دیکھ کر متاثر ہوا کہ ان کا گھر مدارس دینیہ کے چندہ مانگنے والوں کا ملجأ و ماویٰ ہے۔ ضیافت و سخاوت اور تواضع کا یہ سلسلہ مولانا ابوبکر حسنی کی وفات کے بعد بھی ان کے داماد (راقم کے ندوی کلاس فیلو دوست) خالد حسنی ندوی کے ذریعہ ایک زمانے تک جاری رہا۔

واضح صاحب صحیح معنوں میں متقی تھے، خوفِ خدا اور فکر آخرت کی صفات سے متصف متقی اور مردِ مؤمن۔ مجھے یاد ہے ۱۹۷۳ء کا زمانہ جب میں علی گڑھ میں ایم اے کا طالب علم تھا؛ اور حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ سے ملنے تکیہ گیا ہوا تھا، حضرت مولاناؒ کے حضور باادب بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، جستجو ہوئی کہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحب ہیں جو مولانا سے ریڈیو کی ۲۰ سالہ ملازمت چھوڑنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں اور وجہ یہ بتا رہے ہیں کہ یہاں اکثر خلافِ واقعہ باتوں کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے، اور انھیں نشر بھی کرنا ہوتا ہے، اس کے بعد میں تو اپنے گاؤں رستہ مَوضلع رائے بریلی (جواب ضلع امیٹھی ہے) واپس چلا آیا، چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ مولانا واضح صاحب ریڈیو کی بری تنخواہ چھوڑ کر ندوہ آگئے اور مفت پڑھانے لگے، جہاں ایک عرصے کے بعد قدر کفاف سے بھی کم مشاہرہ دیا جانا منظور ہوا، میں دنگ رہ گیا؛ کہ اس زمانے میں بھی تقویٰ اور عزیمت کی راہ پر چلنے والا کوئی تو نظر آیا۔

کچھ ہی دن بعد واضح رشید حسنی کے نام سے مضامین مجلۃ البعث الإسلامی اور صحیفہ ''الرائد'' میں شائع ہونے لگے، جو بعد میں صور و أوضاع، أنباء وتعلیقات اور افتتاحیۃ کے عناوین سے مستقل عناوین کی شکل اختیار کر کے عربی زبان کے طلبہ واساتذہ کی توجہ اور استفادہ کے وسیلے بنتے گئے۔

مجھے واضح صاحب کی نگارشات اور ان کے اسلوب بیان سے خصوصی دلچسپی رہی ہے، کیوں کہ ان کی تعبیرات انگریزی عربی کے قدیم وجدید انداز بیان اور سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج ہوتی ہیں۔

سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
(غالب)

حسن الحضارة مجلوب بتطرية
وفي البداوة حسن غير مجلوب
(متنبّی)

مولانا واضح صاحب نے البعث اور الرائد کے معیار کی بلندی میں اہم رول ادا کیا، حتی کہ وہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی استاذ گرامی مولانا سعید الأعظمی کا دست راست بن گئے؛ اسی طرح جس طرح ہوا کرتے تھے مجلّہ البعث الاسلامی کے مؤسس اور پہلے چیف ایڈیٹر سید محمد الحسینی مرحوم مؤلف کتاب الإسلام الممتحن.

مجھے یاد ہے ۱۹۵۹ء کا زمانہ جب میں ندوہ العلماء کے دوسرے درجے کا طالب علم تھا، حضرت مولانا محمد رابع حسنی اور حضرت مولانا سعید الأعظمی نے پندرہ روزہ صحیفہ ''الرائد'' نکالا۔ میں ان کے ساتھ لگا رہتا تھا اور ''الرائد'' کے بنڈل پوسٹ کرنے چار باغ لکھنؤ اسٹیشن جایا کرتا تھا، خریداروں کے نام پتے بھی اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا، قاری علیم صاحب مرحوم کے دستی کتابت سے کسی طرح یہ پرچہ چھپتا اور شائع ہوتا تھا۔ بارہ چودہ برس کے بعد جب مولانا واضح صاحب ریڈیو کی نوکری چھوڑ کر ندوے آئے تو ''الرائد'' کی قسمت جاگی، واضح صاحب نے اسے ملون رسالے کی شکل دی۔ صفحات میں اضافے کیے، افتتاحیۃ مولانا رابع صاحب کے قلم سے اور کلمۃ العدد مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب مدظلہما کے قلم سے شائع ہوتے رہے، باقی دیگر مضامین اور مستقل عنوانات خصوصا انباء وتعلیقات'' وصور واوضاع نئی نسل کی ہمہ گیر تربیت کا سامان فراہم کرنے لگے۔ اس طرح مولانا سید محمد واضح رشید حسنی نے سرزمین ہند کی عربی صحافت کو عالم عرب کے وسیع وعریض آسمانوں تک پہونچایا۔

مولانا واضح کی درج ذیل عربی واردو کتابیں موجود ومیسر ہیں جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امت مسلمہ کی ہمہ گیر تربیت کے متلاشی تھے، محض تدریس اور تعلیم پر اکتفاء کرنے کے قائل تھے:

(الف) عربی کتابیں:

(۱) إلی نظام عالمی جدید
(۲) من قضایاج الفکرالإ سلامی: الغزوالفکری
(۳) تاریخ الأ دب العربی فی العصرالجاھلی
(۴) أعلام الأ دب العربی فی العصرالحدیث
(۵) مصادرالأ دب العربی
(۶) أدب أھل القلوب
(۷) تاریخ الثقافۃ الإ سلامیۃ
(۸) الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھافی العصرالحدیث
(۹) أدب الصحو ۃ الإ سلامیۃ
(۱۰) محمد رسول اللہ وصحابتہ رضی اللہ عنہم
(۱۱) الشیخ أبوالحسن علی الحسنی الندوی قائداحکیما
(۱۲) ابوالحسن علی الندوی: منابع فکرہ ومنھجہ
(۱۳) من صناعۃ الموت إلی صناعۃ القرارات
(۱۴) حرکۃ رسالۃ الإ نسانیۃ لمنھج
(۱۵) حرکۃ التعلیم الدینی وتطورا لمنھج
(۱۶) محسن انسانیت
(۱۷) سلطان ٹیپوشہید-ایک تاریخ ساز قائد
(۱۸) مسئلہ فلسطین
(۱۹) ندوۃ العلماء-ایک رہنما تعلیمی مرکزاورتحریک اصلاح ودعوت
(۲۰) نظام تعلیم وتربیت: اندیشے،تقاضےاورحل
(۲۱) اسلام- تکمیل نظام زندگی (حدیث نبوی کی روشنی میں)
(۲۲) انسانی حقوق (قرآن وحدیث اورسیرت کی روشنی میں)

(ب) اردو کتابیں:

(ج) اردو سے عربی ترجمہ:
(۱) فضائل القرآن الکریم (الشیخ محمد زکریا)
(۲) فضائل الصلاۃ علی النبیؐ (الشیخ محمد زکریا)
(۳) الدین والعلوم العقلیۃ (الشیخ عبدالباری الندوی)

☆☆☆

علماء کی ذمہ داری

اسلامی علوم کے حاملین اورعلماء کی ذمہ داری اس پس منظر میں یہ ہے کہ اسلامی علوم کومغربی تشریح سے آزاد کریں، مغرب کے شکوک وشبہات کا جواب دیں،اوران علوم کومغربی آلودگی سے صاف کرکے بالکل خالص طور پرزمانہ کی زبان اوراس کے مزاج کے مطابق پیش کریں،اس طرح کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ان کی ترجمانی قابل قبول ہوجائے اور باطل اعتراضات کی تردید ہوجائے۔مغرب کے اثر سے علمی حلقوں کواسی وقت آزاد کیا جاسکتا ہے جب صحیح الفکر علماء دینی روح اورعلمی اورتحقیقی مطالعہ کے ساتھ مغرب کے علماء کے تیار کیے ہوئے مراجع کے مقابلہ میں ان سے بہتر مراجع پیش کرسکیں،اس کے لیےضروری ہے کہ مغربی علماء کےنظریات،ان کے طریقۂ بحث ومآخذ کا گہرا مطالعہ کیا جائے،ان کےنظریات کا تجزیہ کیا جائے۔یہ کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جوقلب مومن،داعیانہ جذبہ اورعلمی وتحقیقی صلاحیت رکھتے ہوں،اوران کا مخالف لٹریچر کا عمیق مطالعہ ہو۔

(مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ)

حضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ-حیات وخدمات

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نورالاسلام کنڈہ پرتاپگڑھ

نوٹ: صاحب مضمون شریک سیمینار نہیں تھے مگر ان سے درخواست کی گئی تھی کہ حیات وخدمات پر ایک مختصر وجامع مضمون قلمبند کردیں تاکہ خاص شمارہ اس خاکہ سے خالی نہ ہو، ادارہ شکر گذار ہے کہ انھوں نے درخواست قبول کی۔ (ادارہ)

حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ کی موت سے ندوہ ایک اہم علمی ستون سے محروم ہوگیا۔ان کی وفات ملت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم خسارہ ہے جس سے ملت اسلامیہ میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ان کی وفات موت العالم موت العالم (عالم کی موت دنیا کی موت) کے مصداق ہے۔وہ ایک عظیم اسکالر،صحافی،مفکر ومربی کے ساتھ راہ سلوک کے بھی رہرو تھے۔ گویا وہ اس مصرع کے مصداق تھے:

درکف جام شریعت درکف سندان عشق

جدید اور قدیم علوم پر گہری نظر تھی۔عالم اسلام اور مغربی ممالک پر گہری نظر رکھتے تھے ان کے علمی ادبی اور دینی کارنامے بے شمار ہیں۔ متعدد اردو وعربی کتابوں کے مصنف ومؤلف تھے۔عربی ماہنامہ البعث الاسلامی اور پندرہ روزہ عربی جریدہ الرائد کے مدیروں میں تھے اور کئی اداروں کے ناظم اور ذمہ دار بھی۔ وہ اپنی جامع ومؤثر تحریروں اور فکروں سے صرف ملک ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں خصوصا عرب ممالک میں جانے اور پہچانے جاتے تھے۔

مرحوم کافی خاموش مزاج، نرم طبیعت اور اچھے اور بلند اخلاق کے حامل تھے۔ ہمہ وقت فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔انکی خاموشی بھی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ یورپ اور مغربی ممالک پر صاف اور واضح تنقید کرتے تھے اور ان کی خامیوں اور خوبیوں سے پردہ اٹھاتے تھے۔انکی تحریریں مغربی کلچر اور مغربی تہذیب وتمدن کا قلع قمع کرنے کے لئے ہوتی تھیں۔تعلیم اور نصاب تعلیم پر بڑی گہری نظر تھی اسی لئے ارباب ندوۃ العلماء نے حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے بعد ان کو ندوہ میں تعلیم کا ذمہ دار اعلی بنایا۔مولانا ان شخصیات میں سے تھے جن کے انتقال پر ایک زمانہ افسوس کرتا ہے۔اور جن پر شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا غرور وتعلی سے یکسر دور تھے،تواضع انکساری اور بے نفسی کیساتھ پوری زندگی گزاری۔قرآن مجید سے گہرا شغف اور حد درجہ لگاؤ تھا کئی کئی پارے یومیہ تلاوت کا معمول تھا۔اخیر عمر میں جب بینائی کمزور ہوگئی تب بھی ایک دو پارے خود تلاوت کرتے اور کسی عزیز یا شاگرد سے اس کے علاوہ دو تین پارے سنتے۔ بقول حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی مدظلہ العالی:

مولانا اپنے علمی کمالات، دور بینی ،عربی زبان پر غیر معمولی قدرت،حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کی صلاحیت میں اپنے معاصرین میں ممتاز ونمایاں تھے۔ان میدانوں میں ان کا کوئی ہم سر نہیں ہوا۔ان سب خوبیوں کیساتھ ان کی اخلاقی رفعت ،ایثار، سادگی اور بے نفسی ہمیشہ قابل رشک بنی رہی،زندگی بھر وہ قابل رشک رہے ہی،موت بھی ایسی آئی جس پر رشک کرنے کا جی چاہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ عالم اسفل سے عالم بالا کو سدھار گئے (ملخص تعزیتی پیغام از حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی مدظلہ العالی)۔

حضرت مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ دنیا کے ان چند مفکرین

میں تھے جن کو انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے، مولانا کے فکری، علمی محاضرات اور مقالات ومضامین سے ایک عالم نے استفادہ کیا۔

مولانا مرحوم کی حیات وخدمات کی چند جھلکیاں انتہائی اختصار کے ساتھ ہم پیش کررہے تاکہ اذکروا محاسن موتاکم پر عمل ہو اور خلف اپنے سلف کی محنت توجہ خلوص اور جفاکشی وسادگی کو دیکھ کر اپنے اندر بھی ان کمالات کو پیدا کرسکیں۔

ابتدائی حالات اور تعلیم و تربیت:

مولانا مرحوم کا تعلق خانوادۂ شاہ علم اللہ سادات حسنی سے تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھریلو نظام کے مطابق ہوئی، ابتدائی تعلیم وتربیت میں والدین کے علاوہ مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب کی خصوصی نگرانی رہی جو خاندان کے بڑے سرپرست تھے، اور اللہ تعالی نے ان کو تعلیم وتربیت اور اتالیقی کے خاص جوہر سے نوازا تھا۔ کچھ دنوں مدرسہ الہیہ رائے بریلی میں بھی آپ زیر تعلیم رہے۔ عربی تعلیم کی ابتدا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی اور یہیں تعلیم مکمل ہوئی، ۱۹۵۱ء میں فضیلت ادب سے فراغت حاصل کی اور مزید ایک سال تکمیل ادب کا خصوصی نصاب مکمل کیا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۳ء تک آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ عربی سے منسلک رہے، دوران ملازمت آپ نے علوم سیاسات وسوشیالجی، انگریزی زبان وادب، مغربی تمدن وسیاست اس کے نشیب وفراز اور اتار چڑھاو اور عام زندگی پر اس کے اثرات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ اس عرصہ میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر بی۔اے تک کے امتحانات دئے۔ مولانا آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تو ہوگئے لیکن وہاں کا ماحول آپ کی طبیعت اور ذوق سے میل نہیں کھاتا تھا بقول استاد محترم مولانا سلمان حسینی ندوی: مولانا واضح صاحب ریڈیو اسٹیشن میں بالکل اجنبی بلکہ اپنی روح کے لئے گھٹن کے ماحول میں سال بہ سال گزارتے رہے، آپ کی طبیعت پر اس کا بڑا غلبہ تھا کہ وہ ایک گھٹن کے ماحول میں ہیں جہاں نہ رائے کی آزادی ہے نہ شعور کی، کیوں کہ یہاں حکومت کے دباؤ میں کام کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ ۱۹۷۳ء میں آپ نے بلکہ آپ کے بے چین ضمیر نے یہ فیصلہ کیا کہ ریڈیو اسٹیشن کے مصنوعی اور خبر نگاری اور خبر سازی کے مخلوط ماحول کو چھوڑ کر دارالعلوم میں اپنی صلاحیتیں صرف کریں۔ چنانچہ ماہ جون کی ابتدا ہی میں اس ملازمت سے استعفا دے کر آپ لکھنؤ آگئے اور ۹ جون ۱۹۷۳ء کو بحیثیت استاد عربی آپ کا ندوہ میں تقرر ہوا اور تاحیات ندوہ کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔

مولانا کا روحانی رابطہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی سے قائم تھا، اس لئے اس اہم قدم اٹھانے میں آپ نے ان سے خصوصی مشورہ بھی لیا۔ ۱۹۷۳ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بحیثیت استاد مقرر ہوئے، اور پندرہ روزہ الرائد کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، ۲۰۰۰ء میں عربی فیکلٹی کے صدر شعبہ، المعہد العالی والفکر الاسلامی کے ڈائریکٹر اور ۲۰۰۶ء میں مولانا عبداللہ عباس ندوی رح کی وفات کے بعد ندوہ کے تاحیات معتمد تعلیم بھی رہے۔

عربی صحافت میں پندرہ روزہ الرائد اور البعث الاسلامی آپ کی قلم ریزیوں کا شاہد عدل ہیں۔ عربی ماہنامہ البعث الاسلامی میں شریک ادارت رہے اور حالات حاضرہ سے متعلق صور واوضاع کا کالم لکھتے رہے۔ جو انتہائی مقبول کالم تھا۔ عرب اہل علم بھی نگاہ شوق سے پڑھا کرتے تھے اور ایک ہندی نژاد صحافی کی عربی دانی اور بے باک صحافت پر داد تحسین دیتے تھے۔

آپ کے محسن اساتذہ:

آپ کے محسن اساتذہ جن سے آپ نے خصوصی استفادہ کیا اور ذوق وذہن کی تشکیل میں اہم اثر ڈالا وہ سب اپنے عہد کے ممتاز اور لائق فائق اساتذہ تھے۔ مولانا خود لکھتے ہیں:

عہد طالب علمی میں مولانا عبدالحفیظ بلیاوی صاحب مرحوم، مولانا اسباط صاحب مرحوم، مولانا محمد اویس صاحب مرحوم، شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم، مولانا محبوب الرحمٰن ازہری، مولانا ابو العرفان صاحب ندوی، مفتی سعید صاحب، مولانا اسحاق سندیلوی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی سے مجھے طویل مدت تک استفادہ کا موقع ملا۔ ہر استاد کا خاص رنگ وذوق اور طرز تدریس تھا۔

عہدے اور مناصب:

*معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ

*جنرل سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی برصغیر

*جنرل سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

*رکن ابوالکلام آزادسوسائٹی لکھنؤ

*ناظم مدرسہ فلاح المسلمین امین نگر، تیندوا، رائے بریلی

*نائب صدر دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی

اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک خاص طور پر قاہرہ، عمان، لاہور، تاشقند، مکہ مکرمہ، آکسفورڈ یونیورسٹی، ریاض یونیورسٹی، مدینہ منورہ اور استنبول وغیرہ کے علمی وادبی اور تربیتی سیمیناروں میں شریک رہے۔

تصنیفات و تالیفات:

*تاریخ الادب العربی-العصر الاولی

*نحو نظام عالمی جدید

*مصادر الادب العربی

*الامام احمد بن عرفان الشہید

*ادب اھل القلوب

*المسحۃ الادبیہ من کتابات الشیخ ابی الحسن

*الشیخ ابوالحسن قائداوحکیما

*مختصر الشمائل

*اعلام الادب العربی

*الدعوۃ الاسلامیہ ومناھجھا

*من صناعۃ الموت الی صناعۃ القرارات

*حرکت التعلیم الدینی وتطور امنھج

*حرکت رسالۃ الانسانیۃ

عربی ترجمے:

*فضائل الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

*الدین والعلوم العقلیۃ

اردو تصنفات و تالیفات:

*محسن انسانیت

*سلطان ٹیپوشہید ایک تاریخ ساز شخصیت

*مسئلہ فلسطین

*ندوۃ العلماء ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریک اصلاح ودعوت

*نظام تعلیم وتربیت-اندیشے تقاضے اور حل

*اسلامی مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں

(مستفاد روزنامہ سہارا، ۱۷/جنوری ۲۰۱۹ء)

آپ کا قلمی جہاد:

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی کی شخصیت ہمیشہ بامقصد اور تعمیری تھی، انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ دین حنیف کی بھرپور ترجمانی اور پاسبانی کی۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالم اسلام کے کسی گوشے میں کوئی فتنہ، کوئی غلط تحریک یا دعوت و سازش رونما ہوتی تو آپ اس کے لئے سد سکندری بن جاتے اور بلا تاخیر آپ کے قلم کا سیلاب رواں جوش میں آجاتا۔ اور پوری قوت کے ساتھ اس کو کچلنے اور امر واقعہ کو آشکارا کرنے کی کوشش کرتے۔ البعث الاسلامی کا صور و اوضاع کالم اور الرائد کا اکثر و بیشتر افتتاحیہ قرآن و سنت، سیرت رسول، سیرت صحابہ، ادب اہل قلوب، فکر اسلامی، تاریخ عالم یورپ کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں اور انسانی زندگی کے مختلف موضوعات پر اپنے موئے قلم سے علمی وفکری لیکن سہل الممتنع اسلوب میں صفحات کے صفحات لکھتے رہے۔ اور پھر جب یہ عربی مضامین اردو قالب میں ڈھلتے تو ہزاروں لوگ اور اہل علم ان سے استفادہ کرتے۔ اور عالم اسلام کی تازہ ترین صورتحال اور اہل مغرب کی نئی سازشوں سے واقف ہوتے۔ صحافت اور قلم کو آپ ایک امانت سمجھتے تھے آپ نے پوری زندگی اس امانت کا حق ادا کیا، آپ کی کوئی تحریر محض کسی شوق اور علمی رعب بٹھانے کی نیت سے نہ ہوتی بلکہ قلم کو علمی جہاد کی نیت سے حرکت دیتے تھے۔

چند نمایاں خصوصیات:

آپ کے بڑے اور معاصر سب کو اس کا اعتراف تھا کہ آپ ایک مرد حق آگاہ، دوراندیش، بلند حوصلہ اور نہایت نفاست پسند ذھن کے مالک تھے، نہایت منکسر المزاج، ملنسار اور اعلی اخلاق کے حامل

تھے۔ خاموشی، سادگی بے نفسی، تواضع اور متانت کے پیکر اور عزم و استقلال کے پہاڑ تھے۔علم وادب اور صحافت وقلم کے میدان کے شہسوار تو تھے ہی، میدان سلوک ومعرفت میں بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ بے ضرر فرشتہ صفت انسان تھے، اپنی زندگی میں شاید ہی کسی کو شکوہ شکایت کا موقع دیا ہو۔آپ نے ہمیشہ دل جوڑنے کا کام کیا، کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی۔کسی کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔اللہ کے دین کی حمیت تو گویا ان کو وراثت میں ملی تھی۔اسلام کی خدمت کا جذبہ اور غیرت حق ان کے ریشے ریشے میں سرایت کی ہوئی تھی۔ان کا خمیر تعلق باللہ اور انابت الی اللہ سے تیار ہوا تھا۔آپ نہایت سادہ لوح، شریں کلام اور رقیق القلب انسان تھے،آپ کی سادگی، بے نفسی ،عاجزی اور بے مثال تواضع کی وجہ سے ہر ایک کے لئے آپ سے استفادہ آسان تھا، ہٹو اور بچو کا تو آپ کے یہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

اگر آپ کی پوری زندگی کا خلاصہ اور ماحصل ایک مرکزی عنوان اور چند ذیلی عناوین میں پیش کیا جائے تو وہ یوں ہوگا۔

عظیم علمی شخصیت۔ ہمہ گیری اور فراخ دلی۔علمی و ادبی نفع رسانی۔زبان واسلوب کی اصلاح پر غیر معمولی قدرت۔ہمت افزائی اور قدردانی۔لایعنی اور بدگمانی سے پرہیز۔فضول اور غیر ضروری سے پرہیز۔ایثار واخلاص۔کتاب ہدایت قرآن مجید سے گہرا شغف۔

الغرض مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کو اللہ رب العزت نے گوناگوں صفات سے نوازا تھا، وہ ہر دل عزیز استاد ومربی ہی نہیں، در شہوار تھے جن سے ندوہ العلماء کو تابندگی حاصل تھی وہ مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے، اخلاق عالیہ اور حسن عمل کا پیکر تھے۔مغربی افکار کا سمجھنے والا اور اس کا تجزیہ کرنے والا اب کوئی اس ٹکر کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ملت کو ان کا نعم البدل نصیب فرمائے، اللہ تعالی نے آپ کو بعض ان صفات سے نوازا تھا جو اس دور میں عنقا ہوتی جارہی ہیں۔

☆☆☆

(صفحہ ۱۳۹ کا بقیہ)

.....اس طرح وہ خوبصورت تصویر پیش کرنے سے قبل بدصورت تصویر سامنے رکھتے ہیں۔شائد وہ یہ سمجھتے ہیں کہ برے سے اچھے کی طرف جانا انسان کے دل کو نعمتوں کی معرفت کے لئے وا کر دیتا ہے، اور اسی لئے انہوں نے فصاحت و بلاغت کی نعمت کا ذکر، زبان و بیان کے عیوب اور مشکلات کے تذکرے کے بعد کیا ہے''۔اسی طرح ''البیان والتبیین'' کے دوسرے جزء کا انتخاب پیش کرتے وقت صرف اتنا تحریر فرماتے ہیں''جاحظ نے اس جزء کی ابتداء خطباء وشعراء کے طعنوں کا رد کر کے کرنی چاہی مگر اس پر اللہ کے رسول ﷺ اور سلف صالحین ومنتخب تابعین کی باتوں سے شروع کرنے کو ترجیح دی جنکی حیثیت تاریک راتوں کے چراغوں اور ان روشن ستاروں کی طرح ہے جن کے ہوتے ہوئے کوئی راستہ نہیں بھٹکتا۔''

اسی طرح آپ نے دوسرے مصادر کے نصوص کا انتخاب پیش کرتے وقت ایک یا دو پیراگراف میں مختصراً کچھ تحریر فرمادیا ہے جس سے قاری کو ان کتابوں کی اہمیت کے بارے میں کچھ اشارہ مل جاتا ہے، اگر ان کتابوں کے امتیازات وخصوصیات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہوتی اور ان کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہوتا تو اس کتاب کی قدر و قیمت میں چار چاند لگ جاتے اور ایک عام قاری کے لئے یہ کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتی اور شائد اس کے پڑھنے کے بعد عربی مصادر سے متعارف ہونے کے تعلق سے کچھ تشنگی باقی نہ رہتی اور کسی دوسری کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

بحر حال استاد مرحوم کی یہ قیمتی کتاب عربی زبان وادب سے شغف رکھنے والوں کے لئے اصل مصادر کی بنیادی باتوں کے جاننے، ان سے متعارف ہونے اور ان میں ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کا ایک اہم اور مفید ذریعہ ہے۔

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ بحیثیت ادیب و ماہر زبان

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(رفیق علمی امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ)

برصغیر میں جن اداروں اور خانوادوں کو اللہ تعالی نے عربی زبان وادب کی خدمت کے لیے منتخب کیا، ان میں ''دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ'' اور ''حسنی خاندان'' سرفہرست ہیں۔ اس مرکز علمی اور اس خاندان حسنی کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے ہر دور میں ایک سے بڑھ کر ایک ادیب اور اصحاب قلم پیدا کیے جن کا ذہن، ہندی اور نطق، اَعرابی تھا، جنھوں نے عربی زبان کے گیسوئے برہم کو سنوارا۔ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی اسی ادارے کے پروردہ اور اسی خاندان کے نمایاں چشم و چراغ تھے، جن کا مختلف میدانوں میں ستارۂ اقبال چمکا، جنھوں نے دین ودعوت، اور فکر اسلامی کی تشریح وترجمانی کے لیے زبان وادب کو ہمیشہ مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا، اپنے تجزیاتی قلم سے فکر استشراق کا بھرپور جائزہ لے کر اس کی زہرناکی کو واضح کیا، اور اپنے متوازن ومنصفانہ نقد وتبصرہ سے مغربی افکار کا بصیرت مندانہ جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولاناؒ پورے برصغیر میں کئی جہتوں سے منفرد تھے؛ لیکن راقم سطور سر دست ان کی شخصیت کے کثیر الجہات پہلوؤں میں سے صرف اس پہلو پر کچھ روشنی ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے جس سے ان کی ادیبانہ شان اور مہارت زبان کے جلوے سامنے آئیں۔

زبان وادب میں مولانا کا امتیاز و مقام :

زبان وادب میں مولانا کا کیا رتبہ تھا، اس پر تفصیلی اور مربوط مضمون لکھنے کی بجائے راقم سطور نے چند گزارشات نکات کی شکل میں اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مولانا کا یہ پہلو کھل کر سامنے آجائے۔

عربی وارد و، دونوں زبان کے ماہرین نے یہ بات لکھی ہے کہ: ''ہر ادبی تحریر، ہیئت ومواد دونوں میں اپنے خالق کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہے، اس کی انفرادیت کی چھاپ رکھتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مصنف کی شخصیت صرف تخلیقی تحریروں میں ہی جھلکتی ہے۔ نہیں، تنقید اور تحقیق کا ہر کام بھی مصنف کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے''۔(۱)

اس اصول کی روشنی میں جب ہم دیکھتے ہیں تو مولاناؒ کی شخصیت ان کی تحریروں میں ہمیں اپنی پوری تابانی اور جلوہ سامانی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اگر کوئی مولانا کی تحریروں سے ان کی شخصیت کے خط وخال، ان کے علم وفن، ان کی دانائی وبصیرت، تدبر وحکمت، فہم وفراست، ان کے رجحانات وخیالات، ان کے افکار ونظریات، مزاجی کیفیت، علمی لیاقت، نقد ونظر کی صلاحیت، ان کے قرآنی ذوق، لسانی مہارت، ادیبانہ شان، صحافیانہ رنگ اور ان کی شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کو مجسم شکل دینا چاہے تو بآسانی دے سکتا ہے۔

زبان وادب کے لحاظ سے جب ہم مولانا کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل امتیازات وخصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ انھوں نے زبان وادب کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، یا

نقد واحتساب کا جوفریضہ انجام دیا ہے،اس میں اپنی ذات کو وابستہ کرنے کی بجائے معروضیت کا رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

۲۔وہ ایک بلند پایہ ادیب اور ممتاز اہل قلم تھے،اس لیے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تحریر میں مواد کس قدر اور کس تناسب سے ہونا چاہیے،کون سی چیز اہم اور کون سی غیر اہم ہے؛ کیوں کہ ماہرین کے بقول:''ایک اچھا مصنف صرف یہی نہیں جانتا کہ اسے کیا لکھنا چاہیے؛ بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسے کیا نہیں لکھنا چاہیے''۔(۲)

۳۔مولانا''ادب کے ساتھ بے ادبی سے پیش آنے کے قائل نہیں تھے؛ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ادب ناشناس لوگوں کو ادب بھی اپنے دائرے میں جگہ نہیں دیتا''۔(۳)

۴۔مولانا کا شمار ان ادباء میں بھی نہیں تھا''جو دوسروں کی مرضی سے اپنا قلم چلاتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہوجاتا ہے، تو پھر اپنی اصل جگہ پر آجاتے ہیں''۔(۴)

۵۔مولانا کا ادیبانہ قلم بہت زیادہ شوخ نہیں تھا؛ بلکہ مؤدب تھا،اس لیے ان کے حلقۂ ادب میں وہی چیزیں جگہ پاسکیں جو ایک مؤمن ادیب کے لیے موزوں تر ہوسکتی ہیں۔

۶۔''جمالیات'' کو ادب کی بارگاہ میں بڑی عزت حاصل ہوتی ہے؛لیکن مولانا اس حسن وجمال کے قائل تھے جس میں لطف اندوزی کا عنصر ہو، نہ کہ ہیجان انگیزی اور جنسی تحریک کا۔اس لیے قرآن وحدیث کے جمالیاتی پہلو سے مولانا کو خاص تعلق رہا،جس کا زبان وبیان سے اظہار بھی کرتے رہے۔

۷۔مولانا کی ادبی تحریریں احساس ووجدان اور جذبات وعواطف کی عکاس ہیں،اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ادب وشاعری کی بنیاد ہی احساس ووجدان پر قائم ہوتی ہے۔

۸۔مولانا کا تعلق بالقرآن بڑا گہرا تھا، وہ اپنے خالص ادبی ذوق سے قرآن کریم کے اعجاز بیان،اس کی بلاغت وحلاوت کو نہ صرف محسوس کرلیتے تھے؛ بلکہ ان کا یہ ذوق،ذائقے میں تبدیل ہوگیا تھا۔اس ذوق کا ظہور تنہائی میں دوران تلاوت اس طور پر ہوتا کہ وہ تلاوت کرتے ہوئے کسی آیت یا کسی تعبیر پر پھڑک اٹھتے اور جھومنے لگتے تھے۔مولانا شاگردوں میں بھی یہ ذوق منتقل کرنا چاہتے تھے،اس لیے وہ قرآنی ادب پر بہت زور دیتے تھے،اور سید قطب شہید کی''التصویر الفنی فی القرآن''،''مشاھد القیامۃ فی القرآن'' اور بنت الشاطی کی''الاعجاز البیانی للقرآن الکریم'' اور''التفسیر البیانی للقرآن الکریم'' کے مطالعے کی تاکید کرتے تھے۔

۹۔مولانا زبان کی باریکیوں اور اس کی نزاکتوں سے اچھی طرح واقف تھے،انھوں نے فطری طریقوں سے زبان وادب کو حاصل کیا تھا،خوش قسمتی سے ان کو ایسا علمی گھرانہ اور ایسا ادبی ماحول ملا جہاں زبان وادب کا چرچا تھا،ایسے اساتذہ ملے جو خالص عربی لہجے میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے،جب عملی میدان میں قدم رکھا تو ایسے اہل قلم اور ادبا کی رفاقت حاصل ہوئی جو عربی نژاد تھے، مزید برآں انھوں نے ایسی معیاری اور منتخب کتابوں سے وابستگی رکھی جو زبان وادب کا معیار سمجھی جاتی ہیں، ساتھ ہی وہ خالص روایتی طرز تعلیم کے پروردہ نہیں تھے؛ بلکہ انگریزی زبان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن بھی کیا تھا،اس لیے ان کا قلم انتہائی طاقتور،اسلوب انتہائی مؤثر،مواد انتہائی ٹھوس،علم انتہائی پختہ اور زبان انتہائی شستہ وشگفتہ ہوگئی تھی۔زبان سے گہری واقفیت ہی کا نتیجہ تھا کہ:

(الف) مولانا کا طرز نگارش خوب صورت اور ادبی ہونے کے باوجود آرائش وزیبائش اور غلو ومبالغے کے نقص سے پاک نظر آتا ہے۔

(ب) مولانا کی تحریروں میں کم سے کم الفاظ میں اظہار مافی الضمیر کی بے پناہ صلاحیت نظر آتی ہے۔

(ج) مولانا کا قلم موضوع پر توجہ مرکوز رکھتا ہے،لفاظی، قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی سے کوسوں دور دکھائی دیتا ہے۔

(د) صفاتی الفاظ کے استعمال میں مولانا کا قلم خاص طور سے بڑا محتاط تھا۔ وہ الفاظ وتعبیرات کے انتخاب میں بڑے دقیقہ رس واقع ہوئے تھے،مترادفات کی کثرت ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتی جو عام طور پر فضلائے مدارس کی تحریروں کی خوبی یا خامی ہے۔

ماہرین نے لکھا بھی ہے کہ:

’’اسماء کے ساتھ صفات اسی وقت لانی چاہئیں جب کوئی صفت لکھنے والے کی اصل رائے کو ظاہر کرتی ہو‘‘۔(۵)

(ہ) زبان کی نزاکتوں سے واقفیت ہی کا نتیجہ تھا کہ موضوعات کے مختلف ہونے کے لحاظ سے ان کے یہاں اسالیب بھی مختلف نظر آتے ہیں: چنانچہ ان کی فکری تحریریں علمی اور استدلالی نوعیت کی ہیں۔تاریخی مضامین کا اسلوب سادہ، واضح اور آسان ہے۔تحقیقی مضامین لکھتے وقت وہ جذباتی اسلوب سے بہت بچتے تھے کہ بقول شخصے:’’ جذباتی اسلوب سے متأثر تحقیق ، تنقید بن جاتی ہے‘‘۔(۶)ان کی ادبی تحریریں، احساسات وجذبات کو ابھارتی ہیں، دلوں کے تاروں کو چھیڑتی ہیں، کہیں کہیں ہلکا سجع بھی نظر آتا ہے جس سے لطف اور دوبالا ہوجاتا ہے۔جب’’زبان‘‘کے حوالے سے لکھتے ہیں تو اس میں ت؟ ثر واحساس کو شامل نہیں ہونے دیتے؛ کیوں زبان وادب میں ایک باریک فرق یہ بھی ہے کہ جب کوئی فقرہ معانی کے ساتھ احساس وتأ ثر کو بھی ادا کرے تو’’ادب‘‘ کہلاتا ہے، ورنہ وہ صرف’’زبان‘‘ کہلائے گا۔لیکن چونکہ مولانا فطری ادیب تھے،اس لیے ان کی ہر تحریر میں ایک قسم کی حلاوت وچاشنی اور جدت وندرت پائی جاتی ہے،شاید ہی کوئی تحریر ہو جو بے رس اور بے کیف ہو۔

(و) لسانیات میں مہارت اور زبان کی خوبیوں سے واقفیت ہی کا نتیجہ تھا کہ مولانا کی تحریر میں ایک خاص قسم کی ترتیب ، توازن، تناسب، باقاعدگی اور تسلسل نظر آتا ہے۔

(ز) مولانا کی کوئی تحریر ایسی نظر سے نہیں گزری جو درازنفسی، تکرار، حشو وزوائد، موضوع سے ہٹ جانے ، یا عنوان سے مضمون کا تعلق واضح نہ ہونے کی شکایت کرتی ہو۔

(ح) ماہرین لسانیات کہتے ہیں کہ’’تحریر اور خاص طور سے تحقیقی تحریر میں بے جا ایجاز واختصار نہ ہونا چاہیے، ساتھ ہی مبہم اظہارات سے بچنا چاہیے‘‘۔(۷) میرا خیال ہے کہ مولانا کی تحریروں میں یہ دونوں خوبیاں اتم درجے میں پائی جاتی ہیں۔

۱۰۔مولانا ان ادباء میں سے تھے جو احساس برتری کو نہ دل میں لاتے تھے اور نہ اپنی تحریروں میں آنے دیتے تھے،ان کی کوئی تحریر یا تقریر ایسی نہ ملے گی جس سے سامع یا قاری مولانا کو ہمہ داں اور دوسرے کو ہیچ مداں سمجھنے کی غلطی کرسکتے ہوں۔(۸)

۱۱۔مولانا ایک وصفی اور تجزیاتی ادیب تھے،ان کی کتاب ’’أدب أهل القلوب‘‘اور’’اعلام الأدب العربي في العصر الحديث‘‘ ان کے تجزیاتی ادب کا شاندار نمونہ ہے۔

۱۲۔ایک اچھا ادیب اور پختہ قلم کار بننے کے لیے مطالعہ کا وسیع وعمیق ہونا ضروری ہے۔مولانا وسعت معلومات، دقت نظر، تبحر علمی اور ذوق کتب بینی کے حوالے سے بھی بڑے ممتاز تھے۔وہ علم کی مختلف شاخوں پر گہری نظر رکھتے تھے، جدید وقدیم ہر طرح کی کتابیں ، اور مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے ہر نوع کے رسالے اور اخبار ان کی نظر سے گزرتے رہتے تھے۔مطالعے سے شغف کا یہ حال تھا کہ اگر کہیں جاتے اور وہاں کوئی اچھی لائبریری ہوتی تو کچھ وقت اس کو ضرور دیتے اور اپنی علمی تشنگی بجھاتے، یہی وجہ ہے کہ قدیم ندوی فضلا کی طرح ان کی تحریریں بھی’’علمیت وادبیت‘‘ کا حسین امتزاج رکھتی ہیں۔ یہاں ہم ایک شہادت نقل کرتے ہیں جو ان کے ایک شاگرد رشید نے اپنی تأثراتی تحریر میں ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد دی ہے۔**’’مولانا واضح رشید ندوی کون تھے؟‘‘** کے زیر عنوان ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:

’’وہ صرف روایتی علوم کا مطالعہ نہیں کرتے تھے؛ بلکہ کتابوں کے علاوہ عالمی شہرت کی حامل میگزین’’دی اکانومسٹ‘‘ کے ریگولر ریڈر تھے۔قومی انگریزی اخبارات کے علاوہ ’’دی ٹائم‘‘اور ’’واشنگٹن پوسٹ‘‘اور’’ نیویارک ٹائمس‘‘ کو پڑھتے تھے۔جو لوگ’’البعث الإسلامي‘‘ میں ان کے’’صور وأوضاع‘‘ نامی کالم کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، وہ واقف ہیں کہ مولانا اپنی تحریروں میں ان میگزینز اور اخبارات کا حوالہ اکثر دیا کرتے تھے... ان کی اسی وسعت مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ لکھنؤ کے اندر موجود’’ٹائمس آف انڈیا‘‘ کے ایڈیٹر ہمارے زمانے میں بعض مسلم معاملوں پر مولانا

سے مشورے کے لیے تشریف لاتے تھے''۔

۱۳۔زبان، ادب اور نقد: تینوں کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے؛لیکن ان تینوں میدانوں میں کامیاب سفر کرنا نصیبہ وروں ہی کا حصہ ہے۔ مولانا ان خوش نصیبوں میں تھے جنھوں نے تینوں میدان میں اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ مولانا خود فرمایا کرتے تھے کہ'' نقد وادب کو ایک ساتھ جمع کرنا کوئی آسان نہیں ہے، بہت کم ایسے ادیب ہیں جو اچھے ناقد بھی ہیں، اور بہت کم اچھے ناقد ہیں جو اچھے ادیب بھی ہیں ؛لیکن ان کی مثالیں ملتی ہیں''۔ مولانا کا تعلق انھی کمیاب لوگوں میں تھا جنھوں نے اپنی شخصیت میں نقدوادب کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جمع کرلیا تھا۔مولانا کی تحریروں میں نقد کا عنصر کافی نظر آتا ہے،انھوں نے بے راہ اور غلط افکار کے حامل ادبا پر بھی تنقیدیں کی ہیں، اور اقدار سے عاری ادب پر بھی ، مستشرقین اور ان کے مشرقی عقیدت مندوں کی بھی خبر لی ہے، اور مغربی تہذیب اور اس کے اخلاقیات پر بھی نشتر لگایا ہے؛لیکن ان کی ساری تنقیدیں'' حقیقت پسندانہ اور اصول تنقید'' پر مبنی ہیں۔ جب بھی تنقید کرتے تو اس میں ٹھوس دلائل، علمی وزن اور مومنانہ وژن ہوتا، وہ حق وانصاف کا دامن کبھی نہ چھوڑتے۔(۹) مغربی تہذیب پر ان کے نقد کے بارے میں ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ صاحب نے بالکل سچ لکھا ہے کہ وہ ''مغربی تہذیب پر یلغار آنکھ بند کرکے نہیں کرتے تھے۔جن میدانوں میں اہل مغرب نے حیرت انگیز علمی کارنامے انجام دیے ہیں، ان کے معترف تھے،صرف اتنا ہی نہیں ؛ بلکہ انھوں نے امریکہ کے سیاسی اور تہذیبی کردار کو بھی سراہا تھا۔نائن الیون کے بعد جب عالم اسلام پر امریکی یلغاریں شروع ہوئیں، تو انھوں نے اپنے کالم کے ذریعے امریکہ کو وہ ثبت رول یاد دلایا جو اس نے انسانی تہذیب کی بقا میں تاریخی طور پر ادا کیا تھا، انھوں نے کوسووا اور روانڈا میں امریکی کردار کو سراہا تھا.....البتہ وہ اس بات کے لیے امریکی نظام سے شاکی تھے کہ برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے والا، مہاجرین کی آبادی والا ملک جو اپنی تمثال آزادی پر بجا طور پر نازاں ہے، وہ بھی سامراجی اصولوں پر گامزن ہوگیا، اور کمزور قوموں کی دادرسی کے بجائے قتل وغارت گری اور پامالیِ حقوقِ انسانی کا مجرم بن گیا''۔(۱۰)

۱۴۔زبان وادب کے حوالے سے گفتگو کرتے وقت ایک نظر مولانا کی صحافتی زندگی پر ڈال لینا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے جدید صحافتی زبان وادب کا اک تعارف سامنے آتا ہے۔

مولانا کی عملی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے عربی سیکشن سے وابستہ ہوئے اور وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اخیر میں بحیثیت مترجم وانا ؤنسر علیحدہ ہوئے،تقریباً بیس سال تک اس پلیٹ فارم سے انھوں نے زبان وادب اور صحافت کی خدمت کی،اس دوران انھیں بہت سے عراقی، شامی ،مصری اور فلسطینی ادباء، ناول نگار، صحافی اور اصحاب قلم کی معیت حاصل رہی،اوران کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے رہے، جو وقت بچتا آپ راج بھون میں واقع'' مولانا آزاد لائبریری'' میں گزارتے اور اپنے مطالعے کو وسعت دیتے(۱۱) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا جدید عربی وصحافتی زبان اور انگریزی خبروں میں استعمال ہونے والی ان انگریزی اصطلاحات سے اچھی طرح واقف ہوگئے جو معرب ہوکر عربی میں استعمال ہوتی تھیں۔

جب ۱۹۷۳ء میں مولانا عربی ادب کے استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، اور پھر''صحیفہ الرائد'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے،تو مولانا ندوۃ العلماء کے ایک اہم مشن اور مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بنے۔ندوۃ العلماء ابتدا سے جدید وقدیم کے سنگم ہونے کا داعی رہا ہے،اوراس میں بڑی حد تک اسے کامیابی بھی ملی ہے؛لیکن جدید صحافتی زبان وادب کی حد تک ایک خلا محسوس کیا جارہا تھا، ندوۃ العلماء میں تشریف آوری کے بعد مولانا جدید زبان کی حد تک'' جدید وقدیم کا بہترین سنگم'' ثابت ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی آمد سے پہلے بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زبان وادب کی بڑی طاقتور اور مؤثر اسلوب میں خدمت کی جارہی تھی،عالم اسلام اور عالم عرب میں ''البعث

الإسلامی'' کی بڑی گونج تھی، ''الرائد'' کا بھی اپنا مقام تھا (۱۲)؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید ترین اصطلاحات سے ندوے کی فضا میں وہ واقفیت نہیں تھی جو مولانا کی آمد کے بعد پیدا ہوئی۔ ان کے آنے کے بعد الرائد کے اداریوں میں ایک نئی شان پیدا ہوئی، اس میں نئی صحافتی زبان کی جھلکیاں دکھنے لگیں، البعث الاسلامی کو بھی ایک نیا رنگ ملا۔ انھوں نے صحافت کے نئے اسلوب سے طلبہ کو روشناس کرایا، خبروں کو پیش کرنے کا سلیقہ سکھایا، تجزیہ نگاری کی مشق کرائی، اور اپنے فطری اور تجرباتی ذوق سے کام لے کر طلبہ کی ایک نئی ٹیم تیار کردی جو آج زبان وادب اور جدید صحافت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔ (۱۳)

خلاصہ یہ کہ دور حاضر میں زبان وادب کے حوالے سے مولانا جس بلندی پر فائز تھے، وہ ہر ایک کے لیے آسانی سے ارزانی نہیں ہوتی؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح کی علمی وادبی رفعتوں تک رسائی کے لیے ان تمام دشوار گزار مراحل سے گزرنا شرط اول ہے جن سے ''گہر'' بننے کے لیے'' قطرے'' کو گزرنا پڑتا ہے۔

حواشی :

(۱) تحقیق کا فن: ۲۱۶، ڈاکٹر گیان چند

(۲) ایضاً: ۲۲۷

(۳) مستفاد از: ادب اور گمنام ادیب: www.qalamkar.pk

(۴) حوالۂ سابق

(۵) تحقیق کا فن: ۴۳۲

(۶) حوالۂ سابق: ۲۴۵

(۷) دیکھیے: حوالۂ سابق: ۲۲۴

(۸) مولانا کے اسلوب تحریر کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

(الف) ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کے تعارف میں لکھتے ہیں: "كان عالماً متفتح الذهن، آتاه الله علماً واسعاً، وذكاء حاداً، وبديهةً حاضرةً، وأسلوباً مؤثراً نادراً فی الحوار والكتابة، وجرأةً فی الحق، وقدرةً علی التصدی للباطل، وقوةً فی الإيمان، ويقظةً فی الضمير".

(اعلام الادب العربی فی العصر الحدیث: ۲۰۹)

(ب) مصطفیٰ صادق الرافعی کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں: '' مصطفی صادق الرافعی أديبٌ راسخ لا يزل ولا ينحرف، وصيرفی حاذق ،كأن كلماته دنانير مصقولة ،يلفظ الدر وينفث السحر". (نفس المرجع: ۹۷)

(ج) سید قطب شہید کے بارے میں لکھتے ہیں: "بدأ حياته أديباً، ورفض لاتجاهه الإسلامی أن يبعث إلی أوربا بعد تخرجه رغم نبوغه، وحلق قطب فی سماء الأدب نجماً لامعاً:كاتباً مجيداً، وشاعراً مبدعاً ،وكاتباً منافحاً عن العقاد ضد الرافعی". (المرجع نفسہ: ۲۲۲)

(د) شیخ علی طنطاوی کے بارے میں لکھتے ہیں: "أديب العربية علی الطنطاوی من كبار الكتاب الذين أنجبتهم الأمة العربية فی القرن العشرين الميلادی،تجمع كتابته بين الرشاقة والجزالة، ومحاسن القديم والجديد، وتدل كتبه علی اقتداره علی اللغة وبلاغته فی التعبير، وأسلوبه –تصويراً وتعبيراً– يتسم بالشاعرية وخصوصاً فی وصف الطبيعة والأماكن المفتوحية ،فهو يأسرنا بالخيال الابتكاری البارع ،والكلمة الموحی ؟ النابضة". (نفس المرجع: ۲۸۵)۔

(۹) تفصیل کے لیے دیکھیے: من علّمنی ؟: ۷۸، بعنوان: "من علّمك الفكر الإسلامی؟" للدكتور محمد أكرم الندوی۔

(۱۰) مولانا کا اسلوب نقد دیکھنے کیلیے ملاحظہ فرمائیں: اِلی نظام عالمی جدید: ۶۴-۵۷، زیر عنوان: ''النصرانية فی عهد الظلام والنصرانية المعاصرة''۔ اس مضمون میں قدیم نصرانیت اور جدید نصرانیت کا موازنہ کرکے ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے، ساتھ ہی اسلامیات کے حوالے سے مستشرقین کے نظریے اور مقاصد پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

(۱۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: مجلۃ: الجیل الجدید، بعنوان: "حوار مع الأستاذ واضح رشيد الندوی"، العدد الثالث، المجلد الأول ،يونيو–ديسمبر ۲۰۱۸۔

(۱۲) البعث اور الرائد کے قائدانہ کردار اور مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے دیکھیے: تاریخ ندوۃ العلماء: ۲/ ۲۵۵، پرانے چراغ: ۱/ ۳۹۵، میر کارواں: ۴۴۱، الصحافۃ العربیۃ فی الھند: ۸۷

(۱۳) یہ تفصیلات ومعلومات مولانا سید سلمان حسینی صاحب ندوی دامت برکاتہم کے ایک انٹرویو سے اخذ کی گئی ہیں۔

☆☆☆

إلی نظام عالمی جدید-ایک تفصیلی مطالعہ

محمد غزالی ندوی
(استاد مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ)

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ ایک منفرد شخصیت کا نام تھا، انھوں نے کئی اہم میدانوں میں اپنی منفرد شناخت بنائی تھی، جس نے ان کی شخصیت کو کثیر الجہات بنادیا تھا۔ مولانا نے زبان وادب کے گیسوئے برہم کو بھی سنوارا ہے، اور صحافت وذرائع ابلاغ کی راہ سے بھی لائق ستائش خدمات انجام دی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی شرح وترجمانی، مغربی تہذیب کے خط وخال اور مستشرقین کے دجل وفریب کا جس طرح پردہ چاک کیا ہے، یہ چیز انھیں اپنے معاصرین میں منفرد مقام بخشتی ہے۔

اس مضمون میں مولانا کی ایک اہم کتاب ''إلی نظام عالمی جدید'' کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب مولانا کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو تیس سال کی مدت میں لکھے گئے، اور جن میں سے بعض الرائد میں اور بعض البعث الاسلامی میں چھپے۔ اور بعض مضامین کے اردو اور دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ مولانا کے علمی معاون مولانا محمد وثیق ندوی نے ان مضامین کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اُنہیں البعث الاسلامی اور الرائد کی پرانی فائلوں سے نکال کر اکٹھا کیا اور کتابی شکل دی جو تین سو ستائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کا تعارف خود مصنف کتاب نے ان الفاظ میں کرایا ہے ''یہ مضامین ان استعماری طاقتوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز اور منصوبہ بندی کے طریقے سے پردہ اٹھاتے ہیں جو ایک مدت تک اسلامی ممالک پر قابض رہیں، اور پھر اگر چہ بظاہر نکل گئیں؛ لیکن اب بھی حکام اور مغرب کے پروردہ طبقے کے ذریعہ وہاں انھیں کا تسلط ہے۔ بعض مضامین مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اُس میں پائے جانے والے عدم توازن کو بتاتے ہیں، جب کہ بعض اُن سازشوں کی بابت ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی گئیں۔ بعض مضامین میں اس بات پر بھی بحث کی گئی ہے کہ مغرب جس نظام پر خود چل رہا ہے اور دنیا کو چلانا چاہتا ہے، اگر دنیا اسی نظام کے تحت چلتی رہی تو اُس کا انجام کیا ہوگا''۔

کتاب حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی کے مبسوط مقدموں سے مزین ہے، جن میں کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف طاقتور اسلوب میں کرایا گیا ہے۔ اس کتاب کے خاص امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاضل مقدمہ نگار نے لکھا ہے:

''اس کتاب کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں تنقید سنجیدہ اور معروضی انداز میں کی گئی ہے جو مغربی تہذیب کے گہرے مطالعے پر مبنی ہے اور جس کے پیچھے ٹھوس علمی دلائل ہیں۔ کتاب کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے پرفریب رخ کو ہٹا کر اس کا اصل روپ دنیا کے سامنے لاتی ہے''۔

کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں مغربی تہذیب اور مغربی نظام زندگی کے تمام پہلوؤں اور کمزوریوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، دوسرے باب میں اسلام کو مغربی نظام کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ انسانی مسائل کا حل یہی ہے کہ انسان پھر سے اسلامی تعلیمات کی طرف لوٹے اور ایک خالص اسلامی معاشرہ وجود میں لایا جائے جو جدید سائنسی علوم سے بھرپور فائدہ اُٹھائے لیکن نظام زندگی کے سلسلے میں اسلام کی خوبصورت اور سدا بہار تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرے۔

پہلے باب میں پانچ فصلیں ہیں، پہلی فصل میں مغربی نظام کے

تضادات کو سامنے لایا گیا ہے۔ مغرب کے تضادات کو اقبال نے پہلے ہی بڑی خوبی سے ان اشعار میں سمویا ہے:

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
یورپ میں بہت روشنی علم وہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہیں یہ ظلمات

اس فصل کا پہلا مضمون موجودہ یورپ اور قرون وسطی کے یورپ میں مماثلت پر ہے، مولانا نے ثابت کیا ہے کہ وحشت وبربریت اور تاریکی کے جس دور سے یورپ قرون وسطی میں گزر رہا تھا، وہ دور پھر لوٹ آیا ہے، نئے عالمی نظام، New World order کے آنے اور امریکہ کی بالادستی کے ساتھ پھر سے ایک نئے سامراجی دور کا آغاز ہو چکا ہے، اقوام متحدہ کا کردار بالکل ختم ہو چکا ہے، اور اب ایسی کوئی طاقت باقی نہیں رہی جو ظالم کو ظلم سے روک سکے، دنیا پھر سے ایک یا دو طاقتوں کی مٹھی میں جا چکی ہے، قرون وسطی ہی کی طرح پھر سے دینی، قومی، اور نسلی تعصب کی حکمرانی ہے، بے گناہوں کا خون ارزاں ہے اور فضول بہانوں سے قوموں اور ملکوں پر جنگیں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ قرون وسطی کی طرح وحشت وبربریت اور درندگی کے مظاہر پھر سامنے آرہے ہیں، مثلاً پوری کی پوری بستیاں، کارخانے، اسپتال حتی کہ بچوں کے اسکول بمباری سے زمیں بوس کر دیے جاتے ہیں، بغیر کسی عدالتی کاروائی کے مدتوں کسی کو قید رکھا جاتا ہے، پوری پوری قوم کو اس کے عقیدہ وتہذیب سے دور کرنے اور اس پر خاص تہذیب وثقافت کو تھوپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

New World Order کے تعلق سے مولانا نے ایک انگریزی مقالہ نگار کا یہ قول حوالے میں پیش کیا ہے کہ یوں تو دنیا کے ممالک کی تعداد ۱۹۴ ہے؛ لیکن فی الحقیقت دنیا میں صرف ایک ملک ہے جو امریکہ ہے، بقیہ سارے ممالک اس ملک کے صوبے یا شہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں مولانا نے برطانوی اخبار گارڈین کا یہ تبصرہ بھی نقل کیا ہے کہ عراق کی جنگ میں جس بربریت اور دھوکے کا مظاہرہ کیا گیا، اس نے برطانوی امپائر کی یاد دلا دی، اور فلوجہ پر امریکی حملے کا تعاون کرنے کے لیے برطانوی فوج کی کمک ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ ہم پھر سے سامراجی دور کی طرف لوٹ رہے ہیں، جب عوامی بغاوت یا انقلاب کو پوری طاقت سے کچل دیا جاتا تھا۔

اس فصل کے دوسرے مضمون میں مولانا نے یہ دکھایا ہے کہ اگرچہ مغربی تہذیب کی ترقی کے بہت بلند دعوی کیے جاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یورپ ہی دنیا کی قیادت کر سکتا ہے؛ لیکن یورپ کی موجودہ صورت حال کو دیکھ کر کسی بھی طرح اس قسم کی خوش گمانی نہیں قائم کی جا سکتی، پھر مولانا نے تفصیل سے یورپ کی مختلف اقوام اور مختلف ملکوں کے مابین بلکہ بسا اوقات ایک ہی ملک کے باشندوں کے درمیان پائے جانے والے نسلی اور قومی تعصب اور سنگین نوعیت کے اختلافات کا تذکرہ کیا ہے پھر لکھا ہے کہ اگر یہ سب عناصر مل جائیں اور مضبوط ہو جائیں تو صرف عسکری طاقت یورپ کو نہیں بچا سکے گی، جس طرح وہ سویت یونین کو بچانے میں ناکام رہی۔

اس فصل کا ایک بہت ہی قیمتی مضمون "النصرانية فی عهد الظلام والنصرانية المعاصرة" ہے۔ اس میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ گرچہ یورپ اور مغربی دنیا کا یہ دعوی ہے کہ اُن کی حکومت کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، لیکن یہ صرف ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں، ورنہ مغربی حکومتوں کی سرپرستی میں ہی ہر جگہ لوگوں کو عیسائی بنانے کی مہم جاری رہی ہے، مغربی حکومتیں خود بے شمار مشنری منصوبوں کو فنڈ کرتی ہیں؛ ورنہ کم از کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ان کی فنڈنگ حکومت کی مدد سے ہی ممکن ہو پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مشنری اداروں کے پاس اپنے جہاز، ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن اور دنیا کے دور دراز تک پہنچنے کے وسائل حاصل ہوتے ہیں۔

مشنری اداروں کو حکومتوں کی طرف سے حاصل ہونے والے تعاون کے سلسلے میں مولانا نے بہت سے اعداد وشمار پیش کیے ہیں، ایک بہت واضح مثال لیبیریا کی دی ہے، وہاں کی مسلم اقلیت کو عیسائی بنانے کے لیے زبردست مہم چلائی گئی اس مقصد کی خاطر جبر واکراہ اور تشدد سے بھی گریز نہیں کیا گیا، اس کے لیے عالمی پیمانے پر منصوبہ بندی کی گئی؛ چنانچہ مجلس الکنائس العالمی نے لندن میں منعقد ہونے والے اپنے اجلاس میں لیبیریا کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ پاس کیا، ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں پینتیس ہزار مسلمان شہید کیے گئے، پانچ لاکھ مسلمان بے گھر ہوئے، سینکڑوں

مسجدیں شہید ہوئیں، اور تقریباً سو اسلامی مدرسے منہدم کر دیے گئے، یہ سب کچھ امریکہ کی آنکھوں کے نیچے؛ بلکہ اس کی زیر سرپرستی ہوا، چنانچہ خود امریکی وزیر خارجہ کالن پاول نے مشہور پادری بیلگراہم کو لیبیر یا میں مشنری سرگرمیوں کے تعلق سے بریفنگ کی۔

مولانا نے عالم اسلام میں مشنری سرگرمیوں کے بارے میں بڑے حیران کن حقائق پیش کیے ہیں، اور اس حوالے سے یورپین حکومتوں کی قلعی کھولی ہے، پھر لکھا ہے: یہ صورت حال عالم اسلام کے لیے بڑے خطرے کی گھنٹی ہے، اور مسلمانوں کو اس خطرے سے بچانے کے لیے سخت جد وجہد کی ضرورت ہے، اس مقصد کے لیے ایک طرف تعلیم اور میڈیا کا سہارا لینا چاہیے، اور دوسری طرف دعوت اور ذہن سازی کا طریقہ اپنانا چاہیے، اور عوام میں اس تعلق سے بیداری پیدا کرنی چاہیے۔

مغربی تضادات کے حوالے سے مولانا نے بنیاد پرستی کا بھی ذکر کیا ہے، کہ یہاں بھی مغرب کا دوہرا معیار نمایاں ہے، ایک طرف کوئی قوم یا جماعت اگر اپنے مذہب، اپنے اصول، اپنے عقائد اور اپنی تہذیب وثقافت پر سختی سے کاربند ہے تو مغرب اسے بنیاد پرستی کا نام دیتا ہے، لیکن جب وہ خود اپنے اصولوں، اپنی تہذیب وثقافت اور اپنے عقائد سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہیں رہتا؛ بلکہ دنیا کو بھی اپنی تہذیب کا پابند بنانا چاہتا ہے، تو اسے بنیاد پرستی نہیں سمجھتا ہے۔

اس حوالے سے مولانا نے دہشت گردی کی اصطلاح کا بھی ذکر کیا، جس میں مغرب کا دوہرا معیار صاف ظاہر ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ اس بات پر صریح دلائل اور دستاویزات موجود ہیں کہ امریکہ نے دنیا کے بعض بڑے قائدین اور ملکی رہنماؤں کو قتل کرنے کی سازش کی؛ لیکن مغرب اسے دہشت گردی نہیں سمجھتا، ہاں جس ملک پر امریکہ نے حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہو، وہاں کا حاکم اگر امریکی صدر کے قتل کی اپنے دل میں صرف تمنا کر لے، تو یہ چیز مغرب کی نگاہ میں دہشت گردی کہلاتی ہے، اس سے بھی زیادہ واضح مثال مولانا نے اسرائیل کی پیش کی ہے کہ اگر اسرائیل یا یورپ کا کوئی چھوٹا سا ملک ایٹمی اسلحہ حاصل کر لے تو اسے اس ملک کی دفاعی ضرورت قرار دے دیا جاتا ہے، اور اسے دنیا کے لیے خطرہ نہیں سمجھا جاتا؛ لیکن کوئی مشرقی ملک اگر ایٹمی اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے تو اسے دنیا کے لیے خطرہ باور کرایا جاتا ہے۔

دوسری فصل کے تمام مقالات کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ مغربی تہذیب درحقیقت تخریب و دہشت گردی کی تہذیب ہے، اس کے پہلے عنوان "أوربا مصدر ارهاب فی العالم" میں اس تعلق سے اچھی خاصی بحث کی گئی ہے، اور مثالوں اور دلائل سے یورپ کی دہشت گردی کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک مثال مولانا نے صہیونیت اور اسرائیل کی بھی دی ہے، کہ کس طرح اسرائیل کو یورپی طاقتوں نے عرب ممالک کے قلب میں ہزاروں عربوں کی لاشوں پر کھڑا کیا، اور کس طرح وہ لاکھوں عربوں کو بے گھر کر کے یورپ کے تعاون سے ایک ملک بنا، پھر کس طرح وہ آج ان ہی کے تعاون سے اپنی تمام دہشت گردانہ کاروائیاں انجام دیتا ہے۔

یورپین دہشت گردی کی دوسری مثال مولانا نے مسلم اکثریتی ممالک کی صورت حال سے دی ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ یورپ اسلامی داعیوں کو خود مسلم اکثریتی ممالک میں آزادی کے ساتھ کام نہیں کرنے دیتا، جو لوگ اسلامی نظام کا بول بالا چاہتے ہیں یا مغربی تہذیب سے اپنے اہل وطن کو دور رکھنا چاہتے ہیں، مغرب ان کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

چند مسلم ممالک میں ایک خالی الذہن انسان کو اسلام کی نقل وحرکت اور بعض اسلامی مظاہر دیکھ کر بادئ النظر میں جو غلط فہمی ہوتی ہے اس کا مولانا نے بڑی اچھی طرح ازالہ کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ یورپ اور دنیا کے بڑے ممالک ہر اسلامی ملک کی حکومت پر یہ دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ اسلام پسندوں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرے؛ تاکہ اسلام یورپین تہذیب کے لیے خطرہ نہ بن سکے؛ البتہ یہ پریشر ہر ملک کے لیے اس کی داخلی صورت اور وہاں کے رہنے والوں کا مزاج کے اعتبار سے الگ انداز کا ہوتا ہے، اگر تاریخی یا سیاسی اسباب کی بناء پر وہاں کے لوگوں کا اسلام سے رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے، اور اسلامی تہذیب وثقافت سے انھیں کاٹنا مشکل ہوتا ہے، تو ایسی جگہوں پر اسلامی دعوت اور داعیوں کے ساتھ بظاہر تعاون کی پالیسی اپنائی جاتی ہے، لیکن ان سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی ہے، جو مغربی تہذیب کو نقصان پہنچانے والی ہوں، یا مغربی استعمار کے مفادات کے خلاف ہو، یا جو مغربی فکر پر انحصار کے بجائے لوگوں میں فکری خود اعتمادی اور ہر طرح کی غلامی سے آزادی کا جذبہ پیدا کرتی ہو، اس کے برعکس جن ممالک میں اسلام

پسندوں کے ساتھ کسی طرح کے دکھاوے یا ظاہری صلح کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے، مغرب کی شہہ پر وہاں کے حکام اور اسلام کے داعیوں کے درمیان ہمیشہ کشمکش رہتی ہے، انھیں تبلیغ حق سے روکنے کے لیے دباؤ، پابندیاں، جیل اور الزامات سے لے کر نفرت انگیز مہم تک سارے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔

مغربی دہشت گردی کی ایک مثال مولانا نے یہ بھی پیش کی ہے کہ مغربی ممالک کے زیر سرپرستی دہشت گردی کے درپردہ ٹریننگ کیمپس ہیں جو دنیا بھر میں اس طرح کا ذہن رکھنے والوں کو ٹریننگ فراہم کرتے ہیں۔

مولانا نے ایک اور مثال کرایے کے فوجیوں اور قاتلوں کی دی ہے، مغربی ممالک خصوصا امریکہ، روس، برطانیہ اور جرمنی میں بے شمار ایسے ادارے ہیں جو کسی بھی ملک میں بحران پیدا کرنے کے لیے یا بڑی سے بڑی شخصیت کو قتل کرنے کے لیے اپنے افراد فراہم کرتے ہیں، یہ ادارے ہر ملک میں جرایم پیشہ افراد کو ٹریننگ دیتے ہیں، اور انھیں دہشت گردانہ کاروائیوں کے لیے جدید ترین سائنٹفک اور ٹیکنیکل مہارت سے لیس کرتے ہیں، اور کسی بھی مشن کے لیے ضروری آلات فراہم کرتے ہیں، اس طرح پوری دنیا پر ان کا خفیہ تسلط ہوتا ہے وہ جس دم چاہیں آن کی آن میں کسی بھی ملک میں ایسی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں، جس کے سامنے حکومت بے بس ہو جائے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ مغربی دہشت گردی کے الگ الگ انداز ہیں، وہ کبھی تو ان شخصیات کو قتل کرا دیتے ہیں جو یوروپین مفادات کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ بسا اوقات وہ حکومتوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے فسادات کراتے ہیں، یا اقتصادی بحران پیدا کر دیتے ہیں، یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے اس ملک کی علیحدگی پسند جماعت کو (اخلاقی وعسکری) امداد فراہم کرتے ہیں، اور کبھی حکومتی سطح پر اس طرح علانیہ دہشت گردی کی جاتی ہے کہ اپنے مطالبات منوانے، یا کسی ملک کی پالیسی تبدیل کروانے کے لیے اس ملک پر عسکری اور اقتصادی پابندیاں لگا دی جاتی ہیں، مغربی دہشت گردی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ بعض ممالک کو کمزور کرنے کے لیے آپسی اختلافات کو ہوا دے کر انھیں لڑا دیتے ہیں، مشرق وسطی میں ماضی قریب میں اس کی بدترین مثالیں سامنے آئی ہیں۔

مغربی دہشت گردی ہی کی ایک مثال کے طور پر مولانا نے ان دواؤں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہیں، ایسی بعض دواؤں کی فروخت پر امریکہ میں خود اندرون ملک تو پابندی ہے؛ لیکن ان کو امریکہ میں بنا کر دوسرے ممالک میں اکسپورٹ کرنے کی اجازت ہے۔

مولانا نے مغربی میڈیا کو بھی تخریب کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ میڈیا ترقی یافتہ ممالک میں ہونے والے ہائی ٹیک جرائم کو فلموں کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، اور آزاد ایجنسیوں کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ موجودہ دنیا میں ہونے والے جرائم کی ایک بڑی وجہ اسی طرح کی فلمیں اور سیریلز ہیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ مغرب ان تمام دہشت گردیوں کا سرچشمہ ہے، اس لیے جس نے بھی کہا ہے، سچ کہا ہے کہ اگر سمندر کی دو مچھلیوں کے درمیان بھی لڑائی ہو جائے تو سمجھ لو یا تو یہ انگریزوں کی شہ پر ہوا ہے یا پھر ان کی کسی حرکت کا نتیجہ ہے۔

تیسری فصل علم پر ہے، اس میں مغربی نظام تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مغربی نظام تعلیم میں علم آدمی کو انسان بنانے میں ناکام رہا ہے، اس نے مغربی انسان کے لیے مادی اسباب کی فراہمی کو تو آسان کیا ہے؛ لیکن اس کی روح کی غذا کا کوئی سامان نہیں کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مغرب کا انسان نہ صرف اخلاق کی اعلیٰ بلندیوں سے محروم ہے؛ بلکہ روحانی خلا اور نفسیاتی اضطراب کا بھی شکار ہے، وہ زندگی کی سچی خوشی سے محروم ہے، اسی لیے آسائش کے سارے اسباب کے ہوتے ہوئے وہ خودکشی کرتا ہے۔

اس فصل میں بتایا گیا ہے کہ مغرب کے نظام تعلیم میں چوں کہ صحیح تربیت اور خدا ترسی کا فقدان ہے، اس لیے مغرب علمی ترقی میں جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی دنیا کی محرومی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور دنیا پر جنگوں کے مہیب سایے منڈلاتے جاتے ہیں۔ مولانا کے الفاظ میں:

مهما ادعى حملة العلم، فان العلم اليوم وسيلة للتدمير والتزوير أكثر من كونه وسيلة التعبير الصحيح۔

مولانا نے مثال کے طور پر اسرائیل کا ذکر کیا ہے، جسے علم وتہذیب میں ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے، اس نے دوسروں کے ملک پر قبضہ کر کے اپنا وجود قائم کیا، ملک کے اصل باشندوں کو بے گھر کیا، وہ

اپنے عزائم کے حصول کے لیے سارے وحشیانہ طریقے استعمال کرتا ہے، بے گناہوں پر بم برساتا ہے، اور عالمی مطالبات کو ماننے سے یکسر انکار کرتا ہے، اور اس کے ان جرائم میں نوبل ایوارڈ یافتہ بڑے بڑے یورپین سائنس داں اس کے حامی ومؤید ہیں۔

مولانا نے دوسری مثال سویت یونین کی پیش کی ہے، جو سائنسی ترقی کے عروج پر تھا، اس نے پڑوسی ملک پر قبضہ کر کے دس لاکھ افراد سے زیادہ کو قتل کیا، چالیس لاکھ سے زیادہ لوگوں کو بے گھر کیا، اور کئی لاکھ لوگوں کے چہرے جھلسا دیے، اس ملک کے باشندوں کو خود ان کے وطن میں شہری حقوق سے محروم کیا، اور ان کی مرضی کے خلاف ایک مذہب اور نظریہ ان پر مسلط کیا۔ تیسری مثال برطانیہ کی ہے، جس نے اپنی سامراجیت کے دور میں مفتوحہ اقوام پر کیا کچھ ظلم نہیں کیے۔ چوتھی مثال امریکہ کی پیش کی ہے، اس نے ایٹم بم گرا کر لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، پھر ویتنام میں نہتے لوگوں کا خون کیا، اور آج بھی وہ، دہشت گرد اسرائیل کی مکمل سرپرستی اور تعاون کرتا ہے، نیز اُس نے ایران اور عراق دونوں کو خطرناک اسلحے فراہم کیے۔

ایک مثال مولانا نے فرانس کی بھی پیش کی ہے، جس نے دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کو صرف اس بات پر قتل کر دیا کہ وہ اپنے ملک الجزائر کا خود فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔

مغربی نظام میں علم انسان کو صحیح جہت دینے سے قاصر ہے، اس کی ایک مثال کے طور پر مولانا نے اُن مستشرقین کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے جان بوجھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں غلط بیانی کی اور جھوٹے پروپیگنڈے پر مبنی ایک ضخیم لائبریری تیار کر دی۔ اس سلسلے میں مولانا نے مستشرقین کے عجیب وغریب اقوال نقل کیے ہیں، مثلاً ایک مستشرق کہتا ہے کہ اسلام محض ایک تاریخی افسانہ ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اسلام میں جو خوبی بھی ہے وہ یونانیوں سے مستفاد ہے، تیسرا کہتا ہے کہ اسلام مذاہب سابقہ کی محض ایک نقل ہے۔ وغیرہ وغیرہ

چوتھی فصل میں مولانا نے اہل مغرب کا یہ امتیاز ذکر کیا ہے کہ وہ دنیا کو گمراہ کرنے کے لیے اصطلاحات سے کھلواڑ کرتے ہیں، اور انھیں بے جا استعمال کرتے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا نے خاص طور پر بنیاد پرستی اور آزادئ رائے کی اصطلاح کا تذکرہ کیا ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ آج بنیاد پرستی کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہے جو اسلام کی طرف از سر نو لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں؛ حالانکہ یہ خالص مسیحی اصطلاح ہے، جس کا خاص پس منظر اور تاریخ ہے۔ یورپ نے جب دین ومذہب کے خلاف بغاوت کی، اور وہاں کلیسا کا تسلط ختم ہوا، اور لادینی حکومتیں قائم ہوئیں، تو جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور کلیسا کے اقتدار کو پھر سے واپس لانے کی کوشش کی، اور پرانے کلیسائی نظریات کے خلاف جدید سائنسی نظریات کو رد کر دیا، ان کے لیے اس زمانہ میں بنیاد پرست کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا؛ لیکن دھیرے دھیرے اہل مغرب نے یہ لفظ اسلام پسندوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور اب صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ بنیاد پرستی کے خلاف جنگ کی آڑ میں درحقیقت اسلام کے خلاف جنگ کرنا مقصود ہے؛ لیکن دنیا کو گمراہ کرنے کے لیے یورپ اس جنگ کو بنیاد پرستی کے خلاف جنگ کا نام دیتا ہے۔

مولانا نے اس کے شواہد پیش کیے ہیں کہ بنیاد پرستی کی آڑ میں درحقیقت اسلام سے جنگ مقصود ہے، انھوں نے نیویارک یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر ہائیرڈ لیمہان کا یہ بیان نقل کیا ہے، جس میں اس نے اسلامی بنیاد پرستی کی مندرجہ ذیل علامات بتائی ہیں:

۱۔ پابندی سے مسجد میں پانچ وقت نماز ادا کرنا۔

۲۔ اسلام کے ارکان خمسہ: شہادت، نماز، روزہ، حج، زکوۃ کا اہتمام کرنا۔

۳۔ شراب اور ان جیسی دوسری چیزوں سے پرہیز کرنا جنھیں قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔

۴۔ قرآن اور اسلامی لٹریچر کا پابندی سے مطالعہ کرنا۔

۵۔ دینی تنظیموں کی سرگرمیوں میں حصہ لینا۔

۶۔ داڑھی بڑھانا اور مونچھ چھوٹی رکھنا۔

۷۔ مردوں اور عورتوں کا خاص حدود وقیود کے ساتھ کپڑا پہننا۔

لطیفہ کی بات یہ ہے کہ اس نے بعض الفاظ بھی ذکر کیے ہیں جسے اس کے بقول بنیاد پرست بہت استعمال کرتے ہیں، مثلاً: جاہلیت، توحید، کافر، اللہ کے دشمن، بدعت، طاغوت، ملحد، ضال، زندیق، حلال، حرام وغیرہ۔

پانچویں فصل میں فکری اور اقتصادی جنگ سے متعلق مضامین

ہیں۔اس فصل میں مولانا نے لکھا ہے کہ صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد یورپ جب عسکری میدان میں مسلمانوں کو زیر کرنے سے مایوس ہوگیا تو اُس نے فکری میدان میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔اُس نے اسلام کی شبیہ بگاڑنے کے لیے علم کا سہارا لیا،اور مسلمانوں کے دین ومذہب اور تاریخ وثقافت سے ان کا رشتہ کاٹنے کے لیے اسلامی موضوعات پر ایسی کتابیں لکھوائیں جن میں اسلام کی غلط تصویر پیش کی گئی تھی، اس کی تاریخ مسخ کیا گیا تھا، اور اسے جبر وتشدد کا مذہب باور کرایا گیا تھا۔اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، ایسی کتابیں لکھی جاتی رہیں، جنمیں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلام موجودہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا،اور مسلمانوں کی موجودہ پستی کا اصل سبب اسلام ہی ہے،۔

سامراجیت کے دور میں اس مقصد کی خاطر ان مشنری اسکولوں کا سہارا لیا گیا، جن کا جال پورے مسلم ممالک میں بچھا دیا گیا تھا،اور جن کے تعلیمی معیار کی وجہ سے بڑے بڑے گھرانوں کے بچے وہیں جاتے تھے،ان اسکولوں کے فارغین چونکہ مسلمانوں کا دماغ تھے، اس لیے بعد میں انھیں لوگوں نے زمام قیادت کو سنبھالا، اور انھوں نے مغربی مفکرین ومستشرقین سے جو سیکھا تھا، اسی کی روشنی میں ملک کے خطوط متعین کیے، اور داخلی وخارجی پالیسیاں بنائیں، یورپ نے ان لوگوں کے ذریعہ پورے عالم اسلام کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی، اس نے ہمیشہ چاہا کہ حاکم طبقہ اس کا تربیت یافتہ ہو جو اپنے ملک میں مغربی نظام تعلیم قائم کرے؛ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں ہمیشہ مغرب کو ہی اپنا مقتدا سمجھیں۔

مولانا نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کئی مفکرین کے اقوال نقل کیے ہیں، مثلاً مشنری تحریک کی ایک کارکن Anna miligan لکھتی ہے: ''اسلام کی روک تھام کے لیے ان (کانوینٹ) اسکولوں سے مختصر کوئی راستہ نہیں ہے، یہ اسکول ہماری سب سے بڑی طاقت ہیں، جنھوں نے نوجوان نسل کو عیسائیت کے زیر اثر کر دیا ہے، یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا حتی کہ انھیں اداروں کے فارغین اپنے اپنے ملکوں کے لیڈر رہوں گے''۔

ایک اور مستشرق H.I.R. Gibb کہتا ہے: ''ان (کانوینٹ) اسکولوں نے اپنے طلباء کے اخلاق کو تشکیل دیا ہے، انھیں خاص ذوق اور نظریہ عطا کیا ہے، اور انھیں یورپین زبانیں سیکھایا ہے، جن کے ذریعہ وہ یورپین افکار سے براہ راست استفادہ کرنے پر قادر ہوگئے ہیں، نیز ان چیزوں کا (عملی) اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہوگئے ہیں جو بچپن میں (تعلیم کے دوران لاشعوری طور پر) ان کے ذہنوں پر اثر انداز ہوئی تھیں''۔

مزید لکھتا ہے کہ: ''ہماری تعلیمی وثقافتی سرگرمیوں نے ماڈرن اسکولوں اور صحافت کے ذریعہ، مسلمان طلباء کو غیر شعوری طور پر بہت حد تک لادین بنا دیا ہے''۔

مولانا نے لکھا ہے کہ فکری یلغار کے میدان میں تعلیمی اداروں اور کانوینٹ اسکولوں کے علاوہ یورپ نے استشراق اور تبشیر کا سہارا لیا، جس کا مقصد لوگوں میں ان کے عقائد وادیان کے تئیں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے۔اس کے لیے مستشرقین کی پوری ایک جماعت ہمیشہ سرگرم عمل رہی ہے۔ اس کے علاوہ مشنری اداروں کی انسانی خدمات کو بھی مولانا نے فکری جنگ کا ایک حصہ بتایا ہے، نیز اسلام پر دہشت گردی کے الزام کو بھی اسی فکری جنگ کا حصہ کہا ہے۔

فکری جنگ کے علاوہ مولانا نے اس فصل میں اقتصادی جنگ کا بھی بہت تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب:

کتاب کا دوسرا باب دنیا کے دو بڑے سیاسی نظام کمیونزم اور سرمایہ داری کی کشمکش پر ہے، اس میں دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں بتایا گیا ہے کہ کمیونزم کے زوال کے بعد یورپین ممالک نے اسلام کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ اور اسے اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا، اور اس کی بیخ کنی کے لیے اپنی ساری طاقتیں جھونک دیں۔

دوسری فصل میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کو نہ کمیونزم بچا سکتا ہے اور نہ ہی سرمایہ داری۔ ان دونوں نظاموں نے تو انسان کی محرومی میں اضافہ ہی کیا ہے۔ دنیا کو سچی خوشی، امن وسکون اور چین واطمینان سے صرف اسلام ہی ہمکنار کر سکتا ہے۔اس فصل میں مغرب کو یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے دشمنی کا اپنا نظریہ تبدیل کرے اور اسلام کو قریب سے جاننے کی کوشش کرے؛ تاکہ وہ اس وہمی خوف اور فوبیا سے نکل سکے جس میں وہ جی رہا ہے۔

☆☆☆

مغربی افکار ونظریات پر مولانا واضح رشید ندویؒ کی تنقیدیں

محمد طارق رامپوری ندوی
(استاد مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ)

انسان کا ظاہر اس کے باطن کا پرتو ہوتا ہے، اس کی فکری ونظریاتی ساخت کا اس کی شخصیت کی تشکیل میں مرکزی کردار ہوتا ہے، اس کے افعال اس کے عقیدہ کی غمازی کرتے ہیں، اور انسان اپنے نظریات و افکار کا اسیر ہوتا ہے۔

قرآن کی عقیدہ سے متعلق بے شمار آیات اور نبی اکرم ﷺ کی فکری وشعوری تربیت پر بے پناہ توجہات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انسان کو اگر بدلنا ہو تو پہلے ذہن و دماغ میں اٹھنے والے خیالات کی لہروں کو سمجھنا اور تبدیل کرنا ہوگا، افراد کی طرح قوموں کا عروج وزوال بھی ان کے عقیدے اور افکار ونظریات سے مربوط ہوتا ہے، یہی وہ نکتہ ہے جس کو مغرب نے صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد دریافت کر لیا تھا، اور پھر انہوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے عسکری یلغار کے ساتھ فکری یورش بھی بڑی شدومد کے ساتھ کی تھی۔

یہی سرد جنگ اور نظریاتی حملہ ہے جس کا امت مسلمہ کو تقریبا دو صدیوں سے سامنا ہے، اسی فکری یلغار نے ملت اسلامیہ کو اندر سے کھوکھلا، ان کے ایمان کو پژمردہ، اور حواس کو مضمحل کر دیا ہے۔

اس نازک وقت میں اس فکری یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا، اس سرد جنگ سے برسر پیکار ہونا ہی تجدیدی اور مفکرانہ کام ہے۔

ماضی قریب میں جن شخصیات نے اس تجدیدی مہم کے لئے اپنی تحریروں کو وقف کیا ہے، ان میں ایک اہم نام حضرت مولانا محمد واضح رشید الحسنی کا بھی ہے، اسی وجہ سے مولانا کو مفکر اور مجدد کے لقب سے یاد کرنا بے جا نہ ہوگا، مغربی نظریات پر کاٹ دار تنقیدیں، آپ کی تحریروں کا خاصہ تھیں، البعث الاسلامی اور الرائد کے مضامین اس بات پر گواہ ہیں کہ مولانا کا یہ نظریہ تھا کہ جب تک امت مغربی نظریات کے فکر وفن سے بنے ہوئے جال سے باہر نہیں نکلے گی اور اسلامی فکر و نظر کے رنگ میں نہیں رنگے گی، اس وقت تک امت میں اٹھنے والی کوئی بھی بہار یہ بہار نہیں لاسکتی، اور انقلاب کی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

مغربی نظریات کی بنیادیں:

مغربی نظریات کے حوالے سے مولانا کا بالکل واضح موقف تھا کہ کہ اس کا خمیر یونانی فلسفہ سے اٹھا ہے، اور ارسطو وافلاطون کی فکر سے مستعار ہے، مغرب لاکھ اس بات کا دعوی کرے کہ موجودہ مغربی نظریات کا یونانی مکتبہ فکر سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس کا یہ دعوی درست نہیں ہے، کیوں کہ رنگ ونسل کی بنیاد پر ترجیحی نظریہ، گورے کا کالے پر تفوق اور دنیا کو عشرت کدہ اور عیش کی جگہ سمجھنا، یہ وہ نظریات ہیں جو یونانی فلسفہ کی طرح مغربی نظریات کی اساس ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے خیالات سے بغاوت کے باوجود آج کا مغربی مفکر اپنے نظریہ کو ارسطو کی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

مغربی نظریہ کا تشکیلی دور:

پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں فلسفہ اور پاپائیت کی ایک خون ریز جنگ ہوئی، جس میں فلسفہ کو فتح اور پاپائیت کو شکست فاش ہوئی، ان حالات میں مذہب بیزار ایسی شخصیات نے جنم لیا جن

کے ملحدانہ افکار کے ملغوبہ سے موجودہ مغربی نظریات کا خمیر تیار ہوا۔

ڈیکارت نے خدا بیزار آزادانہ تحقیق کی داغ بیل ڈالی، نیوٹن نے روشی اور حرکت کے قوانین کا انکشاف کر کے یہ تاثر عام کیا کہ جیسے اب نظام کائنات کو چلانے کے لئے کسی خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں، جون لوک نے انسان کو آزادی وحریت کا نشہ اس طرح پلایا جس کی وجہ سے انسان دینی حدود قیود سے دست بردار ہوگیا، ہیوم نے انقلاب اور ہر قدیم سے بغاوت کا نعرہ اس طرح لگایا کہ اخروی زندگی کا عقیدہ غلط قرار پایا، ڈارون کے نظریے نے تو مذہب کے اثرات کو دل و دماغ سے کھرچ ڈالا، بالآخر ایک ایسا معاشرہ تیار ہوا جس کو انسانوں کا معاشرہ کہنا انسانیت کے ماتھے پر داغ ہے۔

وہ زمانہ گذر گیا مغرب اور موجودہ عیسائیت جس میں مغرب نے عیسائیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اسے باہر کا راستہ دکھلایا دیا تھا، لیکن اس کے بعد دونوں میں صلح ہوگئی، اور نصرانیت کو مغربی افکار کی ترویج اور سیاسی استحکام کے لیے آلہ کار بنالیا گیا، یہ سمجھنا نادانی ہے کہ عیسائیت کے جراثیم مغرب سے نکل چکے ہیں، اور مغربی مفادات کا عیسائیت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

بلکہ حق بات یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنا چولا تبدیل کر لیا ہے، اور مغربی ممالک کی امداد و نصرت کے بل بوتے پر عیسائی مشنریز افریقہ اور ایشیاء میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، اور مغربی افکار کی ترویج میں اہم رول ادا کر رہی ہیں، مغربی سرمایہ داروں اور حکمرانوں کی سرپرستی میں مشنریز کے ماتحت چلنے والے اسپتال، کالجز واسکول اور امدادی وخیراتی ادارے مغربی نظریات کو فروغ دے رہے ہیں۔

مغرب کے تباہ کن نظریات:

ان نظریات سے مکمل آگاہی امت کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ناگزیر ہے جن کے سہارے مغرب نے عالم اسلام پر اپنا شکنجہ کسا ہوا ہے، اور ان کی تہہ میں جا کر ان کے مضمرات کو سمجھنا لازمی ہے، مولانا نے براہ راست مغربی مصادر کا بہت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا تھا، اور ان کے تباہ کن اثرات کو جان لیا تھا، اس لیے اپنی مختلف تحریروں میں ان نظریات کا تعاقب کیا تھا۔

قومیت و وطنیت:

عالم اسلام پر جس نظریہ نے سب سے زیادہ تباہ کن اثرات مرتب کیے ان میں قومیت کا نظریہ سرفہرست ہے۔ قومیت کی تحریک اٹھارہوں اور انیسویں صدی میں فرانس کے اندر اٹھنے والی وہ تحریک ہے جس نے قدیم فرسودہ نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے فرد کی آزادی کی راہ ہموار کی۔ اور جمہوریت کی آمد کو آسان بنا دیا۔

اس زمانہ میں عالم اسلام کی وہ نسل جو یورپ میں زیر تعلیم تھی، وہ اس تحریک سے متاثر ہوئی اور اس نے واپس آ کر اس تحریک کو شروع کیا ہے، سب سے پہلے ترکی کے نوجوانوں نے صرف ترکی کے مفادات کے پیش نظر نوجوانانِ ترکی کے نام سے ایک پارٹی بنائی، اس تحریک نے بالآخر عثمانی خلافت کی قبا کو تار تار کر کے ایک دین بیزار حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے پورے ترکی کو الحادی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف عالم عرب میں عرب قومیت کے نام پر قومی اور وطنی تحریکات وجود میں آئیں، جس کے نتیجہ میں عرب وعجم کی تفریق کی گئی، ملت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ اور عالم عرب کا اسلام سے رشتہ کمزور ہوگیا، اور عرب کو عالم اسلام سے کاٹ دیا گیا، اور یہ نعرہ لگایا گیا کہ مذہب اور مشرقی اقدار ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اصل نقطۂ وحدت ہمارا عرب ہونا ہے، چاہے ہم یہودی ہوں، عیسائی ہوں، یا مسلمان۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس تحریک کی سرپرستی در پردہ عرب کے نصاری کر رہے تھے، اور وہی علمی اور مادی مواد فراہم کر رہے تھے، عالم اسلام کے حصے بخرے کرنے میں اس تحریک نے بڑا کردار ادا کیا ہے،، اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، کردستان اور بلوچستان کی قومی تحریکات در حقیقت اسی نظریہ کا امتداد ہیں۔

سیکولرزم:

مذہب کو انسانوں کے اجتماعی نظام جیسے سیکولرزم، سیاست، معیشت اور معاشرہ سے خارج کر دینا سیکولرزم کہلاتا ہے، سیکولرزم کے مطابق دین انسان کا انفرادی معاملہ ہے، اس کا اجتماعی معاملات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، اس لفظ کو عالم اسلام میں ایک پاکیزہ نعرہ بنا دیا گیا، اسلام کے خلاف اس کو ہتھیار کے طور پر

استعمال کیا جارہا ہے، اور مغربی نظریات کو فروغ دیا جارہا ہے، تاکہ کوئی اسلام پسندوں کی حکومت کسی بھی ملک میں نہ آسکے، اسلامی قوانین نافذ نہ ہوسکیں، مغرب کی نگاہ میں سیکولر وہی ہے جو اس کی اندھی تقلید کرے، اس کے رنگ میں رنگ جائے، اس نظریہ کے اثرات عالم اسلام میں کچھ اس طرح رونما ہوئے کہ اسلامی عقائد اور مشرقی اقدار کا مذاق اڑایا جانے لگا، اور قرآن وحدیث کی نسبت سے شکوک وشبہات کے کانٹے بوئے جانے لگے، اور اسلامی شخصیات کو طعن وتشنیع کا ہدف بنایا جانے لگا۔

مولانا واضح صاحب کے نزدیک سیکولرزم کا یہ وہ رخ ہے جو عالم اسلام میں نظر آتا ہے، لیکن یورپی اور دیگر جمہوری ممالک میں اس نعرہ کو نصرانیت کی ترویج کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، اور اس کو بنیاد بنا کر مقامی نصرانیوں کے لیے اقتدار تک پہونچنے کی راہ ہموار کی جارہی ہے، اور مشنریز کو کھلی آزادی کے ساتھ مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرنے کا موقع فراہم کیا جارہا ہے، یہ مغرب کا وہ دوغلا پن اور منافقانہ رویہ ہے، جس سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

آزادی:

لفظ بہت خوبصورت ہے، لیکن اس کا مفہوم بہت خطرناک ہے، یہ نعرہ کتنا خوشنما لگتا ہے کہ انسان آزاد ہے، لیکن باطل طاقتوں نے اس کا استعمال جس طرح کیا اس سے انسان مقید بن جاتا ہے، آزادی کا تو اسلام بھی قائل ہے، لیکن اس کے کچھ حدود ہیں، تاکہ فرد معاشرہ کے لیے مفید بن سکے، مغرب نے یہ نعرہ مغربی نظریات کی زنجیر میں انسان کو جکڑنے کے لیے استعمال کیا ہے، اسی وجہ سے آزاد وہی ہے، جو مغربی اقدار کا اسیر ہو، اور جو اپنی مرضی سے اسلامی عقائد کا حامل ہو، اسے بنیاد پرست کہا جارہا ہے۔

مولانا نے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح ایک ملک میں عوام کی آزادی کے خلاف فوجی ڈکٹیٹرشپ قائم کرکے اور ملوکیت کو رواج دے کر مغربی مفادات کا تحفظ کیا جارہا ہے، اور مذہبی تحریکات کو کچلا جارہا ہے، اس لیے صرف یہ کھوکھلا لفظ ہے، اصل مقصود مغرب کا تسلط ہے۔

نظریۂ ارتقاء:

الحاد اور خدا کے انکار کے سلسلہ میں جس نظریہ نے سب سے زیادہ علمی مواد فراہم کیا وہ ڈارون کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ نے مذہب سماجی اقدار اور اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا، ڈارون کی اس تھیوری کے اعتبار سے انسانی زندگی کا آغاز ایک خلیہ سے ہوا، جو وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مختلف مراحل سے گذرتا ہوا، بندر کی شکل اختیار کرتا ہوا موجودہ انسان بنا، اس نظریہ نے حقیقت آدم وحوا کو قصہ پارینہ بنا دیا، روح کو بے معنی قرار دے دیا، انسان کو صرف ایک مادی مخلوق بنا دیا، اور پھر اسی نظریہ سے طاقتور ترین کی بقا (Survival of the fithest) کے نظریہ نے جنم لیا جس کے نتیجہ میں دوسروں کو کچل کر آگے بڑھنے کی فکر کی ترویج ہوئی، اور دنیا مقابلہ کی آماجگاہ بن گئی (Life is a race) اسی نظریہ کو بنیاد بنا کر فرائڈ Fried نے انسان کے اندر جنس کی جبلت کو اصل قرار دے دیا، اور پھر پوری دنیا میں فحاشی اور شہوت پرستی کی لہر آگئی، اور اسی نظریہ ارتقاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ضابطہ، اخلاق اور فلسفہ اخلاق کو مسخ کر دیا گیا، اور یہ کہا جانے لگا کہ اخلاق کے معیارات زمانہ کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، اور پھر ہم جنس پرستی، زنا کاری، جوا اور شراب نوشی جیسے جرائم اخلاقی قدروں کا حصہ قرار پائے اور معاشرے میں ان کو پرموٹ کیا جانے لگا۔

مولانا نے لکھا ہے کہ نظریۂ ارتقاء کی بنیاد کوئی ٹھوس سائنٹفک اصولوں پر نہیں تھیں، بعد کے بے شمار سائنس دانوں نے اس نظریہ کو رد کیا، اور اس پر اشکالات اٹھائے، لیکن یہ آوازیں صدا بصحراء ثابت ہوئیں، کیوں کہ نظریہ ارتقاء کی ترویج کی پشت پناہی یہودی لابیاں کررہی تھیں تاکہ پوری دنیا کو فحاشی کی دلدل میں پھانس کر ایک نئے عالمی نظام کے شکنجہ میں انسانوں کو کسا جاسکے، اور دجال کی آمد کی مکمل تیاریاں کی جاسکیں۔

مولانا کے نزدیک جب ان نظریات اور ان کے پیچھے چھپے سازشی دماغوں سے واقفیت نہیں ہوگی اس وقت تک اصلاح کا بیڑا اٹھانا مفید نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے مولانا مدارس دینیہ اور عصریہ کے نصاب میں مغربی فلسفہ کو داخل کرنا لازم سمجھتے تھے۔

☆☆☆

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ اپنے افکار کے آئینہ میں

محمد پاشا ندوی
(استاد مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ)

انسان پیدائشی طور پر عظیم اور کامیاب نہیں ہوتا، بلکہ اس کو عظیم اور کامیاب بنانے ، اس کی شخصیت کی تعمیر، اس کے مزاج و مذاق کی تشکیل، اس کے فطری جوہر چمکانے اور اس کی منزلِ حیات متعین کرنے میں جہاں ایک طرف اس کے گرد و پیش، حالاتِ زندگی کے نشیب وفراز اور پھر اس سے حاصل ہونے والے تجربات، مختلف افکار ونظریات، اخلاقی وسماجی و مذہبی اقدار وروایات اثر انداز ہوتے ہیں، وہیں دوسری طرف اس کی شخصیت کے بنیادی عناصر کی تشکیل میں اس کے خاندان، قریبی اجداد اور گھریلو تربیت اہم کردار ادا کرتی ہیں. وہ نسلی طور پر جن خصائص، واوصاف و کمالات، خاندان کی اقدار و روایات، افکار ونظریات اور اباء و اجداد کے قابلِ قدر کارناموں کا مشاہدہ کرتا ہے، اس سے وہ لامحالہ متاثر ہوتا ہے، اور آگے چل کر اس کے اثرات اس کے طرز عمل، اس کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں نظر آتے ہیں، اور ان کا رنگ اس پر ہمیشہ واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے. وہ افراد جن کی تربیت دینی ماحول مذہبی طرزِ معاشرت، صالح افکار، اعلی اخلاق، اوصافِ حمیدہ، نگاہ کی بلندی، سخن کی دلنوازی جیسی صفات پر ہوتی ہیں تو یہی صفات اس کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر اور اس کی صورت گری کرتی ہیں۔

مولانا سید واضح رشید ندویؒ نے ایسے خانوادہ میں آنکھ کھولی جو عرصہ دراز سے علمی و دینی میدان میں مسلسل خدمات انجام دیتا رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ اس کی پوری تاریخ مصلحین، مجددین، مصنفین، اولیاء، صوفیاء، داعیان اور انکے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے روشن رہی ہے۔ شیخ الاسلام قطب الدین مدنی، قاضی سید احمد نصیر آبادی، سید محمد اسحاق، سید شاہ علم اللہ، تحریک اصلاح و جہاد کے سرخیل حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ ضیاء النبی جیسی عظیم شخصیات اس خانوادے کی اہم کڑیاں رہی ہیں(۱) ۔پھر آخری دور میں مولانا عبدالحی ، ڈاکٹر عبدالعلی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسی علمی ، دینی و اصلاحی شخصیات نے اس خاندان کا نام روشن کیا۔ مولانا سید واضح رشید ندویؒ کی سیرت کی تعمیر میں جہاں خاندانی پس منظر اثر انداز ہوا، وہیں دوسری طرف سازگار ماحول صاحبِ ذوق وصاحب فکر معلم ومربی کی حیثیت سے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی تربیت ،محبت ،شفقت اور علمی، دینی وادبی رہنمائی فراہم ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی اصلاحی ودعوتی سرگرمیوں اور تجدیدی کارناموں کو قریب سے دیکھنے اور ان سے استفادہ کا موقع ملا، ان کی تحریروں وتقریروں اور ان کے اصلاحی ودعوتی اسفار سے تجربات حاصل ہوئے، مولاناؒ سے ایک لمبی مدت تک علمی وفکری استفادہ کا موقع فراہم ہوا۔ مولاناؒ موصوف کی ذاتی محنت، شوقِ طلب، والہانہ جذبہ عمل اور لگن نے ان کو ایک کامیاب قلمکار صحیح الفکر اسلامی صحافی اور مفکر کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا۔

مولانا واضح رشید ندویؒ نے دانشگاہ علم و ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علوم شریعہ میں مہارت، زبان کی خوبیوں اور نزاکتوں سے واقفیت، فکر اسلامی کی صحیح تشریح، باطل افکار ونظریات پر گہری نظر اور محتاط ومتوازن ومنصفانہ نقد وتبصرے کا سلیقہ حاصل کیا۔ آپؒ اردو

وعربی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے اور مغربی مصادر ومراجع پر آپؒ کی گہری نظر تھی.

تحریریں فکر کی آئینہ دار ہوا کرتی ہیں:

کسی بھی صحافی، ادیب، مفکر و دانشور کی تحریر اس کی فکر اور اس کے نظریات کی سچی عکاسی کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں، اس کی ظاہری و باطنی کیفیات اور اس کے افکار ونظریات کا عکس ہوتا ہے۔ اسی طرح جہاں ایک طرف اس کے علم وادب، ثقافت وتہذیب کی جانکاری ملتی ہے وہیں دوسری طرف اس کے اردگرد کے ماحول، ملک و بیرون ملک کے مسائل، چیلنجز اور اس سے متعلق اس کے احساسات و جذبات اور اس کے موقف کا علم ہوتا ہے۔

مولاناؒ کی تمام تحریریں ان کی فکر کی سچی آئینہ دار ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ان کی فکر کی بلندی، رائے کی صلابت، علمی وفکری وزن کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی تحریروں سے عالم اسلام کے حالات، صلیبی واستعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا علم ہوتا ہے۔ آپؒ کا اسلوب بیان دانشورانہ ومنطقی اور تجزیاتی ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب کی زہرناکی، اس کے نت نئے فتنے اور چیلنجز، عالم اسلام پر مغرب کی فکری وثقافتی یلغار، مغرب کا اخلاقی دیوالیہ پن اور اس کا حل آپؒ کی تحریروں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

آپؒ کی تحریروں کا امتیاز یہ ہے کہ اہم سے اہم اور نازک موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں تو دیانت، غیر جانبداری اور علمی انداز کو بدرجہ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ مولاناؒ کی تحریریں جہاں ایک طرف بڑی مستند، معلومات سے پر اور مدلل ہوتی ہیں وہیں دوسری جانب جذباتی اسلوب سے پاک، نہایت سنجیدہ اور دعوتِ فکر دینے والی ہوتی ہیں.

فکری مصادر:

انسان فطری طور پر متاثر واقع ہوا ہے وہ جن کتابوں کو پڑھتا ہے یا جن شخصیات سے ملاقات یا استفادہ کرتا ہے یا جن تحریکات یا اداروں سے عملی یا روحانی طور پر وابستہ ہوتا ہے اس کا رنگ اس کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

مولاناؒ کے فکری مصادر "قرآن و سنت":

''قرآن وسنت'' شریعت کے دو بنیادی مآخذ ہیں جو دین کی اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں چیزیں رشد و ہدایت، دعوتِ فکر وعمل کے لئے نہایت ضروری ہیں. ایک داعی، مفکر و مصلح کی تمام تر کاوشیں اور افکار ونظریات اگر قرآن وحدیث سے مستفاد ہیں تو قابل قدر ولائق اعتبار ہیں اور اگر اس کی فکر میں قرآن وحدیث سے تعارض پایا جاتا ہے تو فکری اضطراب کے مرادف ہوگا. مولاناؒ کے فکری مصادر میں اولین درجہ قرآن وحدیث کا تھا۔ مولاناؒ کی تمام تحریروں میں قرآن وحدیث کا نمایاں عکس نظر آتا ہے گویا کہ آپؒ کی فکر کی آبیاری قرآن وحدیث سے ہوئی ہے۔ مولاناؒ کے تمام مضامین کے مجموعوں اور تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو قرآن وحدیث کا رنگ غالب نظر آتا ہے. ''مسئلہ فلسطین سامراج اور عالم اسلام''، ''محسن انسانیت''، ''نظام تعلیم و تربیت اندیشے تقاضے اور حل''، ''اسلام مکمل نظام زندگی حدیث کی روشنی میں'' وغیرہ تمام تحریروں میں جابجا قرآن وحدیث سے استدلال موجود ہے. مولاناؒ کی تحریر میں قرآن کی فکر اور اس کی آفاقیت کا عکس یوں نظر آتا ہے۔

''انسانی حقوق وصلاحیتیں جو انسانی زندگی کے فطری تقاضوں کے لحاظ سے ہونی چاہئیں، ان کو انسان کے خالق و مالک سے زیادہ کون جان سکتا ہے، لہذا قرآن مجید میں صرف عبادت ہی کی ہدایت نہیں دی گئی ہے، بلکہ انسان کے اور اس کے خالق کے مابین جو تعلق اور ربط ہوسکتا ہے، اس کے لئے انسانوں کی فطری حالت وصلاحیت کا لحاظ رکھتے ہوئے زندگی کے تمام عقائد اور اعمال کے سلسلہ میں ایسی رہنمائی کی گئی ہے جس میں انسانی زندگی کے تقاضے اور ضرورت کا پورا احاطہ گیا ہے''(۲)۔

مولاناؒ کی فکر میں حدیث کی آفاقیت:

مولاناؒ کا ایک مکمل رسالہ عربی میں ''مختصر الشمائل النبویۃ'' موجود ہے دوسرے مولاناؒ کی ایک اور کتاب ''اسلام مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں'' مولاناؒ کی فکر میں حدیث کی آفاقیت واضح طور پر موجود ہے۔ مولاناؒ نے اس میں دین کی صحیح اور جامع تصویر کشی کی ہے، زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حدیثوں کا ایک مجموعہ پیش کیا ہے

اور یہ پیغام دیا ہے کہ جب تک زندگی کے تمام اعمال میں رسول پاک ﷺ کی زندگی والا اعتدال وتوازن نہ ہوگا تو معاشرہ میں دین کے تمام پہلوؤں پر عمل کا مزاج نہیں بنے گا اور امتِ مسلمہ مزید انحطاط وتنزلی کا شکار ہوتی رہے گی، مولانا فرماتے ہیں: ''اس عہد کا اصل مرض اسلام کی من مانی تشریح اور عمل میں عدم توازن یا جزوی عمل ہے اور یہی اس عصر کا مرض اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب ہے'' مزید فرماتے ہیں: ''سورہ مائدہ کی آیت پر غور کر کے میرے ذہن میں ایک نقشہ آیا جو قرآن کریم کی آیت سے ماخوذ ہے" الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء توتی اکلها کل حین باذن ربها".

میں نے اسلام کو ایک درخت تصور کیا پھر اس کی تعلیمات کو جو زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ہیں شاخیں تصور کیا، اور اس کے مطابق ان حدیثوں کو جمع کیا جو زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق ہیں، اب اگر ان سارے شعبوں کو جمع کیا جائے اور اسلام کامل وجود میں آجائے تو اس کی مثال اس شجر کی ہوگی جو ہر دور میں خدا کی مدد سے پھل دے گا اور "توتی اکلها کل حین باذن ربها" کا مصداق ہوگا.

اس دور میں ہماری کوششوں اور اسلامی تحریکات کی ناکامی کا سبب اسلامِ کامل کا نمونہ پیش کرنے میں کوتاہی ہے۔ اسی لیے ہم نے چالیس احادیث کا انتخاب اسی تصور کی بنیاد پر کیا ہے (۳)۔ اس نمونہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولاناؒ کی فکر کی اصل ابیاری قرآن کے بعد حدیث سے ہوئی اور آپ کی فکر کا اصل منبع وسرچشمہ قرآن و حدیث ہے اس کے علاوہ اس کی غلط تشریح کو مولانا مرحوم نے فکری انحراف سے تعبیر کیا ہے.

تحریک سید احمد شہید اور مولانا کی فکر پر اس کے اثرات: مولانا واضح رشیدؒ نے نسلی طور پر خانوادۂ سید احمد شہید میں آنکھ کھولی ہی تھی اسی کے ساتھ مولاناؒ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولاناؒ فکری طور پر تحریک سید احمد شہید سے کس قدر ہم آہنگ تھے اور یہ تحریک ان کے افکار کا سرچشمہ تھی چنانچہ ''علمی وفکری بیداری اور ایک نیا تحقیقی ذوق اور فکری جمود کا خاتمہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں جو اس تحریک کا کارنامہ ہے مولاناؒ کی تحریروں میں جھلکتا ہے (۴)۔

جس طرح سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بیرونی اقتدار کو محسوس کیا، اور ان کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کی کوشش کی، اسی طرح مولاناؒ نے مسلمانوں پر غیروں کی فکری یلغار کو محسوس کیا اور اپنی تحریروں سے اس کی زہرناکی کو بیان کر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اس سے آزادی دلانے کی کوشش کی، سید احمد شہید نے غیروں کے تسلط کو بزور بازو ختم کیا تو مولانا نے اپنے قلم سے مغرب کی فکری یلغار کا آگے بڑھ کر مقابلہ کیا۔ مولانا کی تحریریں ''الغزو الفکری''، ''الی نظام عالم جدید''، ''من صناعة الموت الی صناعة القرارت'' واضح طور پر اس پر دلالت کرتی ہیں۔

گویا کہ مولانا کی عقیدہ کی پختگی، فکری توازن واعتدال، امت مسلمہ کے تئیں اصلاح کا جذبہ، دعوت فکر وعمل، علمی وفکری بیداری جیسی تمام صفات تحریک سید احمد شہید کا ہی ثمرہ ہیں. مولاناؒ نے سید احمد شہید پر ایک کتاب عربی میں تحریر فرمائی ''الامام احمد بن عرفان الشہید''.

سید احمد شہیدؒ کی شخصیت اور اس کی آفاقیت پر مولاناؒ یوں رقمطراز ہیں: ''امام سید احمد بن عرفان شہیدؒ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نابغہ روزگار شخصیت رہی ہے، آپؒ گوناگوں اوصاف وکمالات سے متصف تھے، شجاعت و جواں مردی، ہمت وحوصلہ، باطل طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ، امت کو اس کی غفلت سے بیدار کرنا اور الحاد کی بیخ کنی کرنے جیسی صفات سے مالا مال تھے۔ آپؒ کے اندر سلف صالحین کی امتیازی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ نے اپنے زمانے کے سخت ترین حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ تعلیم وتربیت، دعوت وتزکیہ کے موثر طریقہ سے زمانہ کے مختلف مسائل کو با آسانی حل کیا۔

آپؒ ایک کامیاب معلم ومربی، داعی ومصلح، سنت کو زندہ کرنے، بدعات وخرافات اور غیر اسلامی رسوم رواج کی بیخ کنی کرنے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد کرنے والے تھے۔ آپؒ کی شخصیت نے تاریخ کے پورے دھارے کو ہی موڑ دیا تھا.

سید احمد شہید کی تربیت وتزکیہ اور اصلاح و دعوت کی بدولت

ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک اسلام پہنچا اور لوگوں کو صحیح مذہبی رہنمائی حاصل ہوئی (۵)۔

مولانا واضح رشیدؒ کے افکار ونظریات پر تحریک ندوہ کے اثرات: مولانا واضحؒ کی نشو ونما اور تربیت اربابِ ندوہ کے زیر سایہ ہوئی، اور ندوی فکر کی بنیاد وہیں پر پڑی۔ تحریک ندوہ کے ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیمی مراحل طے کیے جس کے نتیجے میں آپؒ کی فکر میں تحریک ندوہ کا عنصر نمایاں طور پر جھلکتا ہے. آپؒ کی تحریروں میں ندوہ کا نصب العین کتاب وسنت کے وسیع علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقفیت اور زمانہ کی نبض شناسی نظر آتی ہے چنانچہ آپؒ کی تصنیف ''الی نظام عالمی جدید'' اور ''الغزو الفکری'' اس کا بین ثبوت ہیں. آپؒ نے مغربی تہذیب وتمدن اور اس کے افکار ونظریات کو بغور پڑھا اور ان مصادر کا بغور مطالعہ کیا جو عالم اسلام کو مغرب کے رنگ میں رنگ کر اس کی روح کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس پر فکری یلغار کر کے امت سے ایمان ویقین، اسلامی تعلیمات اور اس پر اعتماد، اسلامی اخلاق اور اسلامی تشخص کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ آپؒ کی ایمانی غیرت نے اس خطرہ کو بھانپ لیا اور ان سازشوں سے علمی وتحقیقی انداز میں پردہ اٹھایا اور اس کی زہرناکی کو واضح کر دیا، مغرب کی الحادی فکر اور مادیت کے فلسفے پر علمی انداز میں مدلل ومفصل تجزیہ پیش کیا کہ؛ مغربی تہذیب ایک انتہا پسند تہذیب ہے، مسلمانوں کے ساتھ اس کا رویہ قطعاً دوہرا ہے، یہ انسانی شعور سے عاری ہے، مغربی علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور انسانی اقدار و روایات سے خالی ہیں، انسانی معاشرہ کی تعمیر کے بجائے تخریب کا سبب ہیں، مغرب کے ثقافتی حملہ کا مقصد اسلام کے دینی وثقافتی اثر کو ختم کر کے عام مسلمانوں کے اندر مغربی تہذیب کی برتری پر یقین راسخ کرنا اور خود اپنے دینی وتہذیبی ورثے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا ہے کہ رفتہ رفتہ ان کا اپنے شاندار ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائے، اور اس کے لئے ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کیا گیا جس کو پڑھ کر ہر انسان اسلامی تہذیب وتمدن، اقدار وروایات، عقائد اور اسلامی سلوک سے برگشتہ ہو جائے اور اس پر سے اس کا اعتماد اٹھ جائے.

دین و عقائد اسکی تشریح اور تعبیر میں مولانا کا مسلک وھی ھے جو ندوۃ العلماء کا ھے: آپؒ کی تحریروں میں ندوۃ العلماء کا مسلک صاف طور پر ملتا ہے۔ آپؒ دین کی تشریح وتعبیر میں اسلام کے اولین سرچشموں سے استفادہ کرتے ہیں اور اسی کو مرجع کی حیثیت دیتے ہیں، آپؒ کا ماننا تھا کہ اسلام ایک ایسا کامل ومکمل مذہب ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر مشتمل ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، اس میں ترمیم وتنسیخ یا اصلاح کی کوئی گنجایش نہیں، وہ ہر دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہے، اور اسلام مذہب کی حیثیت سے قابل عمل اور قابل اعتماد ہے ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین (آل عمران:۸۸)۔ مولانا کے نزدیک اسلام کے اولین سرچشموں سے ہٹ کر دیگر مغربی افکار ونظریات اور تہذیب جدید سے استفادہ کر کے دین کی غلط اور من مانی تشریح معاشرہ کی تباہی کا سبب ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: ''تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو صحیح شکل میں قائم رکھنے کے لیے علماء ومجتہدین پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے عہد کے انحرافات اور غلط تشریحات کا مقابلہ کیا جن کی کوششوں سے اسلام اب بھی صحیح شکل میں موجود ہے، لیکن اسلامی تاریخ کی ایک بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ مختلف ادوار میں علماء اور مفکرین نے اسلام کے بعض اجزاء پر زور دیا کہ وہی اسلام سمجھے جانے لگے اور بعض حضرات نے دوسرے اجزاء پر زور دیا کہ بس وہی اس فرقے کے لئے اہمیت کے حامل ہو گئے..... اس طرح اعمال و احکام میں تناسب کا خیال نہیں رکھا گیا، اپنے ذوق اور علم کی بنیاد پر اہمیت بیان کی، اس طرح مسلم سماج میں توازن قائم نہیں رہ سکا.....، اس عہد کا اصل مرض اسلام کی من مانی تشریح اور عمل میں عدم توازن یا جزوی عمل ہے اور یہی اس عصر کا مرض اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب ہے..... اس دور میں ہماری کوششوں اور اسلامی تحریکات کی ناکامی کا سبب اسلام کا کامل نمونہ پیش کرنے میں کوتاہی ہے'' (۶)۔

تاریخ کے سلسلہ میں مولانا کا تصور: تاریخ کے سلسلہ میں مولانا کا تصور یہ ہے کہ اسلام کے عروج کا

دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور ہے۔ اور وہ افراد جنہوں نے آپ ﷺ کی آغوش نبوت اور درگاہ رسالت میں تربیت حاصل کی اور قرآن اور ایمان کی پرنور فضا سے تیار ہو کر نکلے سب سے بہترین نمونہ اور قابل تقلید ہیں. مولانا لکھتے ہیں کہ: ''اسی قدسی اور نبوی تربیت یافتہ جماعت کے فضل سے قرن اول میں اسلام پوری دنیا میں پھیلا ،لہٰذا صحابہ کرام اس امت کا خلاصہ اور عطر ہیں ، بلکہ انبیاء اور رسولوں کے بعد پوری نوع انسانی میں سب سے افضل اور برتر ہیں۔''

''صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی نسل ممتاز ترین اور افضل ترین نسل ہے جسکی اسلامی دعوت کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ،صحابہ کرام کے فضل واحسان کا انکار ہٹ دھرم اور سرکش شخص ہی کر سکتا ہے، تمام صدیوں میں اس امت پر ان کے احسانات ہیں اور وہ بغیر کسی تفریق وامتیاز کے قیامت تک نمونہ اور معیار ہیں'' (۷)۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کی فکر کی آبیاری ندوۃ العلماء سے ہوئی لہٰذا اس کا رنگ مولانا کی تحریروں میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔

مولاناؒ کی شخصیت کی تعمیر اور فکر کی تشکیل میں مختلف شخصیات کے اثرات:

کسی بھی کامیاب انسان خواہ وہ مفکر ہو یا دانشور اس کی سیرت کی تعمیر وتشکیل میں جہاں مختلف تحریکوں اور اداروں کا اہم کردار ہوتا ہے، وہیں بہت سی شخصیات کی تربیت ان کے علمی وادبی ذوق اور ان کے افکار ونظریات کا عکس بھی اس کی تحریروں تقریروں اور اس کی تصنیفات میں نمایاں نظر آتا ہے، اور یہ ادارے تحریکات اور اس طرح شخصیات اس کی فکر کی آبیاری اور اس کے ادبی، فنی، علمی اور فکری ذوق کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

یوں تو مولاناؒ کو خلوت پسندی، کم گوئی، صبر وتواضع، فنائیت، تسلیم ورضا، جود وسخا، وسعت فکر ونظر کے باوجود اس میں پورے طور پر سلامت روی اور دین میں پورا تصلب کہ طریق سلف سے ذرا بھی انحراف وشذوذ نہ ہو جیسی امتیازی خصوصیات اپنے نانا مولانا حکیم عبدالحیؒ سے وراثت میں ملی تھیں، ماموں مولانا سید عبدالعلیؒ کی قدیم وجدید، تہذیب وثقافت اور مشرقی ومغربی علوم کا نہایت حسین اور دل آویز امتزاج، سنت وشریعت پر استقامت، فکر ونظر کی وسعت اور اس میں توازن واعتدال جیسی بنیادی خصوصیات حصے میں آئیں۔

مولاناؒ کی شخصیت و فکر کی تعمیر میں مولانا علی میاںؒ کا عکس : مولاناؒ کی باضابطہ علمی وعملی تربیت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے زیر سایہ ہوئی اور ایک طویل عرصہ تک مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہوئے مولانا واضح رشیدؒ مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ جیسے صاحب ذوق وصاحب فکر ونظر معلم ومربی کا سایہ عاطفت نصیب ہوا۔ مفکر اسلام کی بالغ نظری، وسعت مطالعہ، وسعت فکر، توازن واعتدال پھر دلسوزی ودردمندی جیسی اعلیٰ صفات سے بھرپور استفادہ کا موقع ملا، مولاناؒ کی اصلاحی ودعوتی سرگرمیوں اور تنقیدی کارناموں کو قریب سے دیکھنے اور ان سے بھرپور استفادہ کا موقع ملا، ان کی تحریروں وتقریروں اور ان کے دعوتی واصلاحی اسفار سے تجربات حاصل کیے، مفکر اسلامؒ سے ایک لمبی مدت تک علمی ،ادبی وفکری استفادہ کا موقع فراہم ہوا، مولانا واضح رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی روشن فکر، دینی غیرت، اسلامی حمیت، قوم وملت کے تئیں دردمندی، ہمہ وقت معاشرے کی اصلاح کی کوشش، روشن ضمیری، ایمانی فراست، اعلی افکار ونظریات ،بلند ذوق اور دعوتی وتربیتی حکیمانہ اسلوبِ تصنیف وتالیف، تحلیل و تجزیہ اور تنقید کا معتدل انداز مزید قرآن سے روشنی حاصل کرنے اور اس سے استدلال کرنے جیسی امتیازی صفات سے کسب فیض کیا'' (۸) یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم کی تحریروں میں جابجا علی میاںؒ کا اسلوبِ بیان، اندازِ تنقید وتحلیل وتجزیہ کی جھلک ملتی ہے، خاص طور پر مغرب کے تئیں مولانا کے رویہ ونظریہ میں مفکر اسلام کی دو اہم تصنیفات ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین''، اور الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ'' مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں، اسلوب ِبیان میں بھی بہت حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔

مولانا کی فکر ان کی تحریروں کے آئینہ میں: یہ ایک مسلمہ امر ہے کسی بھی مفکر کی فکر کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے

لئے اس کی تحریروں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ مفکر اپنے مضامین اور تصنیفات میں اپنے نظریہ، اپنی فکر کو بہتر طور پر پیش کرتا ہے، کیونکہ تحریر فکر کی آئینہ دار ہوتی ہے. مولانا واضح مرحوم کی جودت فکر، صلابت رائے کی عکاسی ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ فکری توازن واعتدال جو دراصل ندوی فکر کا امتیاز ہے، آپ کی تمام تحریروں سے جھلکتا ہے۔ آنے والے اقتباسات میں آپ کی تحریروں کی روشنی میں آپؒ کی فکر پر تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا اور فکر کے ترجیحاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

مولانا کی فکر میں سیرت کی آفاقیت:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں نے اپنے اپنے ذوق کے اعتبار سے سیرت پر مختلف زاویوں سے کتابیں لکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قائد مربی ومحسن انسانیت کی حیثیت سے پیش کیا جو اپنی جگہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، مولانا واضح رشید ندوی نے خود محسن انسانیت کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا مگر مولانا کا اپنا موقف یہ تھا کی "اسلام اور سیرت نبوی کو عملی وفکری انداز میں پیش کرنا وقت کا اہم فریضہ اور مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ہے جو کسی طرح بھی دعوتی فریضہ سے کم اہمیت کی حامل نہیں، بلکہ تقریبا دونوں کی حیثیت یکساں ہی ہے، حالات کا تقاضا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی اہمیت وافادیت اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تابناک حقیقی زندگی کو غیر مسلموں کے سامنے علمی وعصری انداز میں پیش کیا جائے، چنانچہ اسلامی اداروں کی اولین ذمہ داری ہے کہ تاریخ اسلام اوسیرت نبوی کے موضوع پر علمی انداز میں ایسی کتابیں تصنیف کریں جن میں ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیے جانے والے تمام اعتراضات کا تشفی بخش اور قابل اطمینان جواب ہو، اسی کے ساتھ حالات وقارئین کے مزاج ومذاق کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہو، اس لیے کہ اس قسم کے شکوک وشبہات صرف غیر مسلموں کے ذہنوں ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ مغربی تعلیم یافتہ مسلم طبقہ کے ذہنوں میں بھی غیر مسلموں کے گمراہ کن باطل نظریات کی وجہ سے نت نئے شکوک وشبہات نے جگہ بنالی ہے" (۹)۔

مغربی نظام تعلیم کی تباہ کاریاں:

موجودہ دور میں جب پوری دنیا پر فکری طور پر مغرب کا تسلط ہے، تہذیب وتمدن غرض زندگی کے ہر میدان میں اس کا عنصر غالب ہے، خاص طور پر موجودہ نظام تعلیم وتربیت جو اسی کا تیار کردہ ہے، دنیا اس کی اس قدر دیوانی ہے کہ اسے عقیدے کی فکر ہے نہ اخلاق کی پرواہ، نہ اسے عبادت ومعاملات کے بگڑنے کا افسوس نہ اپنا صحیح طور طریقہ بدلنے کا رنج، مسلمان جس کا آخرت پر ایمان اور اسکی ابدیت پر یقین ہے اس کے لیے اس بات جاننا ضروری ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کے جہاں بہت سے ایجابی پہلو ہیں جنکا انکار نہیں کیا جاسکتا اور مغرب نے اسی نظام تعلیم کی بدولت دنیا کے بہت سے علوم وفنون میں کامیابی کی منزلیں طے کیں، وہیں اس کے منفی پہلو بھی ہیں، موجودہ نظام تعلیم ایک مخصوص طرز فکر کی نمائندگی کرتا ہے، جس کی بنیاد مادیت پر ہے اور وہ روحانیت کے عنصر سے یکسر خالی ہے، اس کو اس کی پروا نہیں کہ اس سے لوگ اچھے انسان بنیں اور ایک اچھی کامیاب زندگی بسر کرسکیں، بلکہ اس کی تمام تر توجہ اس بات پر ہے کہ ان علوم وفنون میں طلبہ کیسے مہارت حاصل کریں جن سے انہیں اپنی معاشی زندگی کو بہتر بنانے میں مدد ملے، گویا اس جدید تعلیم کا محور صرف اور صرف مادیت ہے. مغرب کی فکری، سیاسی وعسکری برتری اور دنیا کے زیادہ تر حصوں پر تسلط کی وجہ سے یہ نظام تعلیم عام ہوگیا، خاص طور پر اسلامی مشرقی ممالک پر اس نظام کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ وہ انتشار اور بے راہ روی کا شکار ہیں، انہوں نے اپنے مذہبی اخلاقی تصورات کو یکسر فراموش کردیا، اور مکمل طور پر اس جدید نظام کو قبول کرلیا، اس کے اثرات انکی زندگی کے ہر شعبے، سیاسیات، اقتصادات اور سماجیات پر پڑے، جہالت وفقر کم ہونے، مال ودولت کی ریل پیل اور اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود معاشرہ بگاڑ وجرائم کا شکار ہے کیونکہ علم اور مال کا غلط استعمال ہے۔

مولانا لکھتے ہیں: "مغربی نظام تعلیم کی بنیادی خصوصیت اس کا مادی ضرورتوں سے مربوط ہونا ہے، آخری دور میں تعلیم کو ملازمت اور مادی ضرورتوں کی تکمیل تک محدود کردیا گیا ہے، جس کا اثر عائلی اور سماجی زندگی پر نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کا مقصد ایک اچھے انسان کی تربیت اور اس کی تعمیری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا رہا ہے،

لیکن موجودہ نظام تعلیم میں اس پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے"....."اس زمانے میں زندگی کے بگاڑ، جرائم کی کثرت اور انسانی زندگی کی مشکلات کا بڑا سبب علم اور مال کا غلط استعمال ہے بلکہ استحصال ہے، علم کی اہمیت ہے اور اپنی جگہ وہ نعمت ہے اگر اس کا صحیح استعمال ہو۔ اور زحمت ہے اگر اس کا استعمال انسانی قدروں کی رعایت کے بغیر ہو" (۱۰)۔

مولانا مرحوم کا کہنا ہے کہ جدید نظام تعلیم ایک صالح معاشرہ کی امن وسلامتی کے لئے خطرہ ہے کیونکہ اس کی بنیاد صرف اور صرف خود غرضی پر ہے اس میں عقیدے کی اصلاح، اخلاقیات، انسانی سلوک کی درستگی اور انسانی اقدار وروایات کو یکسر فراموش کیا گیا ہے، "سامراجی تربیت کے نتیجے میں آج انسانیت کو پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے ان مسائل سے صرف ترقی پذیر ممالک ہی دوچار نہیں ہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک کے امن اور سلامتی کے لیے بھی خطرہ ہے، اور ان کی تہذیبی ترقی میں رکاوٹ ہیں" (۱۱)، مغربی تصور کے مطابق مثالی انسان وہ ہے جو اپنی صلاحیت اور اپنے وسائل کو اپنی مادی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرے، اس میں عقیدے کی اصلاح اور درستگی، اخلاقیات کی درستگی، انسانی سلوک کی درستگی، انسانی اقدار و روایات کے پاس ولحاظ کی تعلیم نہیں دی جاتی "اس غیر دینی اور غیر اخلاقی تربیت کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جو بظاہر ترقی وپیش قدمی کرتا نظر آتا ہے، مگر درحقیقت وہ خودغرضی میں مبتلا اور اپنی ذات تک محدود ہے، یورپین معاشرہ اخلاقی اقدار وروایات اور دینی اصول واحکامات کے نہ ہونے کی وجہ سے بگاڑ، اخلاقی انارکی وابتری کی انتہا کو پہنچ گیا ہے (۱۲)۔

وحدانی نظام تعلیم کے تئیں مولانا کا موقف: ایسی صورتحال میں جبکہ جدید نظام تعلیم کا مکمل تسلط ہے اور اس کے کچھ ایسے ایجابی پہلو بھی ہیں جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس کو یکسر نظر انداز کرنا، قدیم نظام تعلیم پر شدت سے قائم رہنا اور جدید علوم وفنون سے ناواقفیت حالات کو مزید سنگین بنا سکتی ہے، سوال یہ ہے کہ ایسی صورتحال میں کونسی حکمت عملی اختیار کی جائے کہ اس سامراجی نظام تعلیم کی تباہ کاریوں سے بچتے ہوئے اور اس کے ایجابی پہلو سے فائدہ اٹھا کر ایک نیا نظام تعلیم پیش کیا جائے، ایسا وحدانی نظام تعلیم جو جدید وقدیم کا سنگم ہو اس میں جدید انسانی ترقی کے وسائل کے تمام پہلوؤں سے استفادہ بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عقیدہ واخلاقیات انسانی اقدار وروایات کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہو، اس سلسلے میں مولانا مرحوم کا ماننا ہے کہ تعلیم کی تقسیم صرف نافع اور غیر نافع کی ہونی چاہئے اور ایک ایسا وحدانی نظام تعلیم وجود میں آنا چاہیے جس میں قدیم صالح اور جدید نافع کا حسین امتزاج ہو.

مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''اسلام کو درپیش خطرات کے مقابلے کے لیے ہمیں ایسے جامع علماء کی ایک بڑی جماعت کی ضرورت ہے، ہمیں ضرورت ہے ایسے ہی لوگوں کی جو دنیا کے مختلف حصوں میں تعلیم و تربیت اور تحریک و دعوت کا کام انجام دیں، اور میدان میں نکل کر مقابلے کی صلاحیت کے ساتھ اسلام کی خدمات انجام دیں، اور ایسا اس وقت ممکن ہے جبکہ ایسا تعلیمی، تربیتی، ثقافتی نظام تیار کیا جائے جو قدیم وجدید کا جامع ہو جس میں سمٹنے کی بجائے پھیلنے کی صلاحیت ہو، جس کے فارغین دعوتی جذبے، علمی صلاحیت، عصری واقفیت اور مؤلفانہ جرات واعتماد کے ساتھ مسجد مدرسہ ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں دعوت اسلام کا کام انجام دیں اور اس کے لیے ہمیں اپنے تعلیمی اور تربیتی نظام کی اسر نو تنظیم کرنی ہوگی'' (۱۳)۔

ذرائع ابلاغ کے تئیں مولانا کا موقف:

آج کی ترقی یافتہ دنیا میں صحافت، ریڈیو ٹیلی ویژن کی اہمیت وافادیت مسلم ہے، ہر خواندہ ناخواندہ ان سے استفادہ کر لیتا ہے، اور کسی بھی نظریے کو فروغ دینے کے لیے ان وسائل کا استعمال عام ہے، ویڈیو، فلمیں اور ڈرامے مختلف مفکرین کے افکار ونظریات کو فروغ دینے کیلئے ایک مؤثر وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں، ذہن اور روح کی تعمیر وتشکیل میں ان کی اہمیت واثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جاسکتا، یہ انسانی معاشرے کو مختلف طرز زندگی اور اس کے مناظر سے واقف کراتے ہیں، تاریخ کی قدیم شخصیات اور ان کے کارناموں کو ٹی وی سیریل میں پیش کیا جاتا ہے، بہت سے تاریخی حقائق اور قصے واقعات بیان کرنے کئے لئے ان کا استعمال عام ہے، کتابوں سے زیادہ ٹی وی سیریل کی تاثیر

ہے، ایسے میں مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان وسائل کا بھرپور استعمال کر کے اسلامی اخلاق واقدار کو فروغ دیں، مسلم قائدین مسلمان مجاہدین کے واقعات کو ان کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:" مسلمانوں کو نئے معاشرے کی تعمیر وتشکیل اور نئی نسل کی تعلیم وتربیت کیلئے ان مؤثر جدید وسائل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے" تعلیمی نظام کی طرح ذرائع ابلاغ کو بھی اسلامی تصور کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے"." اسکے لئے صرف نصاب کی تبدیلی کافی نہیں کہ اسکی جزوی تبدیلی سے مغربی نظام تعلیم کی خرابیوں سے بچا جاسکتا ہے" بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ وسائل ایک اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں تعلیمی ماحول، ثقافتی پروگرام اور ذرائع ابلاغ اور تہذیبی قدریں بھی اس نظام کا اہم جز ہیں (۱۴)''۔

اسلامی صحافت کی ضرورت:

مولاناؒ کے نزدیک آج کے دور میں جب صحافت کتاب اور اس کا متبادل ہے، مغرب اپنے باطل افکار ونظریات اسلام کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کے لیے اس کا کثرت سے استعمال کرتا ہے تو مسلم معاشرے کو بھی ایک ایسی صحافت کی ضرورت ہے جو مغربی صحافت کی طرح آزاد نہ ہو۔

مولانا لکھتے ہیں:" آج مسلم معاشرے کو اسلامی نظام تعلیم جو نصاب اور ماہر استاد اور ماحول تعلیم پر مشتمل ہو۔ کے ساتھ ساتھ ایسی صحافت کی بھی ضرورت ہے جو نہ تو مغرب کی صحافت کی طرح مطلقا آزاد ہو جس کا نامہ نگار جب اور جس طریقے سے چاہے ہر اچھے برے خیال کو لوگوں کے سامنے پیش کرے، اور نہ اشتراکی صحافت کی طرح مقید ہو جو عوام کو بیرونی دنیا سے بالکل بے خبر رکھتی ہے، بلکہ مثبت تعمیری بامقصد اور اقدار وروایات کی پابند صحافت ہو جسے اپنے اصول ومبادی پر پورا یقین ہو، اپنی ذمہ داریوں کا خوب خوب احساس ہو، تعمیری تنقید کا پورا فریضہ انجام دے، قارئین کی خواہشات کی تکمیل کرتی ہو، اسلامی تصور زندگی کے منافی نہ ہو، اس میں ایسا مواد شائع کیا جائے جس سے اسلامی غیرت وحمیت، اخوت و بھائی چارگی اور عالم اسلام سے محبت ووابستگی کے جذبات فروغ پائیں، عالم اسلام کے مسائل کا تعارف کرایا جائے اور پھر ان کا حل بھی پیش کیا جائے اور وہ ایک عظیم مشن اور تعمیری وصالح پیغام کی حامل ایک ذمہ دار صحافت ہو'' (۱۵)۔

قضیہ فلسطین مولانا مرحوم کی تحریروں میں: قضیہ فلسطین عالم اسلام کا حساس ترین مسئلہ ہے، خلافت عثمانیہ کے سقوط، عربوں کے افتراق، اور عرب حکام کی بے توجہی، خودغرضی کے نتیجے میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا، اور رفتہ رفتہ اس کو استحکام حاصل ہوا، اور یورپ نے کھل کر اس کی حمایت کی، اس وقت سے مسلمانوں پر ظلم وستم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے، جس کو سن کر ہر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں. مولانا مرحوم کا ماننا تھا مسلمانوں کو قضیہ فلسطین کو صرف عربوں کا مسئلہ سمجھ کر خاموش نہیں بیٹھنا چاہیے، بلکہ پوری امت مسلمہ کو متحد ہو کر اس کے تئیں ہمدردی کا اظہار کرنا چاہئے، اور جس سے جیسے بن پڑے اس کا تعاون کرنا چاہیے، کیونکہ یہ صرف عربوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اس سے پورے عالم اسلام کے جذبات وابستہ ہیں، کیونکہ مسلمانوں کا قبلہ اول مسجد اقصی ہی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:" مسجد اقصٰی کا مسئلہ صرف عربوں کا مسئلہ نہیں، یہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے، فلسطین کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ عربوں کا مسئلہ ہے، اور اس میں عربوں کی کوتاہی کو بہت دخل ہے، کیونکہ اسرائیل کا قیام یوں ہی عمل میں نہیں آ گیا، یہودی مکروفریب ایک حقیقت ہے، لیکن اس مکروہ فریب وعیاری و مکاری سے یہودی کوئی بڑا فائدہ نہ اٹھا سکے وہ کبھی غالب قوم رہے، ہمیشہ مارے مارے پھرے دنیا میں انہیں عزت وسربلندی نہیں ملی، اگر مگر سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچتا تو مکار آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا، بلکہ ایسا نہیں ہے قرآن کہتا ہے"وقد مکرو مکرھم وعندالله مکرھم وان کان مکرھم لتزول منه الجبال ."اسرائیل کی برتری کا تصور غلط ہے، جتنی بھی جنگوں میں اس کو کامیابی ملی تو وہیں ملی جہاں اس کے مقابل نے کمزوری دکھائی"

عالم اسلام پر مغرب کی فکری یلغار:

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب صلیبیوں نے میدان جنگ

میں مسلمانوں سے پے در پے شکست کھائی، اور اس بات کو سمجھ لیا کہ مسلمانوں کی طاقت وقوت کا اصل منبع وسرچشمہ مذہب اسلام ہے، لہذا اگر مسلمانوں پر تسلط قائم کرنا اور ان کو مغلوب کرنا ہے تو ان کا رشتہ ان کے دینی مصادر خاص طور پر قرآن وحدیث سے توڑنا ہوگا، اس کے لیے انہوں نے نئے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے، قرآن حدیث اسلامی تاریخ دعوت اسلامی مسلمانوں کی طرز زندگی اسلامی تہذیب وتمدن پر ایسی تصنیفات، فلمیں ڈرامہ، سیریل اور ایسا مسموم مواد پیش کیا جو اسلام سے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات اور نفرت پیدا کر رہا تھا اور ان کا رشتہ ان کے تابناک ماضی سے توڑ رہا تھا، جس کے نتیجے میں وہ مذہب کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر مغرب کے پیش کردہ نظام کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے، اور مکمل طور پر اس کے غلام ہو گئے، مغرب کی یہ فکری یلغار اس کی جنگی یلغار سے زیادہ خطرناک تھی، جس کے نتیجے میں ایک بڑا روشن خیال طبقہ اس کی زد میں آ گیا اور مذہب سے برگشتہ ہو گیا، آج ماڈرنزم کے نام پر جو مذہب سے بیزاری اور برگشتگی ہے وہ دراصل اسی مغربی یلغار کا نتیجہ ہے، اور مذہب کے تئیں یہ رویہ پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب انسانی معاشرے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، گویا مذہب ایک افیم ہے کہ جو اس کا استعمال کر لے وہ نشے میں چور زندگی کی خوشیوں سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

سامراجی طاقتوں کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اغراض و مقاصد سے مولانا پردہ اٹھاتے ہوئے بیان کرتے ہیں:" مغربی قائدین پوری طرح یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ ان کے سامراجی اغراض و مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک مسلمانوں کا قرآن وحدیث سے تعلق ختم نہ کر دیا جائے چنانچہ ان لوگوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے درج ذیل طریقے اختیار کئے مثلا:

قرآن کریم کی حجیت میں شک پیدا کرنا اور اسے ہدف تنقید بنانا۔

فقہ اسلامی کی قدر وقیمت کو کم کرنا.

اسلام کو یہودیت ونصرانیت سے ماخوذ قرار دینا.

فصیح عربی زبان کے خلاف مہم چلانا، اسے زمانے کی رفتار کا ساتھ دینے سے عاجز قرار دینا، دینی مدارس کی تحقیر کرنا، علماء ؒ کے بارے میں بدگمانی کرنا پیدا کرنا.

حدیث کے ساتھ کھلواڑ کرنا اور اپنی آراء کو مضبوط کرنے کی خاطر ضعیف احادیث کا سہارا لینا.

مسلمانوں کی اخوت و بھائی چارگی کی روح کو کمزور کرنا اور ان کی تاریخ کو جھٹلانا۔

اسلام کی تصویر کو مسخ کرنا اور مسیحی اقوام سے اس کے محاسن کو مخفی رکھنا۔

اسلامی تعلیمات اور اسکے مصادر میں شکوک وشبہات کو فروغ دینا۔

ایسی شخصیات کو نمایاں کر کے پیش کرنا جنہوں نے ادب سیاست اور تصوف کے باب میں اسلام اور شریعت کی تعلیمات سے انحراف کیا ہو(۱۷)۔

مغربی پریس نے موضوعی تحقیق کے نام پر قرآن، حدیث اسلامی تاریخ دعوت اسلامی مسلمانوں کے طرز زندگی اور اسلامی تہذیب و تمدن پر ایسے مضامین اور تحقیقات شائع کیں جو اسلام کے بارے میں دلوں میں نفرت اور ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کریں اور یہ مضامین اور تصنیفات اعلی تعلیم کے نصاب درس میں شامل کی گئیں صرف یورپین یونیورسٹیوں ہی میں نہیں بلکہ اسلامی ملکوں کی تعلیم گاہوں میں بھی (۱۸)۔

مولانا کا ماننا ہے ایسے حالات میں مسلمانوں کو مرعوبیت سے باہر آنا ہوگا، کیونکہ قابل غور بات ہے کہ یورپ کے پاس یہ تہذیب و وتمدن اور علم مسلمانوں ہی کے پاس سے آیا ہے ورنہ وہ تو جہالت کی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبھی اس جہالت سے آزاد ہو سکے گا، گویا مسلمان ہی اس کی تمام ترقیاتی اور تہذیبی صلاحیتوں کا اصل سرچشمہ ہیں، قدرت نے ذہنی ودماغی صلاحیت کسی قوم رنگ ونسل کی کے لئے یا کسی خاص سرزمین کے لیے خاص نہیں کی، یہ فیض تو ساری اولاد آدم کے لیے یکساں طور پر عام ہے بس ارادے کی ضرورت ہے.

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے.

مولانا رقمطراز ہیں:

"اقوام مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کے اندر سے مغرب کے بارے میں اس تفوق و برتری کا احساس ختم ہونا چاہیے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خود پیش قدمی نہ کرے، اور قافلہ سالار بننے کی کوشش نہ کرے، مسلمانوں کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جسکو مغرب سے پوری واقفیت حاصل ہے اور مغربی علوم پر دسترس رکھتا ہے موجودہ اجتماعی حالات کی روشنی میں عالم اسلام کے مخصوص حالات اور ضرورتوں، اور اسلامی اقدار و نظریات کی روشنی میں جائزہ لے، اور تمام علوم میں بحث و تمحیص کے لئے آمادہ ہوجائے، خصوصا نفسیات، اقتصادیات، اجتماعیات، سیاسیات، طبیعیات اور زبان و ادب میں۔ پھر ان علوم کو غیر مفید غیر ضروری حصے سے علیحدہ کر کے ان کو صحت مند اور مفید بنا کر ترقی دے (۱۹)۔

''انسانی شرافت و عظمت اور آزادی کے حصول اور اسلامی تشخص کے باقی رکھنے اور سامراج کے مقابلے کے لئے یہی بہتر اور صحیح راستہ ہے اس طرح عصری علوم اور سائنسی تحقیقات انکشافات و تجربات کے ذریعے تھوڑے ہی عرصے میں مغربی سائنسدانوں اور یورپی مفکرین اور دانشوروں کو پورے اعتماد پوری قوت سے مخاطب کر سکیں گے اور یہ کہہ سکیں گے" ما اوتیتم من العلم الا قلیلا " تمہیں تو دریا سے ایک قطرہ ہی ملا ہے'' (۲۰)۔

مولانا کا نظریہ قوت عمل ہے :

مولانا مرحوم جہد مسلسل اور عمل پیہم کے فلسفے کے قائل تھے ان کا کہنا تھا عالم اسلام کی ترقی اور اس کی کھوئی ہوئی مجد و بزرگی کو حاصل کرنے کے لئے قوت ارادی، تحریک عمل اور جذبہ صادق کی ضرورت ہے جس کی بدولت تاریخ اسلامی مجاہدین اور فاتحین کے کارناموں سے بھری پڑی ہے، ان کا ماننا تھا احتجاج و مظاہرہ، قرار دادیں تجاویز، مشورے سمپوزیم اور کانفرنسوں سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ یہ صرف ایک روایتی طرز ہے اس کا حقیقت اور قوت عمل سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ایک طرح سے کمزوری کی علامت ہے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ عالم اسلام کی قیادت کرنے والے اپنی آرام گاہوں اور عیش سامانیوں سے باہر نکل کر میدان عمل میں آئیں بقول کسے نکل کر آرام گاہوں سے ادا کر رسم شبیری، ان کو مضبوط موقف جذبہ صادق اور قوت عمل کی ضرورت ہے مولانا کا رسالہ ''من صناعۃ الموت الی صناعۃ القرارات" اس کا بین ثبوت ہے جس میں انھوں نے عمل کے فلسفے پر مفصل بحث کی ہے۔

مراجع:

(۱)۔سوانح مفکر اسلام، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی ص ۴۸، طبع اول ۱۴۲۲ھ، سید احمد شہید اکیڈمی تکیہ کلاں رائے بریلی۔

(۲)۔قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ص ۱۴، دار الرشید، ۲۰۱۲ء، لکھنؤ

(۳)۔اسلام مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں: مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی، ترجمہ، وتشریح محمد سالم سونکی، دار الرشید لکھنو۔ص ۹/۱۰۔

(۴)۔تاریخ ندوہ العلماء حصہ اول مولانا اسحاق جلیس ندوی مجلس تحقیقات ونشریات لکھنو، بحوالہ، تحقیق وانصاف کی عدالت میں، از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

(۵)۔الامام احمد بن عرفان، الشھید، ص ۱۵، المجمع العلمی، لکناؤ، الطبعۃ الاولی، ۲۰۰۵۔

(۶)۔اسلام مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں، ص ۹/۸

(۷)۔صحابہ کرام کی مثالی زندگی ص ۱۱، ۱۲، دار الرشید، لکھنؤ۔

(۸)۔الی نظام عالمی جدید، ص ۱۵، تقدیم وتعریف، الاستاذ نذر الحفیظ ندوی، المجمع الاسلامی، العلمی، لکناؤ، الندی۔

(۹)۔نظام تعلیم وتربیت، اندیشے، تقاضے اور حل، از مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، ترجمہ، وترتیب محمد وثیق ندوی، ۲۰۱۳ء، ناشر دار الرشید، لکھنؤ۔

(۱۰)۔ایضاً ص ۵۹

(۱۱)۔ایضاً ص ۶۹

(۱۲)۔نظام تعلیم وتربیت اندیشے، تقاضے اور حل ص ۹۷

(۱۳)۔ایضاً ۷۶

(۱۴)۔ایضاً، ص ۷۵

(۱۵)۔قضیۃ فلسطین سامراج اور اسلام ص ۸، از مولانا سید محمد واضح رشید حسنی، دار الرشید لکھنؤ، سنہ اشاعت ۲۰۱۱ء۔

(۱۶)۔الغزو الفکری، سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، ص ۹۴، ۹۵، دار الرشید لکھنؤ، ۲۰۱۷ء

(۱۷)۔نصاب تعلیم اندیشے، تقاضے، اور حل، ص ۴۱

(۱۸)۔ص ۵۲، ۵۳

(۱۹)۔ص

(۲۰)۔رہبر انسانیت، سید محمد رابع حسنی، (مقدمہ از مولانا واضح رشید ندوی، صفحہ نمبر ۲۴۔

☆☆☆

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کی فکر کے تشکیلی عناصر

محمد فرید حبیب ندوی
(استاد مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ)

کسی بھی شخصیت کی تشکیل میں مختلف عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ان میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن کے کسب میں انسان کی اپنی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔اور کچھ ایسے، جو انسان کی کوششوں کا ماحصل ہوتے ہیں۔اول الذکر عناصر میں خاندانی پس منظر خاص اہمیت رکھتا ہے۔کسی بچے کا کسی علمی وتاریخی خانوادے میں جنم لے لینا، گویا قدرت کی طرف سے اس کی شخصیت کی تشکیل کے لیے ایک عظیم عطیہ ہوتا ہے۔پھر شعور وبلوغ کے بعد اپنی شخصیت کو بنانے کے لیے انسان جن عناصر کو اختیار کرتا ہے،ان میں اچھا ادارہ، اچھے اساتذہ اور اچھی کتابیں اور اس جیسی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ ان خوش قسمت افراد میں سے تھے جنھیں شخصیت کی تشکیل کے یہ دونوں عوامل مہیا ہوئے۔نسبی طور پر ان کی نسبت اس عظیم خانوادے سے ہے، جس کی خدمات وقربانیوں سے ہندوستان کی تاریخ روشن؛ بلکہ روشن تر ہے۔جو ایک طویل زمانے سے علمی ودعوتی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیتا چلا آرہا ہے۔اور پھر خاص بات یہ ہے کہ اس کا سلسلۂ نسب حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام سے ملتا ہے۔اللہ تعالی نے مولانا مرحوم کو اِس عظیم خانوادے کا ایک فرد بنایا، تاکہ ان کی شخصیت ان تمام اعلی صفات وخوبیوں سے مزین ہو، جو اس خانوادے کا امتیاز رہی ہیں۔ان میں علوم ظاہری وباطنی کا امتزاج، علمی ودعوتی خدمات اور اعتدال وتوازن نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں۔

پھر سن شعور وبلوغ کے بعد مولانا نے جن دو عظیم اداروں سے وابستگی اختیار کی، وہ ملک کی تاریخ کے نمایاں اداروں میں سے ہیں، یعنی دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔اسی طرح انھیں ایسے عظیم اساتذہ ملے، جو جبینِ علم کا جھومر تھے اور جن پر علم وادب کی تاریخ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ندوے نے انھیں توسع، جامعیت، توازن اور آفاقیت سے نوازا، تو علی گڑھ نے ان میں جدید چیزوں سے شعور وآگہی اور عصری علوم سے واقفیت پیدا کی۔

انسان کی فکر کی تشکیل میں اس کے مذہب کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔انسان پیدائشی طور پر یا اپنے اختیار سے جس مذہب سے وابستہ ہوتا ہے، اس کی پوری زندگی پر اس کی چھاپ پڑتی ہے۔مولانا مرحوم کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں مذہب اسلام کی آغوش میں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔اس لیے کائنات اور انسان کے تعلق سے اسلام میں جو نظریات پیش کیے گیے ہیں، مولانا نے پوری طرح ان کو اخذ کیا اور پھر اپنے خوب صورت اسلوب میں انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ان دونوں چیزوں کے بارے میں جو غیر اسلامی، باطل وگمراہ تصورات ہیں، جن کی وجہ سے انسان کی فکر کا رخ غلط ہوجاتا ہے، مولانا ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے، ان سے محفوظ رہے۔ان کی تحریروں میں وسعت، جامعیت، ہمہ گیری اور انسانیت کے تئیں ہمدردی وشفقت کے جو جذبات جھلکتے ہیں، وہ کائنات وانسان کے بارے میں اِسی تصور کا نتیجہ ہیں، جو اسلام نے ان کے ذہن ودماغ میں نقش کردیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کا ماننا تھا کہ مذہب کے بغیر انسانیت کی تعمیر درست طریقے پر نہیں ہوسکتی۔وہ اس بات سے نالاں تھے کہ مغربی تہذیب نے اپنے اندر سے مذہب کو نکالنے کی کوشش کی، مگر مولانا کا خیال تھا کہ اگرچہ اہل مغرب مذہب سے وابستگی کا انکار کرتے ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے اپنے ذہن سے پوری طرح کھرچ نہیں سکے ہیں۔مولانا کا عقیدہ تھا کہ دنیا کی صحیح تعمیر مذہب ہی کے راستے سے ہوسکتی ہے اور وہ بھی صرف مذہب اسلام کے راستے سے۔

انسان جن شخصیات سے استفادہ کرتا ہے، ان کا بھی اس کی فکر کی تشکیل میں بڑا کردار ہوتا ہے۔یہ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں، جن سے وہ براہ راست مستفید ہوتا ہے، جن کی خدمت میں اسے کچھ مدت

گذارنے کا موقع ملتا ہے اور وہ ان کے افکار وخیالات کا تاثر قبول کرتا ہے۔اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں، جن سے وہ براہ راست استفادہ نہیں کرتا۔نہ اس نے انھیں دیکھا ہوتا ہے اور نہ ان کے پاس کچھ وقت گذارنے کی سعادت اسے نصیب ہوتی ہے؛لیکن وہ ان کی کتابوں اور تحریروں کے ذریعے ان سے متاثر ہوتا ہے۔

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کی فکر میں یہ دونوں طرح کی شخصیات شامل ہیں۔اور سب سے زیادہ وہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے متاثر نظر آتے ہیں۔یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے مفکر اسلام کے افکار ہی کو اپنے انداز وبیان میں آگے بڑھایا۔اور خود انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے مفکر اسلام کی ذات اور شخصیت اور ان کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور ان کی شخصیت میں اس کی جھلک موجود ہے۔اسی طرح وہ مولانا مودودیؒ، سید قطبؒ اور ماضی بعید کی شخصیات میں مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور سید احمد شہیدؒ سے بھی متاثر ہوئے۔اول الذکر دونوں کی خدمات کا انھوں نے کھل کر اعتراف کیا ہے۔اور آخر الذکر تینوں شخصیات کو انھوں نے منہج دعوت واصلاح کے لیے بطور آئیڈیل ونمونہ کے پیش کیا ہے۔اور کہا ہے کہ دعوت کی تاریخ میں یہ تین منہج ہی سب سے زیادہ مفید وثمر آور رہے ہیں اور آج بھی یہی سب سے زیادہ کارگر ہیں۔

کتابیں بھی انسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ زندگی پر سب سے زیادہ گہری چھاپ (شخصیات کے بعد) کتابوں ہی کی ہوتی ہے۔اس پہلو سے دیکھا جائے تو مولانا-ہر مسلمان کی طرح-سب سے زیادہ قرآن سے متاثر نظر آتے ہیں، اور وہ اسے ہی انسانیت کے لیے نسخۂ شفا سمجھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں جا بجا قرآنی استدلالات کے نمونے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔قرآن کے بعد کتب حدیث کا اثر ان پر سب سے نمایاں ہے۔مولانا کا یقین تھا کہ معاشرے کی صحیح تعمیر وتشکیل احادیث رسول کے سانچے میں ڈھل کر ہی ہوسکتی ہے۔اسی مقصد سے انھوں نے ذخیرۂ احادیث سے ایسی چالیس احادیث منتخب کرکے ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جو ان کے نزدیک معاشرے کی تعمیر میں اکسیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کے علاوہ خاص طور پر وہ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين"، "الصراع بين الفكرة الإسلامية والغربية في الأقطار الإسلامية"، "إلى الإسلام من جديد" (مفکر اسلامؒ)، western civilization cnodemned (مریم جمیلہ)، "التبشير والاستعمار في البلاد العربية" (مصطفیٰ خالدی) اور ڈاکٹر محمد حسین اور ڈاکٹر عمر فروخ کی کتابوں سے بھی متاثر ہوئے اور ان کے افکار وخیالات سے استفادہ کیا۔ان سب کتابوں کا انھوں نے اپنی ایک کتاب کے مقدمے میں خود تذکرہ کیا ہے۔

تاریخ کا علم بھی انسان کے افکار پر اثر ڈالتا ہے۔مولانا تاریخ کا گہرا علم رکھتے تھے اور انھوں نے بڑی گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا تھا۔اس لیے تاریخ کے اتار چڑھاؤ، قوموں کے عروج وزوال، اور ان کے اسباب پر ان کی گہری نظر تھی۔تاریخ کے مطالعے نے ہی ان میں یہ یقین پیدا کیا تھا کہ مغربی تہذیب کی زندگی اب زیادہ طویل نہیں ہوگی۔اور مستقبل قریب میں ہی وہ اپنی موت آپ مرنے والی ہے۔

ادب وصحافت بھی افکار کی تشکیل میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔اور یہ سب جانتے ہیں کہ مولانا کی پوری زندگی انھی دونوں میدانوں میں گذری۔انھوں نے اردو وعربی کے ساتھ ساتھ انگریزی لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا، اور صحافت کے ذریعے بہترین ادبی خدمات انجام دیں۔وہ صحافت کے موجودہ رویہ سے شکوہ کناں تھے۔ان کا خیال تھا اور بالکل بجا تھا کہ دور حاضر میں صحافت کچھ خاص لوگوں کی زرخرید بن چکی ہے، اور اب اس کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ کس طرح سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جائے، اور کس طرح اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا جائے۔

مشاہدہ اور سفر سے انسان کے افکار وخیالات میں ترقی وبلندی پیدا ہوتی ہے۔مولانا کا مشاہدہ بڑا عمیق تھا۔اور انھیں سفر کے بھی مواقع حاصل ہوئے تھے۔انھوں نے موجودہ معاشرے پر اور اسی طرح مغربی تہذیب پر جو تنقیدیں کی ہیں، وہ اس کی بین دلیل ہیں کہ وہ چیزوں کو بڑی گہرائی سے دیکھتے تھے۔یہ مشاہدہ ہی تھا جس نے ان سے یہ لکھوایا کہ ''اگرچہ اہل مغرب بظاہر مذہب کے منکر نظر آتے ہیں؛لیکن یہ دھوکا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے وابستگی ان کے سلوک وافکار میں پوری طرح نظر آتی ہے اور ہر وہ شخص اسے محسوس کرسکتا ہے، جسے یورپی معاشرے کے افراد سے رابطے کا موقع ملا ہے''۔

یہ مختصر سا جائزہ تھا ان عناصر کا جنھوں نے مولانا واضح رشید حسنیؒ کے افکار کی تشکیل کی اور انھیں دور حاضر کا عظیم اسلامی مفکر، بلند پایہ صاحب قلم اور بے مثال ادیب بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ کے افکار ونظریات
البعث الاسلامی کے مستقل کالم "صور و اوضاع" کی تحریروں کے آئینے میں

محمد عبداللہ بن شمیم ندوی
(ریسرچ اسکالر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ)

البعث الاسلامی کی مختصر تاریخ:

ندوۃ العلماء سے پہلا عربی رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ تقی الدین ہلالی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا، ''الضیاء'' نامی یہ رسالہ ۱۹۳۱ تا ۱۹۳۵ تک چار سال کی مدت میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا محمد الحسنی کی عربی انجمن ''المنتدی العربی'' کے تحت اکتوبر ۱۹۵۵ میں ''البعث الاسلامی'' نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر مولانا محمد الحسنی رحمہ اللہ اور رئیس التحریر، مولانا اجتباء الحسن ندوی اور مولانا سعید الرحمان الاعظمی تھے۔ ۱۹۷۹ میں مولانا محمد الحسنی کے انتقال کے بعد مولا سید محمد واضح رشید ندوی کو اس کا رئیس التحریر بنایا گیا۔ یہ رسالہ اپنے ۶۴ سال پورے کر چکا ہے اور اب تک اس کی ۶۴ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

صور واوضاع کی ابتداء:

البعث الاسلامی میں بہت سے علمی، فکری، تربیتی، اور اصلاحی کالموں کے ساتھ ایک کالم ''العالم الاسلامی'' کے نام سے بھی شائع ہوا کرتا تھا جس میں عالم اسلام کے حالات کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لیا جاتا تھا، اس میں ہندو بیرون ہند اور عالم اسلام کے جید علماء ومفکرین کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ آگے چل کر اس کے ضمن میں ''صور و اوضاع'' نام کے ایک کالم کا اور اضافہ کیا گیا اس کالم کی ذمہ داری مولانا محمد الحسنی نے خود اپنے ذمہ لی، وہ اس میں حمیت ایمانی اور جذبہ جہاد کو مہمیز لگانے والی تحریریں لکھتے اور عالم اسلام کے حالات کے بارے میں مسلمانوں کو بیدار کرتے۔ ۱۹۷۹ میں ان کے انتقال کے بعد اس کالم کی ذمہ داری آپ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد واضح رشید ندوی کے سپرد کی گئی۔ مولانا ۱۹۷۳ میں ہی آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبے کو خیر باد کہہ کر ندوہ تشریف لائے تھے۔ مولانا نے اس کالم کی ذمہ داری کو بحسن خوبی انجام دیا۔ آپ نے ''صور واوضاع'' کی شکل میں امت مسلمہ کو ایسی قیمتی، اور وقیع تحریریں پیش کیں جو رہتی دنیا تک مسلمانوں کے جذبہ ایمانی کو بیداری کا سامان فراہم کرتی رہیں گی۔ اس کالم کے تحت مولانا نے ۳۸ سال تک مضامین لکھے۔ آپ کا پہلا مضمون اپریل ۱۹۸۰ میں "ظاهرة العصر الجديدة" کے عنوان سے اور آخری مضمون اسی ماہ فروری ۲۰۱۹ میں "مسئولية الدعاة والمصلحين لاصلاح الاوضاع الفاسدة" کے عنوان سے شائع ہوا۔

مولانا کی تحریروں کی خصوصیات اور ان کا موضوع:

آپ عربی کے بڑے صحافی اور ماہر ادیب تھے آپ کی تحریریں زیادہ تر صحافتی اسلوب میں ہوا کرتی تھیں، کہیں کہیں آپ ادیبانہ انداز بھی اپناتے تھے اور کبھی خطیبانہ اسلوب میں بھی تحریریں لکھا کرتے تھے لیکن کیوں کہ ''صور واوضاع'' میں مختلف احوال اور بدلتے حالات کی خبریں دینی ہوتی تھیں اس لیے اخباری زبان زیادہ استعمال کی جاتی تھی، آپ کی تحریروں میں علمی وفکری وزن ہوتا، آپ صلیبی واستعماری قوتوں کی رگ رگ سے واقف تھے، آپ مسلمانوں کو ان کی ریشہ دوانیوں سے ہوشیار کراتے رہتے، آپ کی تحریریں جودت فکری کی آئینہ ہوتی تھیں،

عالم اسلام کے حالات اور تاریخ پر اچھی نظر تھی اس لیے ان کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے اور ایک مکمل تجزیہ پیش کرتے۔

مولانا مفکر اسلام تھے، آپ کے علم وفکر اور ثقافت کا سرچشمہ قرآن وحدیث تھا، وہ عصر حاضر کے نبض شناس اور ماہر طبیب تھے، نہایت وسیع النظر اور مزاج نبوی کے علمبر دار تھے، مسلمانوں کو اب کیا کرنا ہے، اسلامی تہذیب وتمدن کا بیڑا کیوں غرق ہوا اور اب عظمت رفتہ کی بازآفرینی کیسے ممکن ہے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے، الغزو الفکری کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے، مولانا کی تحریروں کا یہی موضوع ہوا کرتا تھا۔ کسی ادیب یا صحافی کی تحریر میں من جملہ اتنی خصوصیات ملنا مشکل ہے جو خصوصیات مولانا کی تحریروں میں پائی جاتی تھیں، مولانا کی تحریروں میں غور وخوض کے بعد ۱۵ بڑی خصوصیات کا علم ہوا، جو اختصار کے ساتھ بیان کی جارہی ہیں۔

مولانا کی تحریر ''صورواوضاع'' کی خصوصیات:

۱۔ ایمان میں اضافہ: یہ تحریریں ایمان میں اضافہ اور اسلام کی حقانیت پر اطمینان قلب کا باعث ہوتیں۔

۲۔ تعلق بالقرآن۔ مولانا کی تحریروں کو پڑھ کر قرآن کریم سے تعلق مضبوط ہوتا، مولانا حالات کے تناظر میں قرآنی آیات کو اس انداز میں پیش کرتے گویا یہ آیت اسی پس منظر میں نازل ہوئی ہے، مولانا قرآن کی روشنی میں مسائل کو حل کیا کرتے جس سے قرآن کے ہر زمانہ میں ہادی ورہنما اور زندہ وجاوید ہونے پر یقین کامل نصیب ہوتا۔

۳۔ دشمنان اسلام کی سازشوں سے واقفیت ہوتی۔

۴۔ احوال عالم سے واقفیت ہوتی، خصوصا عالم عرب، عالم اسلام اور ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات جن پر میڈیا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے مولانا ان کو بیان کرتے اور حقائق سے پردہ اٹھاتے۔

۵۔ عالمی سیاست سے دل چسپی: صورو اوضاع کی ان تحریروں کو پڑھنے والا عالمی سیاست سے دل چسپی لینے لگتا۔ اس کی سیاسی بصیرت تیز ہوجاتی اور خصوصا عالم اسلام کی سیاست کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا۔

۶۔ پلاننگ، منصوبہ بندی: صور واضاع کی تحریریں قاری کو منصوبہ بندی کرنے اور مستقبل کی پلاننگ میں مدد کرتیں، مولانا ہر تحریر میں حالات کی مناسبت سے مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل بیان کرتے۔

۷۔ تاریخ اسلام سے واقفیت ہوتی۔

۸۔ مولانا کی ہر تحریر معلومات میں اضافہ کرتی۔

۹۔ مختصر اور جامع تحریریں: مولانا کے جملے جوامع الکلم ہوتے، آپ مضمون کو طول دینے کے سخت خلاف تھے، اچھے صحافی تھے اس لیے آپ کے مضامین ۳ سے ۵ صفحات سے زیادہ نہیں ہوتے، اتنے کم صفحات میں بھی آپ عالم اسلام کے مختلف حالات پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈال کر ان کا تجزیہ بھی کر لیتے اور لائحہ عمل بھی بتادیتے۔

۱۰۔ غیر جانبدارانہ بہترین تجزیہ نگاری کی مثالی تحریریں۔

۱۱۔ اسلامی صحافت کا بہترین نمونہ: مولانا ایک ماہر اسلامیات صحافی تھے، آپ نے صحافت کو اسلامی رنگ دیا، آپ غیر جانب دار ہوکر صرف حقائق کو بیان کرتے اور ایک ایماندار صحافی کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دیتے۔

۱۲ مرعوبیت کا ازالہ کرکے خود اعتمادی پیدا کرنے والی تحریریں ہوتیں۔

۱۳۔ ابتدائیہ نہایت منظم ہوتا، اختتام نہایت عمدہ ہوتا۔

۱۴۔ بہترین ادبی نمونے، اور نئی نئی اصطلاحات مولانا کی ان تحریروں کا خاصہ تھیں۔

۱۵۔ دلکش انداز بیان، اور بااثر تحریریں ہوا کرتیں۔

۱۶۔ دلچسپ عناوین: مولانا کے عناوین نہایت دل چسپ اور جاذب نظر ہوتے، عنوان ایسا دل کش ہوتا کہ مضمون پڑھنے کا دل چاہتا اور مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا کہ مولانا نے کس مہارت سے اس مختصر عنوان میں پورے مضمون کو سمو دیا ہے، مثلا مولانا اس طرح کے

عناوین قائم کرتے۔ بین الجد واللعب.. جمود اعداء الجمود.. من فقد رشده فلا يرتدع الا بالعقاب۔ والذی خبث لا يحرج الا نكدا.. متى حين ساعة الاحتساب۔ خبث بعد خبث۔ عداوة ، هل لها نهاية.

مولانا کی تحریروں کے موضوعات:

مولانا بسا اوقات ایک ہی تحریر میں مختلف موضوعات سے بحث کیا کرتے ،مولانا کی تحریروں میں جو موضوعات زیر بحث رہتے وہ یہ ہیں، تعلق مع اللہ، اخلاص نیت، اعمال صالحہ کا شوق۔ تحریکات اسلامیہ کا تجزیہ، منصوبہ بندی، مغرب کی سازشیں، مستشرقین کے جوابات، مغرب اور اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا تجزیہ، مغربی افکار، مسلم حکمرانوں کو نصیحت، حقیقت کا ادراک، ملی مسائل، عالمی سیاست، ہندوستان کے مسلمان، مدارس اسلامیہ، دعوت الی اللہ کی اہمیت و ضرورت، پیام انسانیت، وطنیت اور قومیت کا فتنہ، اسلامی معاشرے کی خصوصیات، مغربی معاشرے کی خامیاں، توکل علی اللہ۔

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی رحمہ اللہ کے افکار و نظریات البعث کے مستقل کالم ''صور و اوضاع'' کی تحریروں آئینے میں:

مولانا نے اس کالم کے تحت جتنی تحریریں لکھیں ہیں، تقریباً سب سے ہی استفادہ کیا گیا ہے، اور اس کے بعد مولانا کے افکار و نظریات کے تحت رائے قائم کرکے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔

ہماری دعوت کیا ہے؟

ہر انسان کی فکر اور اس کا نظریہ اس کی دعوت ہوتی ہے، وہ کس طرف لا رہا ہے کس چیز کو پیش کر رہا ہے، اس سے اس کے مقاصد کی تعیین کرنا آسان ہو جاتا ہے، مولانا کے افکار و نظریات خالص اسلامی تھے آپ کی تحریروں کا محور دعوت الی اللہ اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد تھا آپ مولانا علی میاں کی ایک تحریر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' ہم اسلام کامل کی دعوت دیتے ہیں جو ہر صاحب حق کو اس کا حق دیتا ہے، جو عقلوں کو منور کرتا ہے، دلوں میں دبی چنگاریوں کو بھڑکا تا ہے، اخلاق مہذب کرتا ہے، دلوں کو منور کرتا ہے، امتوں کو منضبط کرتا ہے، رجال کو پروان چڑھاتا ہے، قائدین وزعماء کی تربیت کرتا ہے، وہ سیاست بھی سکھاتا ہے اور سیادت بھی، وہ نہ تو ایک دم خشک و سخت ہے اور نہ ہی بالکل نرم تر، وہ نہ تو ترک دنیا کی دعوت دے کر راہب بناتا ہے اور نہ ہی عیش و عشرت میں مست کرکے مادیت پرست بناتا ہے، یہ تو وہ دین ہے جسے محمد ﷺ لے کر آئے ہیں، یہی ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا اور صحابہ کرام نے اسے عملی شکل میں پیش کیا، صدیاں اس کی خیر و برکت اور منفعت پر گواہ ہیں ۔ (البعث الاسلامی، مئی ۱۹۸۸)

اسلام کو عملی طور پر پیش کیجئے:

مولانا زبانی جمع خرچ کے بجائے عمل کی طرف توجہ دلاتے ہیں، کیوں کہ کیرکٹر جتنا مضبوط ہوگا دعوت بھی اتنی ہی باا ثر ہوگی مولانا فرماتے ہیں'' نبی اکرم ﷺ کا منہج اور اسلامی دعوت کے سلسلہ میں یہ طریقہ کار رہا ہے کہ اسلام کو اس کی عملی شکل میں پیش کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کو ایک سچی اور مؤثر مثال بنا کر پیش کیا جائے، اسلامی معاشرے میں امن و سلامتی ، اخوت و محبت، اور باہمی تعاون و تشاور کے جذبے کو پیدا کیا جائے، اس کے لیے خوب محنتیں کی جائیں۔ (العالم الاسلامی وغزو العلم والاعلام: مئی ۲۰۱۸)

دعوت کے فریضہ کو حکمت سے انجام دیا جائے: دعوت کا فریضہ انجام دیجئے۔

مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کی ایک بڑی وجہ دعوت سے ان کی بے توجہی ہے، مولانا اس کی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:'' آج میڈیا کے سامنے معاصر اسلوب میں علمی و فکری حقائق پیش کرنے کی ضرورت ہے اور اس سے بڑھ کر دعوت الی اللہ کے فریضے کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ انجام دینے کی ضرورت ہے، ارشاد خداوندی ہے۔'' اور اس سے بہتر بھلا کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف لوگوں کو بلائے اور نیک کام کرے اور کہے میں اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہوں، بدی کب بھلائی کی برابری کر سکتی ہے، برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو سب سے زیادہ

اچھا اور احسن ہو تو تم دیکھو گے کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی تھی وہ اب جگری دوست بن گیا ہے۔ (العالم الاسلامی و غزوالعلم والاعلام۔مئی،۲۰۱۸)۔

ذات رسول ﷺ سے والہانہ محبت ایمان کا تقاضا ہے:

اللہ کے بعد سب سے بابرکت ذات محمد ﷺ کی ہے، آپ کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔جس قدر آپ سے محبت ہوگی، اس قدر ہی اللہ کے نزدیک مقام بلند ہوگا، مولانا کو آپ کی ذات سے اس درجہ محبت تھی کہ جب بھی کوئی شان نبوی میں گستاخی کرتا آپ کا خون کھول جاتا، اور آپ مسلمانوں کی رگ حمیت کو پھڑکاتے، آپ سید تھے اس لیے دینی اور نسبی دونوں تعلق سے آپ ﷺ سے بہت زیادہ قریب تھے، آپ ۱۹۸۹ کے ایک مضمون میں فرماتے ہیں کہ ''نبی ﷺ کی ذات سے بے پناہ تعلق اور ان پر سب کچھ لٹا دینے کا احساس ہر دور میں مسلمانوں کی شان رہی ہے، ادنی سا مسلمان بھی نبی کی شان میں ادنی سی بے ادبی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اور آپ کے صحابہ اور ازواج مطہرات کی شان میں بھی بے ادبی کے مسلمان برداشت نہیں کرسکتا، وہ ان کا احترام اپنے والدین اور آباء اجداد سے زیادہ کرتا ہے بھلے ہی وہ اپنے گھر والوں کی بے عزتی ایک بار کو برداشت کر جائے لیکن نبی اور آپ کے صحابہ کی کسی بھی حال میں نہیں کرسکتا۔ ہر دور میں اس ایمانی غیرت کے بے شمار مثالی ملتی ہیں، لیکن افسوس یورپی مفکرین اور مستشرقین کی کتابوں نے اور مغربی تعلیم نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کے دلوں میں اثر انداز ہونا شروع کر دیا اور پھر نبی ﷺ کی ذات سے یہ والہانہ تعلق اور ایمانی غیرت وحمیت کی لو مدھم پڑتی گئی آج مصالح غالب آ گئے، دل سو گئے اور غیرت وحمیت کہیں گم ہوگئی''۔(والذی خبث لا یخرج الا نکدا۔اپریل ۱۹۸۶)۔

مغربی یلغار کا سبب ایک نفسیاتی جنون ہے:

مولانا عالم اسلام پر مغربی یلغار کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک نفسیاتی مرض جس نے پورے یورپ کو ایسے جنون کا شکار بنا دیا ہے جس نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے۔مولانا فرماتے ہیں''مغرب کو اسلامی دشمنی کا جنون لاحق ہوگیا ہے، پورا یورپ اسلام کو روکنے کے لئے کمر بستہ ہے، وہ ہر طرح کے ہتھکنڈے اپنا رہا ہے، یہ جنون وہی ہے جو اسے صہیونی جنگوں کے وقت لاحق ہوا تھا۔ان کا میڈیا، ان کے کتب خانے، ان کے سیاسی کمرے سب اسی جنون کا شکار ہوگئے ہیں۔دراصل یہ اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے جذبۂ جہاد سے خوفزدہ ہیں۔یہ احساس کمتری اور بے چینی ہے جسے یورپ نہ چاہتے ہوئے بھی ظاہر کر رہا ہے۔یہ اپنی تہذیب کو دنیا کے سامنے امن وشانتی کی تہذیب اور اسلامی تہذیب کو جنگ وجدال کی تہذیب کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔لیکن اس سب کا نتیجہ الٹا نکل رہا ہے۔لوگ اسلام سے قریب ہو رہے ہیں، اسلام روز بروز پھیل رہا ہے۔ارشاد خداوندی ہے''یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ لکافرون. (العالم الاسلامی وغزوالعلم والاعلام۔مئی،۲۰۱۸)

آستین کے سانپوں سے ہوشیار:

مولانا اپنے ایک جامع مضمون میں اسلامی قیادت کو درپیش خطرات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ''حالات ماضی سے بہت زیادہ مختلف ہیں، آج مسلمانوں کو سب سے بڑا خطرہ ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں کی صفوں میں رہ کر وہ کام کر رہے ہیں جو پہلے مستشرقین کیا کرتے تھے، وہ مسلمانوں کو ہر زبان میں اور ہر میدان میں مواد فراہم کر رہے ہیں، سیرت، تاریخ اسلامی، اور علوم اسلامیہ پر خوب کتابیں لکھ رہے ہیں، انٹرنیٹ، میڈیا اور کانفرنسوں اور جلسوں کے ذریعہ اپنے افکار کی ترویج کر رہے ہیں، جس سے مسلمان فکری کشمکش اور اسلام کے تئیں شکوک وشبہات کے شکار ہو رہے ہیں، (القیادۃ الاسلامیۃ امام تحدیات جدیدۃ: جنوری۔فروری۲۰۱۰)۔

جنگ تین محاذوں پر ہو رہی ہیں:

مولانا فرماتے ہیں کہ''مسلمانوں کے خلاف تین محاذوں پر جنگ چھڑ گئی ہے، عسکری جنگ، فکری جنگ اور ثقافتی جنگ اور مسلمانوں کو آج دونوں طرف سے خطرہ ہے ایک خارجی خطرہ اور اس

سے بڑا داخلی خطرہ، جولوگ اسلام کے خلاف محاذ آراء ہیں ان کو داخلی اور خارجی دونوں طاقتوں سے پوری پوری مدد ملتی ہے، اور جولوگ اس حملے کا مقابلہ کرنے پر قادر ہیں ان بے چاروں کے پاؤں تو باندھے ہوتے ہیں یا پھر انہیں صحیح صورت حال کا علم نہیں ہے، وہ لوگ یا تو خاموش رہ کر عافیت پسندی کی زندگی گزار رہے ہیں یا پھر دیگر چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، لیکن ان بڑے سنگین مسائل پر خاموش ہیں جن پر امت اسلامیہ کے مستقبل کا دارومدار ہے۔(ایضا)

مسلمانوں کا علمی وفکری جمود:

مولانا علمی وفکری جمود کے سخت خلاف تھے، کیوں کہ یہی وہ مرض ہے جو امت کو ترقی سے روکتا ہے، انسان اگر فکری جمود کا شکار ہو جائے تو اپنے ساتھ اپنے اہل حلقہ کو بھی جامد کر دیتا ہے، جب کہ اسلام کا خود یہ مزاج نہیں ہے۔ اگر یہ مرض ایک صاحب علم کو لاحق ہو جائے تو پھر معاشرے کی ترقی رک جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں'' آج کے دور میں بھی بعض ایسے تعلیم یافتہ اور مثقف افراد پائے جاتے ہیں جو باوجود اس کے کہ جاہل نہیں ہیں فکری جمود پر مبنی زندگی گزار رہے ہیں، وہ اندھی تقلید کرتے ہیں اور وہ جس کو اپنا بڑا اور بزرگ مان لیں پھر تو اس کو ایسا مقدس سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کے موقف سے اختلاف نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ زندگی کے کسی بھی منہج میں تبدیلی گوارا کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہ اب زمانے وہیں رک گیا ہے۔ وقت اب آگے نہیں بڑھے گا، گویا کہ وہ لوگ مسلسل ایسے بچپنے میں زندگی جی رہے ہیں جس میں بچہ ہر اس شخص کو جو اس سے بڑا ہو قابل جان لیتا ہے اور اس پر پورا یقین کر لیتا ہے۔ (جمود اعداد الجمود: دسمبر۔جنوری ۸۸۔۱۹۸۷ص۹۳)۔

مسلم تنظیموں اور تحریکات کی ناکامی کے اسباب:

آج دنیا بھر میں بہت سی مسلم تنظیمیں اور تحریکات کام کر رہی ہیں لیکن ان کی جدوجہد کے باوجود خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں اس ناکامی کا سبب بیان کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں۔'' عالم اسلام میں بہت سی اسلامی تحریکات اور فلاحی ادارے کام کر رہے ہیں لیکن وہ متحد نہیں بلکہ متفرق ہیں، بعض ایک جیسی تنظیمیں ایک ہی میدان میں ایک ہی کام کرنے لگتی ہیں اس وجہ سے ان کے مابین اختلافات اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اب ان تنظیموں کی ساری توانائی اصل کام کے بجائے ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں ضائع ہوتی ہے، جب کہ ہم جب دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں تو ان کی تنظیموں، اداروں اور تحریکات میں باہمی تعاون وتشاور سے کام کرنے کی عادت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ سب مل کر ایک ہی ہدف میں کام کرتے ہیں، جب کہ باہمی تعاون وتشاور تو مسلمانوں کا امتیاز ہے۔ اور اسلام کی یہی تعلیم ہے: وتعاونوا علی البر والتقوی۔

جمود کا دائرۂ کار اور اس کا علاج:

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مرض مسلمانوں میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے اور ہر میدان میں سرایت کر گیا ہے، فرماتے ہیں''مسلمانوں میں باہمی عدم تعاون اور باہمی مخالفت کا مرض سیاسی جماعتوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے بلکہ دینی مدارس وجامعات بھی اس سے مستثنی نہیں ہیں، تعصب وانانیت مسلمانوں کا شیوہ بن چکی ہے، اس لیے مسلمان باہم دست وگریباں نظر آتے ہیں، انہوں نے باہری جنگوں سے زیادہ آپسی جنگی چھیڑ رکھی ہیں، ہر صاحب عقل وشعور اور دردمند دل رکھنے والے کو اس کا علاج کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی شعور کو بیدار کرنے، اسلامی اخوت ومحبت کی فضا عام کر کے اور شریعت کو مطلق حاکم بنا کر اس مرض سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ (مشاکل المسلمین وواجبھم الدینی: جون ۲۰۱۸ص۸۶)۔

برے قلمکار:

مولانا بسا اوقات سخت تحریر بھی لکھا کرتے، جس کے ذریعہ ذہنوں کو جھنجھوڑا جاتا اور مرض کے علاج کی کوشش کی جاتی، مولانا ایسے لوگوں کے بارے میں جو اپنے قلم کا غلط استعمال کرتے ہیں فرماتے ہیں'' مال ودولت اور شہرت کے حصول میں اور اپنی کمینی طبیعت کی وجہ سے بعض شعراء وادباء شریعت وپاکباز لوگوں کے درپے ہو جاتے تھے،

آج یہی حال ہے بعض قلمکاروں کا ہے، جو جھوٹ شہرت اور نام ونمود کے لیے قلم کو وسیلہ بناتے ہیں وہ شریعت اور مخلص قائدین اور مصلحین امت کی پگڑیاں اچھالتے ہیں، ان کے خلاف افواہیں اڑاتے ہیں، ان کا کمینہ پن اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ وہ اپنے محسنین تک نہیں بخشتے۔ ان کی مثال بچھو کی طرح ہے جو بھی اس سے قریب ہوتا ہے وہ اسے ڈنس لیتا ہے۔ اگر کوئی شریعت مثقف ہو جائے تو اس کی سیرت و کردار میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن اگر کوئی کمینہ مثقف ہو جائے تو وہ مزید کمینہ سے کمینہ ہوتا چلا جاتا ہے اور ثقافت کو اپنے کمینہ مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ (من فقد الشدہ فلا یردع الا بالعقاب۔ دسمبر ۱۹۸۸:ص ۹۵)۔

انگریزوں کی فطرت:

مولانا انگریزوں کی رگ رگ سے واقف تھے کہ وہ اسلام دشمنی میں کس حد تک جاسکتے ہیں، مولانا انگریزوں کی فطرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''شروع سے ہی انگریزوں کی فطرت دھوکہ اور مکاری کی رہی ہے، اور دھوکہ باز اور مکار بچھو کی طرح ہوتا ہے جو ہر حال میں ڈسنے کے درپے رہتا ہے، اس کا یہ کمینہ پن موت پر جا کر ہی دم توڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بچھو کی اولاد اپنی ماں کو بھی کھا جاتی ہے یہی حال انگریزوں کا ہے وہ بھی ان بدترین وسائل کو تھامے ہوئے ہیں جو اپنے آباء اجداد نے اپنے دور استعمار میں اختیار کئے تھے۔ اس دور میں برطانیہ کی خباثت سے بڑھ کر کوئی خباثت نہیں ہے (خبث بعد خبث۔ ستمبر ۱۹۸۹)۔

دجال کی آمد سے پہلے اس کے دجل کا ظہور ہو چکا ہے:

مولانا فرماتے ہیں کہ دجال کی آمد سے پہلے اس کے دجل کا ظہور شروع ہو چکا ہے، آج کا سب سے بڑا دجل یہ ہے کہ مفاہیم و معانی کو الٹ دیا گیا ہے۔ اس دور میں جو جتنا بڑا دجال ہے اتنا ہی کامیاب ہے، مفاہیم ومعانی کو اس قدر الٹ دیا گیا ہے کہ پڑوسی اور ہمسایہ کو کچل دینے کا نام جہاد، حملہ کا امداد، جنگ کا نام امن وسلامتی، جیت کا نام ہار اور ہار کا جیت، نقصان کا فائدہ اور فائدے کا نقصان رکھ دیا گیا ہے۔ اگر صحافت، تعلیم، سیاست تمام کے تمام شعبے اس بیماری میں ملوث ہو جائیں تو عوام تک حقائق کیسے پہنچ پائیں گے...... دنیا آج اسی دجل کا شکار ہوئی ہے۔ (عصر الظلام وعصر النوی: مئی ۱۹۹۱)

تشدد محض سیاسی غرض سے کیا جاتا ہے:

مولانا فرماتے ہیں ''تشدد کے تین درجے ہیں، یا تو وہ کسی اقتصادی غرض سے کیا جاتا ہے، یا وہ کسی خبیث مقصد کو پورا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے یا پھر سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا جاتا ہے، تشدد کی یہ تیسری قسم سب سے زیادہ خطرناک ہے، دنیا میں سیاسی تشدد بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، اس کی کئی مثالیں ہیں، برما، شام، عراق میں اسی قسم کا تشدد ہو رہا ہے، ہمارا ملک ہندوستان بھی سیاسی تشدد کا شکار ہے، یہاں ہندو کٹر پنتی نوجوان مسلمانوں کو بہانے بہانے سے نشانہ بنا رہے ہیں، کبھی گوکشی کے نام پر کبھی ملک سے محبت کے نام پر یہاں تک کہ ٹرینوں میں بھی وہ محفوظ نہیں ہیں، مسلمانوں پر ہونے والے اس تشدد کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہے، یہ نہایت افسوسناک بات ہے۔ (معاییر مختلفۃ للعنف والامن، اکتوبر۔ نومبر ۲۰۱۷)۔

مسلمانوں میں شدت پسندی کا ذمہ دار کون:

دنیا میں جگہ جگہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ مسلم نوجوان شدت پسندی کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور مسلمان ہی مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں، ان مسلم نوجوانوں کی تربیت کی ذمہ داری کس کی ہے؟ کون اس کا ذمہ دار ہے؟ اس کے تعلق سے مولانا فرماتے ہیں ''اسلامی تعلیمات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام افراد کو اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اور وہ ان کے سلسلہ میں جواب دہ ہیں، نبی ﷺ کا ارشاد ہے، کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتۃ۔ اس لیے علماء کرام اور قائدین امت کے افراد کے بارے میں جواب دہ ہیں کیوں کہ ان کی ذمہ داری ہے من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ۔ غلط کاموں کو ہاتھ یا زبان سے روکنا ان کا فریضہ ہے، دنیا میں دہشت گردی اور شدت پسندی کا رجحان اسی لیے پیدا ہو رہا ہے کیوں کہ لوگوں میں اپنے تعلق سے جواب دہی کا احساس ختم ہو گیا ہے۔''

(من المسؤل عن الارھاب فی العالم: اکتوبر ۲۰۱۷۔ص: ۲۰)۔

اسلام پر دہشت گردی کا الزام محض سیاسی کھیل ہے:

انتخاب قریب آتے ہی ملکی فضا میں نفرتوں کا زہر گھول دیا گیا ہے، پلوامہ حملہ کی آڑ میں پوری مسلم قوم کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے، یہ سب محض سیاسی کھیل ہے، اس کے تعلق سے مولانا فرماتے ہیں ''جو لوگ واقعات پر نظر رکھتے ہیں اور دل ودماغ سے سوچتے ہیں وہ خود اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اسلام پر دہشت گردی کا الزام محض ایک تہمت اور سیاسی پروپیگنڈا ہے بلکہ دہشت گرد تو ہر کمیونٹی میں موجود ہیں ، یورپ اور ہندوستان میں بہت سی دہشت گرد تنظیمیں ہیں جو مسلمان نہیں ہیں اس طرح کا ماحول انتخابات کے وقت بنایا جاتا ہے جیسے کہ ہندوستان میں بی جے پی کے لیڈران مسلمانوں کے خلاف زہر افشانیاں شروع کردیتے ہیں وہ اس طرح کے نعرے لگاتے ہیں جس سے نفرتیں بڑھتی ہیں، ایسے ہی بیانات ٹرمپ بھی دیا کرتا ہے تاکہ اسلام دشمنوں کو خوش کر کے ووٹ حاصل کیے جائیں۔'' (الاستغلال العصبات الدینیۃ لکسب الفوز فی الانتخابات علی عمل غیر جمھور۔اپریل۔مئی ۲۰۱۷)۔

دشمنی کا ایک سبب غلط فہمی بھی ہے:

انسان جب دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اپنے درجے سے بہت نیچے اتر آتا ہے، دشمنی کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں لیکن اس کا ایک بڑا سبب غلط فہمی ہے مولانا فرماتے ہیں۔''کسی سے نفرت، جلن، حسد اور دشمنی کبھی کبھی بری تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی یہ زندگی کے تلخ تجربات کا نتیجہ بھی ہوتی ہے اس کے اثرات اس کے عمل اور اس کے طرز معاملہ سے ظاہر ہوجاتے ہیں، بہت سے لوگ انہیں کنٹرول کر کے صرف دلوں تک محدود رکھتے ہیں۔

دشمنی ایسی غیر انسانی حرکتیں کرادیتی ہیں جن پر بعد میں بڑی پشیمانی ہوتی ہے، ہمارے ملک کا ایک طبقہ بھی مسلمانوں کے سلسلہ میں اس احساس کا شکار ہے لیکن ان میں اکثر کی بنیاد غلط فہمیاں ہیں، اگر مسلمانوں نے غلط فہمیوں کو دور کر کے اس مرض کا علاج نہیں کیا تو آنے والا وقت اب سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا۔ (عداوۃ ھل لھا نھایۃ۔نومبر ۱۹۸۹۔ص ۹۷)۔

مجادلہ حسنہ کی اہمیت اور ٹکراؤ سے گریز:

اسلام اپنے مخالفین کے تعلق سے بھی نرم گوشہ رکھتا ہے، وہ پیار و محبت کی بات کرتا ہے اور ٹکراؤ سے روکتا ہے اگر کبھی بحث ومباحثہ کی نوبت آبھی جائے تو وہ مجادلہ حسنہ کا حکم دیتا ہے، مولانا اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔''موجودہ حالات میں داعیوں اور مصلحین کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور سیرت پاک میں ذکر کردہ دعوت واصلاح کے طریقوں پر غور وخوض کریں اور تاریخ کا مطالعہ کریں، کہ کس طرح داعیان اسلام نے جابر وظالم حکمرانوں کے سامنے دعوت کو پیش کیا تھا اور کیا کیا طریقے اپنائے تھے، تاریخ میں بہت ساری مثالیں ایسے مفکرین ومصلحین کی موجود ہیں جنہوں نے مذاکرات اور بات چیت کے ذریعہ ٹکراؤ کو ختم کیا، اور ناصحانہ انداز میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا، ان کے اس اسلوب نے مخاطبین کو متاثر کیا اور اچھے نتائج برآمد ہوئے۔آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم ناصحانہ انداز اور ہمدردانہ طریقوں کو اپنائیں، اور دعوت دین کے فریضے کو حکمت اور دور اندیشی سے انجام دیں، ساتھ ہی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے اور ان کے حکمرانوں کی فکری رہنمائی کریں اور اسلامی کارواں کو اعلی اقدار تک اور زندگی کو امن وسلامتی کے ساحل پر لانے کی کوشش کریں۔'' (مشاکل المسلمین و واجباتھم الدینیۃ۔جون ۲۰۱۸)۔

مغربی افکار کے تسلط کے اسباب اور مسلم حکمرانوں کی مغربی غلامی کی وجہ: مغربی افکار کی ترویج کیسے ہوئی، مسلمانوں میں یہ کیسے اثر انداز ہوئے اور مسلم معاشرہ مغربی معاشرہ میں کیسے بدلتا جارہا ہے اس کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:''مغرب کے ذریعہ اسلامی تاریخ کو مسخ کیا گیا اور ایسا گمراہ کن لٹریچر تیار کیا گیا کہ وہ مسلمان جو صحیح اسلامی تعلیم اور اسلام کے افکار ونظریات کو نہیں جانتے جب ان مغربی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں اسلام کے تئیں شکوک و

شبہات پیدا ہوجاتے ہیں، ذات رسول ﷺ تک سے بدگمانی ہوجاتی ہے، ان کے دل میں مغربی نظام تعلیم وتربیت کا تفوق بیٹھ جاتا ہے۔ مولانا آگے فرماتے ہیں۔''اسی مغربی تعلیم یافتہ طبقہ سے اسلامی ممالک کے حکمران اور سیاست داں بھی تعلق رکھتے ہیں، وہ اس نظام کے پروردہ ہیں اس لئے آسانی سے مغربی سازش کا شکار ہوجاتے ہیں وہ ان کی ہدایات کے تابع رہتے ہیں، کیوں کہ مغرب تمام اثر انداز ہونے والے وسائل پر قادر ہے، اس لیے وہ مالی امداد، تکنیکی امداد، عسکری امداد، اور دفاعی امداد کے وسائل کی فراہمی کے بدلے انہیں کنٹرول کرتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے، جس کی وجہ سے اسلام پسند حلقوں میں غصہ اور ناراضگی پیدا ہوتی ہے اور حکام اور دین پسندوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوجاتا ہے۔'' (العنایۃ الاسلامیۃ امام تحدیات حدیدۃ۔جنوری،فروری،۲۰۱۰)۔

معاصر اسلوب کی ضرورت:

مولانا فرماتے ہیں کہ آج ہمیں ماضی سے بھی زیادہ سخت خطرات لاحق ہیں کیوں کہ پہلے صرف عسکری خطرہ تھا آج اس سے زیادہ بڑا خطرہ علمی، فکری، ثقافتی خطرہ ہے۔اس لیے عسکری اسلوب کے بجائے آج علمی، فکری اور معاصر صحافت اور میڈیا کے اسلوب کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ہمیں دفاع کی حکمتوں کو جاننا ہے اور دشمنوں کے ہتھیاروں کو اسی کے خلاف استعمال کرنا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ دشمنوں کی جڑ کو جان کر ان وسائل کو جانا جائے جسے وہ ہمارے خلاف استعمال کرتا ہے: واعدوس لهم مااستطعتم من قوة.(القیادۃ الاسلامیۃ امام تحدیات جدیۃ۔جنوری،فروری ۲۰۱۰)۔

افغانستان کے متعلق پیشن گوئی:

مولانا مفکر اسلام تھے اور دور اندیشی مولانا کی صفت، حالات کا جائزہ باریک بینی سے لیا کرتے تھے، مولانا امریکہ کے افغانستان حملہ کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ عزت وکرامت کا تاج بدلتا رہتا ہے کسی گروہ یا تحریک کی ملکیت نہیں ہے اس دنیا میں یہی اللہ کی سنت ہے۔ارشاد باری تعالی ہے " وتلك الايام نداولها بين الناس " (ال عمران:۱۴۰) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور البانیہ کل دنیا کی بڑی طاقتیں ہوا کرتی تھیں، عالمی سیاست میں انہیں کا ڈنکا بجتا تھا، لیکن یہ قصہ پارینہ بن چکے ہیں، اس طرح ہر اس شخص کے لیے یہ مقام عبرت ہے جس کو طاقت اور غلبہ نے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، سورج.....ضرور غروب ہوتا ہے۔''

ابھی حال ہی میں خبر آئی ہے کہ امریکہ نے افغانستان میں گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور وہ اب وہاں سے فرار ہورہا ہے۔(تغییر منبع القوۃ العالمیۃ۔دسمبر ۲۰۱۷۔ص ۹۵)۔

انسان نما درندے:

پلوامہ حملے کے بعد جس طرح مسلمانوں کو دہشت زدہ کیا جارہا ہے اور ملک میں ماب لنچنگ کے واقعات بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں، خاص کر مسلمان اس کے زیادہ شکار ہورہے ہیں، مولانا اس طرح کے حملہ آوروں کو درندوں سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ درندوں اور جانوروں کی صفت ہے کہ ایک پوری جماعت یا گروہ سے صرف اس لیے نفرت کی جائے کہ ملزم کا تعلق اس جماعت یا گروہ سے تھا کیوں کہ جب شہد کی مکھی کو کوئی ایک انسان تنگ کرتا ہے تو وہ اس کا بدلہ تمام انسانوں سے لیتی ہیں، اسی طرح کتے بھی کرتے ہیں یہ انسانوں کا کام نہیں ہے۔(عداوۃ هل لها نهایۃ۔نومبر ۱۹۸۹۔ص ۹۶)۔

مسلمانوں کی پستی کا سبب:

اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے وہ متاثر کرتا ہے اور ہمیشہ غالب رہتا ہے، اور مشکلات زمانہ کا حل صرف اسی کے پاس ہے۔لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ اس کی طرف خود کو منسوب کرنے والے اپنی زندگی کے امور، افکار ونظریات اور زندگی کے طور طریقوں میں اس کی مخالفت کررہے ہیں وہ اپنے مسائل کا حل دوسری جگہ تلاش کررہے ہیں، یہاں تک کہ دعوت اور جہاد تک کے بارے میں دشمنان اسلام کی پیروی کررہے ہیں ان کی دعوت اب خالص اللہ کے لیے نہ ہوکر دیگر مذہبوں کی تحریکات کی دعوۃ کی طرح ہوگئی ہے، یہی سبب ہے پستی کا۔

وہ کامیاب اس صورت میں ہو سکتے ہیں جب اسلام کے سپرد خود کو کامل طور پر کر دیں، (دینامیکیۃ الاسلام ومسؤلیات المسلمین، جنوری، فروری ۱۹۹۱ء ص ۱۰۰)۔

محاسبہ کی دعوت:

مولانا مجھے اور آپ کو اور پوری امت کو دعوت احتساب دیتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں "آج جو کچھ دشمنوں کی جانب سے ہمیں برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور یہ ہم مختلف مقامات پر شکستیں کھاتے جا رہے ہیں، اب ہمارے لیے واجب ہو گیا ہے کہ اب ہم اپنا محاسبہ کریں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور غور وفکر کریں کہ ہمارے شکست در شکست کھانے کا سبب کیا ہے، یہاں تک کہ ہم اپنی دعوت کے طریقوں اور اسلامی نظام کو رائج کرنے کے لیے اختیار کردہ طریقوں کا پھر سے جائزہ لیں۔ قرآن کا صاف ارشاد ہے "اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اور ان کے لیے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا۔ جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو حالت امن سے بدل دے گا (النور: ۵۵) (العالم الاسلامی وغزو العلم الاعلام، مئی ۔۲۰۱۸: ص، ۹۶)۔

نفرتوں کو ختم کیجئے، محبت کو عام کیجئے:

مولانا پیار کے داعی تھے، وہ پیار بانٹتے تھے، اور نفرتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے کیوں کہ نفرتیں سوائے نقصان کے کچھ نہیں پہنچاتیں، جب کہ پیار پورے معاشرے کو ترقی سے ہم کنار کرتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں "جہالت کو جہالت سے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا علاج تعلیم وتفہیم ہے۔ اسی طرح نفرت کا علاج نفرت نہیں ہے۔ اسے محبت، نرم مزاجی اور رحم دلی سے ختم کیا جا سکتا ہے، یہی وہ منہج ہے جسے ہمارے نبی ﷺ نے اپنایا اور اسی منہج کو اپنا کر ہم کامیابی وکامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔" (فأما الزبد فيذهب جفاء أ۔ اپریل ۲۰۱۰)۔

آخری وصیت:

مولانا کو معلوم تھا کہ آنے والے حالت نہایت سخت ہیں، اس میں مسلمانوں کے ایمان اور صبر کا بڑا امتحان ہونے والا ہے اس لیے انتقال سے پہلے اپنے بھتیجے مولانا محمود الحسن حسنی سے سورہ آل عمران کی آخری آیت "يـاايها الـذين امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا" (اے ایمان والو تم ثابت قدم رہو اور ایک دوسرے کو تھامے رکھو اور جہاد کے لیے تیار رہو، اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم مدد کو پہونچو) پڑھ کر اس سے لطف واندوز ہوتے ہوئے فرمایا: "زندگی کے نشیب وفراز میں صبر اور تقوی کو تھامے رہو، قربانیوں کے لیے تیار رہو، اسی میں کامیابی مضمر ہے، یہی دین کا خلاصہ ہے اور اسی میں زندگی کی حقیقی کامیابی کا راز ہے۔

۲۔ اس آیت مبارکہ کو درو دیوار پر آویزاں کرنا

۳، اہل کفر ونفاق کے غلبہ اور ان کے دور دورے سے مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہئے، اور نہ ہی اس دھوکہ میں آنے کی ضرورت ہے کہ اہل ایمان کے لیے تو آخرت ہے یہ دنیا تو چند روزہ ہے (از۔ مولانا اکرم ندوی)۔

اختتام:

یہ تھے مولانا کے افکار ونظریات "البعث کے کالم صور واوضاع" کی روشنی میں ہم مسلمانوں کو زندگی کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے مولانا کے افکار نہایت معاون ہیں، مولانا اپنی ان قیمتی تحریروں کے ذریعہ ہمیشہ ہمارے درمیان موجود رہیں گے، اور یہ تحریریں بھی مولانا کے لیے صدقہ جاریہ رہیں گی۔ اصل معاملہ عمل کا ہے، اللہ ہم سب کو ان ہدایات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

نظام تعلیم وتربیت، اندیشے تقاضے اور حل- ایک مطالعہ

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی
اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا سید واضح رشید ندویؒ (۱۹۳۳-۲۰۱۹) اسلامی تہذیب وثقافت کی بازیافت کے لئے اپنی عربی تحریروں میں زندگی بھر کوشاں اور خواہاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی سادگی، بے نفسی، خدا ترسی اور انسان دوستی کا مظاہرہ پوری زندگی میں کیا۔ قول وعمل کے اس پیکر خاکی نے بطور خاص عربی زبان و ادب کی بامعنی صحافت کو فروغ دیا۔ اسلامی افکار ونظریات کی اشاعت کو البعث الاسلامی اور الرائد کے ذریعہ انھوں نے دنیا کے سامنے ادبِ عالیہ میں پیش کیا۔ درحقیقت ہندوستان میں جدید عربی ادب کے فروغ میں مولانا ندوی کی خدمات کے مختلف گوشے اسکالرز کی توجہ اور تحقیق کے طالب ہیں۔

۱۳۶ صفحات پر مشتمل ''نظام تعلیم وتربیت'' دراصل مولانا کے عربی مقالات کا اردو قالب ہے جو برسوں کی صحافت کا ثمرہ ہے۔ ان مقالات کے عربی متن کو البعث الاسلامی اور الرائد کی مختلف اشاعتوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اصلاً ان کا ترجمہ مولانا وثیق ندوی نے کیا ہے جبکہ بعض کے ترجمہ کی سعادت مولانا محمد اکرم کو بھی حاصل ہوئی ہے۔ ان مقالات میں سے بعض وہ ہیں جو ندوہ کے سمیناروں میں پیش کئے گئے تھے جبکہ کچھ اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمینار کے لئے لکھے گئے اور بیشتر وہ ہیں جو مذکورہ عربی جرائد کے لئے لکھے گئے تھے۔

عالم اسلام میں اسلامی فلسفہ تعلیم اور نظام و نصاب تعلیم جس بحران کا شکار ہے، اس کتاب کے مختلف مقالات کے ذریعہ ان پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ عالم عربی کو بطور خاص اور ہندوستانی مدارس کو بطور عام بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانائے محترم ان مدارس کو اپنی اس تحریر کے ذریعہ ماضی کے نظامِ تعلیم اور فلسفہ تعلیم کی یاد دلاتے ہیں۔ اور معاصر تعلیمی عناصر کے مہلک خطرات سے انھیں آگاہ کرتے ہیں۔ پوری کتاب میں مغربی سامراج کے نظریہ تعلیم کے منفی اثرات کے خلاف سرگرم جہاد کی فضا پائی جاتی ہے۔ تعلیم کے ذریعہ مغربی ثقافت کو مضبوط و مستحکم کرنے کی کوششوں کا ذکر تقریباً تمام مقالات میں مختلف اسالیب میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے بعض مغربی مفکرین کا ایک قول نقل کیا ہے اور فکرمندی کی اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک مغربی محقق کا یہ کہنا کہ انھیں تعلیمی میدان میں جو کامیابی ملی ہے وہ صلیبی جنگ میں بھی نہیں مل سکی۔ (ص: ۴۵)

اس کتاب کے اہم مباحث یہ ہیں

صلیبی جنگوں کے بعد، تجدد کے نام پر تقلید مغرب کی دعوت، سامراجی ذہنیت، سامراجی تربیت کے اثرات، تعلیم وتربیت کے قدیم وجدید عناصر، قدیم نظام تعلیم کے خصوصیات، نصاب تعلیم اور دعوتی تقاضے، نصاب تعلیم میں عربی زبان وادب کی اہمیت، اسلامی نظام تربیت کے اثرات، ثقافتی پروگرام اسلامی تناظر میں، نصاب تعلیم سے زہر آلود مواد کے ازالہ اور عمدہ نصاب تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت۔

کتاب کے مذکورہ عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغربی اور اسلامی نظام تعلیم کا اس کتاب میں بھرپور تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تحریریں کسی مرتب کتاب کے پیش نظر تیار نہیں کی گئی تھیں لہٰذا ان کے اندر تصنیفی تسلسل کی کمی ہے لیکن مترجم موصوف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مولانا واضح کی منتخب تحریروں کو یکجا کیا اور انھیں اس

خوبصورتی سے ذیلی عناوین کا ہار پہنایا کہ اس کے مستقل صنعت تصنیف ہونے کا گمان گذرتا ہے۔ مولانا واضح ندوی خود فرماتے ہیں کہ کتاب کا مقصد حل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ توجہ مبذول کرانا ہے۔ یہ کتاب انکے احساسات اور تجربات پر مبنی ہے (ص:۱۸)

مولانا ندوی نے پیش لفظ میں اپنی بے چینی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''مغرب کی فکری، سیاسی اور عسکری برتری اور دنیا کے اکثر حصوں پر کنٹرول کے بعد اس کا نظام تعلیم وتربیت عام ہوگیا۔ اس سے مشرقی ممالک جو اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات رکھتے تھے صرف محفوظ ہی نہیں رہ سکے بلکہ پورے طور پر مغربی نظام کو قبول کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس نظام کے ایجابی اور سلبی اثرات کا اندازہ ایک مدت کے بعد ہوا۔ جب کئی نسلیں اس نظام سے متاثر ہوکر زندگی کے مختلف شعبوں میں اثر انداز ہوئیں، اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ پر پڑے، سیاسیات، اقتصادیات، سماجیات اور انفرادی واجتماعی زندگی حتیٰ کہ معاملات، والدین اور اولاد کے تعلقات اور حکام اور رعیت کے تعلقات پر اس کے اثرات اصحاب فکر نے محسوس کئے (ص:۱۶)

قدیم نظام تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قدیم نظام تعلیم مغربی سامراج کے دور میں تیار کیا گیا تھا اور اس وقت کی ضرورت اور حالات کو سامنے رکھا گیا تھا اور نصاب میں جو مضامین رکھے گئے تھے ان کی کتابیں جو اس وقت میسر تھیں، عام طور پر ان کو شامل کیا گیا تھا۔ ان موضوعات کی کتابوں کے انتخاب میں نظر ثانی کرنے اور زندگی کے مسائل سے متعلق نصابی مواد کو شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دینی وعربی مدارس کے فارغین زندگی میں موثر رول ادا کرسکیں اور حالات ومسائل سے واقف ہوسکیں۔

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی، (آکسفورڈ) نے اس کتاب پر عالمانہ تقریظ پیش کی ہے اور مشرق ومغرب میں برپا تعلیمی وتربیتی تحریک پر چشم کشا اشارات کئے ہیں۔ انھوں نے فرنگی تہذیب میں عیسائی مشنریوں کے خلوص، قربانیوں اور نشان راہ کا تذکرہ کرتے ہوئے خود مولانا واضح رشید ندویؒ کی کتاب سے متعدد اقتباسات نقل کرکے اہم پہلوؤں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ انھوں نے صموئل زویمر، مسٹر ٹاکلی اور پروفیسر گب کے حوالوں سے مغربی مفکرین کے تعلیمی منصوبوں پر روشنی ڈالی ہے۔ واضح رشید کہتے ہیں:

''تقریباً ڈیڑھ سو سال سے مغرب میں جو نظام تعلیم غالب ہے اس میں اس پر توجہ نہیں ہے کہ لوگ اچھے بنیں اور اچھی زندگی گذاریں بلکہ ساری توجہ اس پر ہے کہ کس طرح طلبہ ان علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں جن سے انھیں پیسہ کمانے اور معاش کو بہتر بنانے میں مدد ملے۔ گویا تعلیم جدید کا محور صرف مادہ ومال ہے اور یہ چیز زہر کی طرح دنیا کے ہر حصہ کے نظام تعلیم میں سرایت کرتی جارہی ہے۔۔۔۔ اس وقت تعلیم کی کامیابی کے جانچنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ طلبہ اچھی زندگی گذارنے کا طریقہ سیکھیں یا کس طرح اپنے معاشرے کے ثقافتی پہلوؤں کو سمجھیں اور پھر ان کے اندر اپنا کردار ادا کرسکیں، بلکہ معیار یہ ہے کہ یہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کتنی آمدنی پیدا کرنے کا اہل ہے''۔ (ص:۳۰)

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے ایک جگہ مولانا واضح رشید ندوی کے خواب کو خود ان کے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے:

''اسلام کو درپیش خطرات کے مقابلہ کے لئے ہمیں جامع علماء کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہے، جو دنیا کے مختلف حصوں میں تعلیم و تربیت اور تحریک ودعوت کا کام انجام دیں، اور میدان میں نکل کر مقابلہ کی صلاحیت کے ساتھ اسلام کی خدمت انجام دیں۔ اور ایسا اس وقت ممکن ہے جبکہ ایک ایسا تعلیمی، تربیتی اور ثقافتی نظام تیار کیا جائے جو قدیم وجدید کا جامع ہو، جس میں سمٹنے کے بجائے پھیلنے کی صلاحیت ہو، جس کے فارغین دعوتی جذبہ، علمی صلاحیت، عصری واقفیت اور مؤلفانہ جرأت واعتماد کے ساتھ مسجد، مدرسہ ہی میں نہیں، بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں دعوتِ اسلام کا کام انجام دیں، اس کے لئے ہمیں تعلیمی اور تربیتی نظام کی ازسرِ نو تنظیم کرنی ہوگی''۔

کتاب کا تفصیلی جائزہ

۱۔ آغازِ کتاب میں صلیبی جنگوں کے بعد کی کوششوں میں سامراجی ممالک کا متحدہ محاذ اور اس ضمن میں بعض تعلیمی تجربات کا ذکر کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

الف: مسٹر ٹاکلی TAKLE کا ایک اقتباس اس ضمن میں صلیبی

منصوبوں کی وضاحت کرتا ہے۔وہ کہتا ہے:

''یہ ضروری ہے کہ ہم اسکول قائم کرنے کی ہمت افزائی کریں، اور مسلمانوں کو مغربی تعلیم پر ابھاریں، بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ صرف انگریزی زبان سیکھنے سے ان کا ایمان واعتقاد کمزور پڑ گیا، اس لئے کہ ہمارے کورس کی کتابیں پڑھنے کے بعد کسی مذہبی مقدس کتاب پر ایمان رکھنا آسان نہیں رہتا۔''(ص:۳۸)

ب: ثقافتی حملوں کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے گبؔ نے جو اندوہناک خبر دی ہے مصنف گرامی قارئین کو اس طرح باخبر کرتے ہیں:

''صحافت اور عصری اسکولوں کے ذریعہ جاری ہماری تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں پر ایسا اثر ڈالا کہ بڑی حد تک دین سے ان کا رشتہ منقطع ہو گیا۔''

ج: گلاڈسٹون Gladstone (م۱۸۹۸) نے برطانیہ کی پارلیامنٹ میں قرآن کو ہاتھ میں لے کر کہا تھا: جب تک یہ کتاب زمین پر باقی ہے، ہم مسلمانوں پر غالب نہیں آسکتے۔(ص۔۳۹)

د: ڈاکٹر واٹسن Watson کہتا ہے:

''ہم مدارس اسلامیہ میں قرآنی تعلیم کے نتائج پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ہم کو مدارس اسلامیہ سے بڑا خطرہ لاحق ہے کیونکہ قرآن اور اسلامی تاریخ یہ دو بڑے عظیم خطرے ہیں جن سے عیسائی مشنری کو خوف لاحق ہے''(ص:۴۰)

ان چار معروف مستشرقین کی عبارتوں سے درج ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں مثلاً

۱۔فصیح عربی زبان کے خلاف مہم چلانا، دینی مدارس کی تحقیر کرنا، علماء کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا۔

۲۔قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے تئیں ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔

۳۔قرآن وحدیث میں علمی وتاریخی اشکالات پیدا کرنا۔

۴۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نشانہ بنانا، اور صحابہ کرام کو مجروح کرکے ان پر سے اعتماد کو ختم کرنا۔

۵۔اسلامی تاریخ مسخ کرنا، مسلمانوں کے کارناموں پر پردہ ڈالنا، مختلف مسلکوں کے ماننے والوں میں کشمکش پیدا کرنا اور غلط خیالات رکھنے والوں کی تائید اور ان کی مالی مدد کرنا۔

مغربی استعمار نے مدارس کے خلاف جو محاذ آرائی کی اس کا خلاصہ کرتے ہیں کہ یورپ نے جنگ کی حکمت عملی کو چھوڑ کر تعلیم و تربیت کے میدان کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا اور وسیع پیمانے پر مسلم ممالک کے اندر مشنری اداروں کا جال بچھا دیا۔اس کام کے لئے اس نے ان مسلمانوں سے تعاون حاصل کیا جو خود یورپ کی درسگاہوں کے فارغ تھے اور اب تجدد کے نام پر تقلیدِ مغرب کی عمومی دعوت دی گئی اور حیرت انگیز بات یہ سامنے آئی کہ جس کورانہ تقلید کو مغرب نے غیر سائنسی قرار دیا تھا اور اجتہاد وابتکار کی پرزور وکالت کی تھی، خود یورپ کے ان مسلم شاگردوں نے مغرب کی اندھی تقلید شروع کر دی۔ مسلمانوں کے اس گروہ کو مولانا ندوی مغرب کا سعادت مند شاگرد قرار دیتے ہیں جس نے اپنے استاد کے کمالات کو دیکھ کر اس کو لغزشوں اور غلطیوں سے ماورا قرار دیا۔(ص:۴۸)

۲۔ عنوان ''سامراجی ذہنیت'' کے تحت مصنف گرامی عیسائیت کی ترویج، اسلام دشمن عناصر کی پشت پناہی، اسلامی شعائر پر پابندی، اسلام ہی نشانہ ہے، مذہب انسان کی بنیادی ضرورت ہے جیسے ذیلی عناوین پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔سامراجی تربیت کے اثرات کے ضمن میں دینی بیزاری، نسلی تفریق، تباہ کن رجحانات، خوفناک صورتحال اور موجودہ فساد کا حل جیسے عنوانات پر قاری کی معلومات میں اضافہ کرکے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔

۳۔ تعلیم وتربیت کے قدیم وجدید عناصر کی سرخی اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔کہتے ہیں ماضی میں تعلیم وتربیت کے تین عناصر ہوتے تھے: طالب علم، کتاب اور استاد۔اہم بات ماضی میں یہ تھی کہ تعلیم کا تعلق پیشوں اور نوکریوں سے نہیں تھا۔لیکن موجودہ دور میں نظام تعلیم کے اندر فلسفہ تعلیم نے محوری صورت اختیار کر لی ہے۔چنانچہ آج اس کے عناصر میں چند کا اضافہ ہو گیا ہے مثلاً استاذ کی صلاحیت ولیاقت، اس کا فکری مسلک، طریقۂ کار وسلوک، ملک کے تقاضے اور حالات، تعلیمی ماحول، ذرائع ابلاغ اور ساتواں عنصر: فلمیں، ڈرامے، واقعات و حکایات ہیں۔مولانا ندوی کہتے ہیں کہ یہ مغربی نظام تعلیم کی ترتیب

ہے جو مغرب ومشرق کے سارے ملکوں میں مغرب کی تقلید میں رائج ہے۔۔۔عالم اسلام کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کا نظام اس کے فلسفۂ حیات اور تصورِ زندگی کے مطابق ہو،علم اور تہذیب وتمدن کا صحیح مفہوم ومطلب بیان کیا جائے۔اور اسلامی تصوزندگی اور فلسفۂ حیات کی پابندی کی جائے۔(ص:۶۸)

۴۔ مصنف گرامی اسلام کے نظریہ تعلیم کو معرفت الٰہی سے جوڑتے ہیں۔حدیث نبوی:اللھمّ انیّ اعوذبك من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع و من دعاءٍ لا یستجاب ، کے ذریعہ علم نافع اور علم غیر نافع کی تقسیم کرتے ہیں۔مولانا کی اس تقسیم کے ذریعہ دینی اور دنیاوی تقسیم کی غیر محمود بحث ختم ہو جاتی ہے اور محققین مصنوی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں قدم رکھ سکتے ہیں۔علم کی تعریف کے لئے آیت کریمہ "انما یخشیٰ اللّٰہ من عبادہ العلماء اور حدیث نبوی: العلماء ورثۃ الانبیاء کے حوالے پیش کرتے ہیں۔

۵۔ نصاب و نظامِ تعلیم سے جڑا ہوا ایک مسئلہ دعوت دین کی تبلیغ و ترسیل کا ہے۔مصنف گرامی کہتے ہیں کہ علمائے کرام نے عالم اسلام میں استعماری نظام تعلیم کی سنگینی کو فوجی طاقت سے بڑا خطرہ تسلیم کیا ہے۔اس ضمن میں ہندوستانی علماء کے مثالی کردار کا ذکر جلی حرفوں میں کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اس سرزمین میں عربی و فارسی میں اسلامی علوم کی متعدد ماہر شخصیتیں پیدا ہوچکی ہیں جنھوں نے غیر اسلامی رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔عالم اسلام کی شخصیتوں میں امام ابو حامد الغزالی نے یونانی فکر وفلسفہ کا جواب المنقذ من الضلال لکھ کر دیا۔

۶۔ اسلامی علوم کی حفاظت کے لئے عصری علوم کی تعلیم کے تحت چشم کشا گفتگو کے دوران واضح لفظوں میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اسلامی علوم کے حاملین اور علماء کی ذمہ داری اس پس منظر میں یہ ہے کہ اسلامی علوم کو مغربی تشریح سے آزاد کریں،مغرب کے شکوک و شبہات کا جواب دیں ، اور ان علوم کو مغربی آلوگی سے صاف کر کے بالکل خالص طور پر زمانہ کی زبان اور اس کے مزاج کے مطابق پیش کریں،اس طرح کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ان کی ترجمانی قابل قبول ہوجائے اور باطل اعتراضات کی تردید ہوجائے،مغرب کے اثر سے علمی حلقوں کو اسی وقت آزاد کیا جاسکتا ہے جب صحیح الفکر علماء دینی روح اور علمی وتحقیقی مطالعہ کے ساتھ مغرب کے علماء کے تیار کئے ہوئے مراجع کے مقابلہ میں ان سے بہتر مراجع پیش کرسکیں،اس کے لئے ضروری ہے کہ مغربی علماء کے نظریات ان کے طریقہ بحث اور مآخذ کا مطالعہ کیا جائے ، ان کے نظریات کا تجزیہ کیا جائے۔یہ کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو قلبِ مومن ، داعیانہ جذبہ اور علمی وتحقیقی صلاحیت رکھتے ہوں(ص:۹۳)۔

۷۔ دین کی غلط تفہیم وترجمانی کو ایک تہذیبی خطرہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مقابلہ صحیح العقیدہ علمائے کرام ہی کر سکتے ہیں۔چنانچہ اسلام پسند محققین کی خدمات کے اعتراف کے ضمن میں علامہ شبلی نعمانی کی کتاب الجزیہ فی الاسلام کو سرفہرست رکھتے ہیں۔علامہ نے ''اسکندریہ کتب خانہ'' کے جلائے جانے کے افسانہ کو دروغ گوئی ثابت کیا۔مولانا واضح ندوی نے دیگر محققین میں علامہ سید سلیمان ندوی،مولانا ابوالحسن علی ندوی،عبدالماجد دریابادی اور سید ابوالاعلی مووودی کی تحقیقات کا اعتراف کیا ہے۔عالم عربی کی صف اول کے محققین میں مالک بن نبی ،سید قطب،محمد المبارک، مصطفیٰ سباعی زرقاء،محمود محمد شاکر،یوسف قرضاوی اور سعید رمضان کی علمی وتحقیقی مساعی کو خراج عقیدت پیش کی ہے۔مولانا اپنا تجزیہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''ان تصنیفات کے اثرات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ متعدد انقلابی عرب حکومتوں نے ان میں سے بہت سی کتابوں پر پابندی لگادی ،بعض حکومتوں نے ان کتابوں کو اسرائیل سے زیادہ خطرناک تصور کیا،ان حکومتوں کے خیال میں اسرائیل کے ساتھ صلح ممکن ہے۔لیکن ان مفکرین اور ان کی کتابوں کے ساتھ صلح ناممکن ہے۔ان مفکرین کی اجتماعی قوت کے فقدان کے باوجود رائے عامہ پر ان کا اثر کافی ہے۔ان کی کوششوں اور تصنیفات سے دعوت اسلامی کو کافی فائدہ حاصل ہوا،انھوں نے مغربی مفکرین اور مستشرقین کے اعتماد کو کم کرنے میں بڑی مدد کی اور ان کتابوں سے ایسا ذہن بنایا جس کو اسلام پر اعتماد اور عصر حاضر میں اس کی تطبیق کی صلاحیت کا یقین حاصل ہے۔(ص:۹۶)نصاب تعلیم میں عربی زبان و ادب کی اہمیت پر کلام کرتے ہوئے عربی زبان کو جملہ اسلامی علوم کی کنجی قرار

دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین کے نابغہ روزگار ہستیوں کی خدمات کو اسلامی علوم کے مختلف گوشوں میں گناتے ہیں جن کی تحقیقات کی پذیرائی عالم عربی میں ہوچکی ہے۔(ص۱۰۰۔۱۰۱)اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے درس نظامیہ کے نصاب میں نفحۃ الیمن اور مقامات حریری کی جگہ ندوۃ العلماء کی جانب سے تیار کردہ بعض کتب کا حوالہ دیتے ہیں۔

۸۔ اسلامی تہذیب کے فروغ میں تعلیم کے کردار پر مصنف گرامی نے جابجا اپنے رشحات قلم سے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔اس ضمن میں مغربی نظامِ تعلیم وتربیت، انسان کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر، مادّہ پرستانہ اور اسلامی ذہنیت کا جائزہ نیز اسلام کے متوازن نظام تربیت کی وکالت قرآن وسنت کے حوالے سے کرتے ہیں۔اسلامی تربیت کی خصوصیات کے ضمن میں قرآن کے ذریعہ ترتیب دیئے گئے نظام کی وضاحت ۱۳ نکات کے اندر کرتے ہیں۔(ص ۱۲۱۔۱۲۲) ثقافتی پروگرام کو انسان کی ضرورت قرار دیتے ہیں۔مولانا کا خیال ہے کہ تعلیم و تربیت کے لئے اسلام بعض تفریحی مشاغل کی اجازت دیتا ہے۔ اس ضمن میں وہ حدیث رسول سے استدلال کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ بعد کے ادوار میں دوڑ، تیراکی، تیر اندازی، کہانیاں، طرحی مشاعرے، شعری نشستیں اس مقصد کے لئے قائم کی جاتی رہیں ہیں۔ مولانا ندوی موجودہ دور میں کھیلوں کے نقصانات اور وسائل ابلاغ میں فاسد عناصر کی شمولیت پر تنقید کرتے ہیں اور شعبہ تدریس سے ان کو دور رکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔

خلاصۂ بحث:

گذشتہ صفحات میں تعلیم وتربیت پر مبنی مولانا واضح رشید ندوی کی ایک کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا۔اس کتاب میں عالمی سطح پر استعماری طاقتوں کے ذریعہ تیار کردہ نظام تعلیم وتربیت کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔مغربی فلسفۂ تعلیم اور نظام تعلیم نے اسلامی دنیا میں جس مضبوطی کے ساتھ اپنے پنجے گاڑ لیئے ہیں اس کا پوسٹ مارٹم بھی کیا گیا ہے۔اس طرح زیر مطالعہ کتاب عالمی تناظر میں علوم کے اسلامیانے کے عمل میں متعدد مفید پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

چونکہ یہ تحریریں صحافتی ضرورت کی تکمیل کے لئے وجود میں آئیں لہٰذا ان میں تکرار ہے اور مصادر ومراجع کی نشاندہی کی ضرورت برائے نام محسوس نہیں کی گئی ہے۔بایں ہمہ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا واضح رشید ندویؒ کے یہ اشارات ان کی صلاحیتِ فکر اور سلامتِ طبع کی شاہ کار ہیں۔اس کتاب کے دو پہلو چشم کشا ہیں، اول یہ کہ مصنف گرامی کے مطابق مدارس کے نصاب کو دعوت دین کا علمبردار ہونا چاہیے اور دوم یہ کہ مدارس کے نصاب میں حالات وظروف کے مطابق حذف اضافہ کی روش کو جاری وساری رہنا چاہئے۔حقیقت یہ ہے کہ بشمول ہندوستان، مشرقی دنیا میں پھیلے ہوئے ہزاروں اسلامی مدارس اور ان کے نظام تعلیم کو زمانہ ساز بنانے کی فکر مصنف علاّم کی داعیانہ اور مصلحانہ فکر کی غماز ہے۔

آخری بات یہ کہ قاری کو اس کتاب کے مطالعہ سے اپنی محرومیوں، نا اہلیوں اور اسلام دشمن طاقتوں کے منصوبوں اور کامیابیوں کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔اس موقع پر اس کی آرزو ہوتی ہے کہ استعماری دور سے قبل اور بعد کی مسلم دنیا نے تحقیق وتدریس کے میدان میں جو قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں اور جن کا سلسلہ کسی زمانہ میں نہیں رکا، ان کا بھی کسی باب میں ذکر آجانا چاہئے۔حقیقت یہ ہے کہ تنویر اور اجتہاد کے یہ رویے مدارس کے علاوہ عصری درسگاہوں میں بھی انجام دئے جاتے رہے ہیں مثلاً مصر، ایران، ملیشیا اور پاکستان کی جامعات اس پر شاہد عدل ہیں۔امید کی ان شعاعوں سے قاری کے اندر اپنے مستقبل کو منور کرنے کا مزید داعیہ پیدا ہوسکتا ہے۔

رقم السطور کی یہ خواہش ہے کہ مولانا واضح رشید ندوی کی تحریروں میں قدیم وجدید کا جو متوازن پہلو نصاب ونظامِ تعلیم سے متعلق ہے، انہیں تلاش کرکے اس کتاب کے نقشِ ثانی میں جگہ دی جائے تاکہ احتساب وجائزہ کے بعد ایک عملی تعبیر بھی قارئین کے سامنے نکھر کر سامنے آجائے۔امید واثق ہے کہ جناب محمد وثیق ندوی، ترجمان شیخ واضح رشید ندوی اس پہلو پر ضرور توجہ دیں گے تاکہ نقشِ ثانی مزید مفید ومربوط ہوسکے۔

☆☆☆

مولانا محمد واضح رشید ندویؒ کی تحریروں میں قرآنی استدلال
(محسن انسانیت کا مطالعہ)

ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ دینیات (سنی) ویمنس کالج، اے ایم یو، علی گڑھ)

مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ (۱۹۳۳-۲۰۱۹ء) علم وفضل کے بلند مقام پر فائز، ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے عظیم الشان ادارہ کے معتمد تعلیمات، عربی زبان وادب کے ماہر اور علم وعمل کے پیکر کی حیثیت سے مشہور تھے، چونکہ عربی زبان وادب پر مکمل عبور اور دسترس رکھتے تھے، اس لیے زیادہ تر کتابیں اور تحریریں عربی زبان میں ہیں، عرب دنیا کی پڑھی لکھی شخصیات آپ سے بخوبی واقف ہیں، الرائد میں مولانا کا اداریہ امت کی رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے، کبھی آپ مسلم امت کو تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ اور اس کی برکتوں اور فضیلتوں سے آشنا کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی مسلم امت کو مغرب کی ریشہ دوانیوں سے باخبر اور اس کے خلاف متحد کرتے دکھتے ہیں، ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ پرہیز گاری وسادگی، تواضع وانکساری کا پیکر تھے۔ سورہ فرقان میں رحمٰن کے بندوں کے جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں پہلی خوبی یمشون علی الارض هونا ہے (جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں)، یعنی ان کی چال ڈھال سے تواضع، متانت، خاکساری، اور بے تکلفی ٹپکتی ہے۔ مولانا مرحوم کے اندر یہ صفت کسی نہ کسی درجے میں پائی جاتی تھی، بلاشبہ اس آیت مبارکہ کی روشنی میں مولانا ندویؒ کی زندگی کا یہ پہلو بڑا قیمتی، قابل قدر اور لائق اتباع ہے۔

اسلام کی اشاعت اور اخلاقی تعلیمات:

مولانا واضح رشید ندوی کا میدان کار عربی زبان وادب اور قرآن و حدیث کا خصوصی مطالعہ تھا۔ اس لیے آپ کی تحریروں میں جا بجا قرآن کریم سے استدلال کا ثبوت ملتا ہے۔ سیرت طیبہ کے موضوع پر عام طور سے سیرت نگاروں نے حدیث وسیر کی کتابوں سے استفادہ کر کے حضور اکرم ﷺ کی سیرت، آپ کے اخلاق وعادات، عفو ودرگذر کے معاملات، دعوت الی اللہ کے تدریجی مراحل، شہادت حق کے فریضہ منصبی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن مولانا ندوی کی خوبی یہ ہے کہ آپ نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں سیرت کی مروجہ کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن پاک کو متبادل ماخذ کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے اور جہاں جہاں ممکن ہوا ہے قرآن پاک سے استدلال کیا ہے۔ مثال کے طور پر مستشرقین کا یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، اس بات کا انکار کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ:

''بات اگرچہ یہ بالکل بے بنیاد ہے، سراسر جھوٹ ہے، بہتان ہے، لیکن ایک رٹے رٹائے سبق کی طرح اس طرح دہرائی جارہی ہے کہ اچھے بھلے صاف دل، کھلے دماغ اور غیر جانب دار غیر مسلم حضرات کے دلوں میں بھی یہ خیال پیدا کرنے لگی ہے کہ اسلام اپنی تعلیمات کی بنیاد پر نہیں بلکہ تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک پر پھیلا ہے، بے شک نبی کریمؐ نے اپنی حفاظت، صحابہ کرام کی حفاظت اور سب سے بڑھ کر اپنے دین اور اپنے عقیدہ کی حفاظت کی خاطر تلوار کا سہارا لیا، اور طاقت کے حصول پر یہ کہتے ہوئے زور دیا کہ "المومن القوی خیر و احب الی الله من المؤمن الضعیف" طاقت ور مسلمان کمزور

مسلمان سے بہتر بھی ہے اور اللہ کو زیادہ محبوب بھی۔

بے شک قرآن کریم کی یہ آیت "وأعدو لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدو كم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم (الانفال:۶۰) آپ پر نازل ہوئی اور آپ ہی کے توسط سے امت مسلمہ کو یہ حکم ملا، لیکن کیوں اور کس لیے، اس لیے کہ ظالم کو ظلم سے روکا جا سکے اور مظلوموں، کمزوروں اور دبے کچلے انسانوں کو ان کا حق دلوایا جا سکے۔ اور اپنی مرضی اور خوشی سے اسلام کی طرف مائل ہونے والوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے والوں کا مقابلہ کیا جا سکے، نہ کہ اس لیے کہ طاقت کا استعمال کر کے اپنے دین کو پھیلایا جائے، اور اپنی سرحدوں کے دائرہ کو وسیع کیا جائے"۔(۱)

مولانا واضح رشید ندوی نے مستشرقین کے اس گروہ کو قرآن کریم کی دوسری آیت کے ذریعہ سے خاموش کرانے کی کوشش کی ہے جس نے یہ الزام لگایا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ پھر سیرت طیبہ کے متعدد گوشوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اسلام میں تشدد، دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"اللہ نے قرآن پاک میں "لا اكراه فى الدين قد تبين الرشد من الغى" کہہ کر یہ بات بالکل صاف کر دی ہے کہ دین کے سلسلے میں کوئی زور زبردستی نہیں کی جائے گی، کیوں کہ اس دین کو طاقت کے سہارے کی قطعی ضرورت نہیں، اس کی تعلیمات اور ہدایات اور پھر اس کے نبیؐ کی پاک زندگی سچائی، دیانت داری، رحم دلی، اخلاق مندی، کرم گستری، غمخواری اور انسانیت نوازی ہی اس دین کی سب سے بڑی طاقت، اس کی سب سے مضبوط ڈھال اور اس کا سب سے کارگر ہتھیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اپنی تمام تر ناانصافیوں کے باوجود آج تک ایک بھی واقعہ ایسا پیش نہیں کر سکی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ آپؐ کی تلوار ناحق کسی پر اٹھی۔ مکہ فتح ہو رہا ہے، دشمن سے انتقام لینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں، تلواریں اشارہ کی منتظر ہیں، کب سے آرزو تھی ان تلواروں کی منکرین خدا اور باغیان رسول کا سر قلم کرنے کی۔ لیکن اعلان ہوتا ہے عام معافی کا، تلواروں کا سر جھک جاتا ہے، اور بالآخر ان کو نیام میں واپس آنا پڑتا ہے"۔(۲)۔

سراجا منیرا کی تاویل: اللہ کے ننانوے نام قرآن کریم میں موجود ہیں، لیکن نور السموات والارض کی تشبیہ اللہ نے اپنے لیے اور اپنے رسول کے لیے معلم، مزکی، ہادی، رحمۃ للعلمین جیسے ناموں کو پسند کیا ہے، لیکن مولانا ندوی کے نزدیک سراجا منیرا کا نام سب سے اہم ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

"رسول اکرم ﷺ کے لیے معلم، مزکی، ہادی، مبشر، منذر، مبلغ، داعی، رحمۃ للعلمین اور رؤوف ورحیم کی صفات استعمال کی گئی ہیں، لیکن ان میں جامع تعریف "سراج منیر" کی ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: يا ايها النبى انا ارسلنك شاهدا ومبشرا ونذيرا، وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا (سورہ احزاب:۴۵-۴۶)۔ اے نبی یقیناً ہم ہی نے آپ کو گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا، ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ۔ (ابن کثیر نے سراجا منیرا کے معنی روشن اور چمکدار سورج کے لیے ہیں)، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ پوری انسانی زندگی بلکہ پورے عالم کے لیے تا قیامت ما دامت السموات والارض مشعل راہ ہیں، اور ہر خاص وعام کے لیے قیامت تک روشنی کا منبع ہیں"(۳)۔

عفوو رحمت، سیرت طیبہ کا درخشاں پہلو:

مولانا محمد واضح رشید ندوی نے اپنی کتاب محسن انسانیت کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس مجموعۂ مضامین میں سیرت پاک کے ان پہلوؤں یا واقعات کو نمایاں کیا گیا ہے جن میں رحمت، عفو و درگزر کرنے، دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور تعلیم وتربیت اور دعوت میں انسانی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے نرمی و رعایت کا اہتمام پایا جاتا ہے، یہ وہ عنصر ہے جس کی مثالیں سیرت پاک میں عام طور سے پائی جاتی ہیں، خود قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب

لانفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوكل على الله إن الله يحب المتوكلين (۴)۔(ترجمہ) پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تندخو، سخت طبع ہوتے تو وہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوگئے ہوتے، سو آپ ان سے درگزر کیجئے اور ان کے لیے استغفار کر دیجئے اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہیے، لیکن جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو پھر اللہ پر بھروسہ رکھئے، بے شک اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں، خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاهلين (۵)، درگزر اختیار کیجئے اور نیک کام کا حکم دیتے رہیے اور جاہلوں سے کنارہ کش ہوجائے، (۶)۔

غار ثور میں صدیق اکبر کو تسلی آمیز کلمات:

ہجرت کا واقعہ اور غار ثور میں قیام کے واقعہ کو تقریباً سبھی سیرت نگاروں نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور بعض سیرت نگاروں نے اس واقعہ کو سیرت نبوی کا اہم ترین واقعہ قرار دیا ہے، لیکن مولانا نے اس واقعہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد غار ثور میں حضرت ابو بکر صدق کے اس خوف کو قرآن کی آیات کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جب دشمن بالکل سر پر سوا تھا اور ان کا پاؤں غار کے اندر سے نظر آرہا تھا تو صدیق اکبرؓ نے اللہ کے رسولؐ سے عرض کیا کہ ہم تو پکڑے جائیں گے تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: لا تحزن ان الله معنا، غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ مولانا ندوی نے اس پورے واقعہ کے سلسلے میں قرآن پاک سے اس طرح استدلال کیا ہے:

''ہجرت کے واقعہ اور غار ثور کے قیام کو عربی کے مشہور ادیب اور سیرت نگار عباس محمود العقاد نے سیرت کا اہم ترین واقعہ قرار دیا ہے، غار حرا میں حضورؐ کے بارے میں بعض سیرت نگاروں نے یہ بیان کیا ہے کہ "فزع رسول الله وقال زملونی زملونی" پس اللہ کے رسولؐ خوف زدہ ہوگئے اور فرمایا مجھے چادر اوڑھاؤ، اس پر حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی، غار ثور میں خود قرآن کریم کے مطابق حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خوف محسوس ہوا تو حضور اکرمؐ نے تسلی دی:

الا تنصروه فقد نصره الله اذ اخرجه الذين كفروا ثانی اثنين اذ هما فی الغار اذيقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا فانزل الله سكينة عليه وايده بجنود لم تروها وجعل كلمة الذين كفروا السفلى وكلمة الله هی العليا والله عزيز حكيم (۷)۔

(ترجمہ) اگر تم لوگ ان کی (یعنی رسول اللہ کی) مدد نہ کرو گے تو ان کی مدد تو خود اللہ کر چکا ہے، جب کہ ان کو کافروں نے وطن سے نکال دیا تھا، جب کہ دو میں سے ایک وہ تھے جب کہ دونوں غار میں موجود تھے، جب کہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو بے شک اللہ ہم لوگوں کے ساتھ ہے۔ سو اللہ نے اپنی تسلی ان (رسول) کے اوپر نازل کی اور ان کی تائید ایسے لشکروں سے کی جنہیں تم لوگوں نے نہ دیکھا اور اللہ نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور اللہ ہی کی بات اونچی رہی، اور اللہ بڑا زبردست ہے، بڑا حکمت والا ہے'' (۸)۔

صحابہ کرام کا حب رسول:

اللہ کے رسول ﷺ سے محبت اور آپؐ سے جانثاری کا جذبہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا، سیرت نگاروں نے مختلف واقعات وحادثات کے ذریعہ اس محبت کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن مولانا ندوی نے اس محبت کا نقشہ قرآن کریم کو ماخذ بنا کر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر صحابۂ کرام پر بجلی بن کر گری، اس کی وجہ ان کا وہ عاشقانہ تعلق تھا جس کی نظیر نہیں۔ وہ آپ کے سایۂ شفقت میں اس طرح رہنے کے عادی ہوگئے تھے جس طرح بچے ماں باپ کے آغوش محبت میں رہتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس لحاظ سے ان پر جتنا بھی اثر پڑتا کم تھا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

لقد جاءكم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤوف رحيم (۹)۔

(ترجمہ) لوگو تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں،

تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں، اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

صحابہ کرام میں سے ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ آپ کی نگاہ لطف و کرم میں سب سے زیادہ محبوب اور مورد الطاف کرم ہے، بعض صحابہ کو اس پر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ ان میں پیش پیش حضرت عمرؓ تھے۔ انھوں نے ایسے شخص پر جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی بہت نکیر کی۔ وہ مسجد نبوی میں آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا کہ رسول اللہؐ کی وفات اس وقت تک نہ ہوگی جب تک اللہ منافقوں کو ختم نہ کردے گا۔

ان حالات میں حضرت ابوبکرؓ (جن کو اللہ نے نبوت کی نیابت و خلافت اور عزیمت وحکمت کے موقف کے لیے تیار کیا تھا) جیسے عالی حوصلہ اور عزم و ہمت کے پہاڑ کی ضرورت تھی جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیق کو جو مقام سخ (مضافات مدینہ) میں تھے اطلاع ہوئی تو اسی وقت تشریف لائے (بخاری ص ۶۴۰) اور مسجد نبوی کے دروازے پر ایک لمحہ کے لیے رکے۔ اس وقت حضرت عمرؓ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، پھر وہ کسی طرف ملتفت ہوئے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر رسول اللہ ﷺ کے قریب پہونچے۔ آپؐ پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے ذرا سی چادر سرکائی اور جھک کر روئے مبارک کا بوسہ لیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان! موت کا مزہ جو اللہ نے آپ کے لیے مقدر کر دیا تھا آپ نے چکھ لیا۔ اب آپ کو کبھی بھی موت کی تکلیف نہ ہوگی۔ اس کے بعد چادر سے آپؐ کے روئے مبارک کو اسی طرح چھپا دیا۔ اس کے بعد مسجد نبوی آئے۔ حضرت عمرؓ کا سلسلہ کلام اس وقت تک جاری تھا، انہوں نے کہا عمر ذرا ٹھہرو لیکن جوش کلام میں انھوں نے ان کی بات نہیں سنی۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہو رہے ہیں تو مجمع کی طرف متوجہ ہوکر انھوں اپنی بات شروع کی۔ لوگوں نے ان کو خطاب کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے حضرت عمرؓ کی طرف سے رخ پھیر کر ان کی بات سننی شروع کر دی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا۔ لوگو! اگر کوئی محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو اسکو معلوم ہو جائے کہ بلا شبہ ان کی وفات ہوگئی، اور اگر اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اطمینان رکھے کہ اللہ زندہ ہے اس کے لیے موت نہیں۔ پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل، أفإن مات او قتل انقلبتم على اعقابكم ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا وسيجزى الله الشاكرين (۱۰)۔

(ترجمہ) اور محمدؐ صرف خدا کے پیغمبر ہیں، ان سے پہلے بہت سے پیغمبر گزرے ہیں، بھلا اگر ان کی وفات ہو جائے یا شہید کر دیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے یعنی مرتد ہو جاؤ۔ اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا۔ اور خدا شکر گزاروں کو بڑا ثواب دے گا۔ (۱۱)۔

اسلام سراپا امن وسلامتی کا مذہب:

مولانا ندوی کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کے نام پر ہر جگہ تشدد بپا کئے ہوئے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کی ترجمانی ہرگز نہیں کر رہے ہیں، کیوں کہ قرآن کا اعلان ہے اور خود سیرت طیبہ بھی چیخ چیخ کر بیان کر رہی ہے کہ اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کی یہ صفت قرآن پاک میں بیان کردہ تمام صفات پر حاوی اور بھاری ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''قومی و مذہبی عصبیت سے بالاتر ہوکر صاف اور کھلے ذہن سے اگر سیرت نبوی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اعتراف کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا کہ رسول کریمؐ کی نمایاں اور ممتاز صفت رحمۃ للعالمینی ہے۔ آپ کی پوری زندگی عفو و درگذر، رحم و کرم، رحمت و مودت اور شفقت و دلداری کی آئینہ دار ہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت اور صحابہ کرام کے ساتھ آپ کے سلوک کا بنیادی جوہر رحمت و کرم گستری ہے۔ آپ صرف مسلمانوں کے لیے رحمت نہیں بلکہ آپ سارے جہاں کے لیے رحمت تھے۔ ارشاد باری ہے، وما ارسلناك الا رحمة للعالمين

(الانبیاء:۱۰۷) اے محمد ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کی یہ صفت آپ کے تمام اقدامات اور کارروائیوں میں نمایاں اور غالب نظر آتی ہے۔ آپ کی زندگی میں کتنے ہی نازک مرحلے آئے، کیسی ہی سختیوں، کٹھنائیوں اور آزمائشوں سے آپ کو گزرنا پڑا۔ لیکن کسی بھی حال میں شفقت ومودت، رحمت وکرم گستری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ جب آپ نے اسلام کی دعوت شروع کی تو اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں نے سخت سے سخت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں۔ آپ کا بائیکاٹ کیا گیا۔ راہ حق میں روڑے اٹکائے گئے لیکن ہر حال میں آپ کا یہ جذبہ رحمت غالب رہا۔ آپ کی یہ صفات آپ ہی کی ذات تک محدود نہ تھیں بلکہ آپ کی تعلیم وتربیت کے اثر سے صحابہ کرام میں بھی جلوہ گر تھیں۔ قرآن کریم کہتا ہے:

محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجداً يبتغون فضلا من الله ورضوانا سيماهم فى وجوههم من أثر السجود ذلك مثلهم فى التوراة ومثلهم فى الانجيل (۱۲)۔

(ترجمہ) محمد اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ تیز ہیں کافروں کے مقابلہ میں اور مہربان ہیں آپس میں۔ تو انہیں دیکھے گا (اے مخاطب) کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدے میں ہیں، اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں، ان کے آثار سجدہ کی تاثیر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت اور انجیل میں ہیں۔

مولانا واضح رشید ندوی نے ایک اور آیت کریمہ سے صحابہ کرام کی صفت عفو ودرگذر اور رحمت ومحبت پر استدلال کیا ہے:

وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما والذين يبيتون لربهم سجدا وقياما والذين يقولون ربنا اصرف عنا عذاب جهنم ان عذابها كان غراما۔ انها ساء ت مستقرا ومقاما والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقترو وكان بين ذلك قواما، والذين لايدعون مع الله الها آخر ولا يقتلون النفس التى حرم الله الا بالحق ولا يزنون ومن يفعل ذلك يلق اثاما (۱۳)۔

(ترجمہ) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور جب اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے اور (عجز وادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں اور وہ جو دعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار دوزخ کے عذاب کو ہم سے دور رکھیو کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ بے بہا اڑاتے ہیں اور نہ وہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ، ضرورت سے زیادہ نہ کم، اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کا مارڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے۔ بلکہ جائز طریقہ پر (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔

مولانا ندوی نے اس موقع پر ایک اور آیت کریمہ سے مومنین کے اوصاف کی وضاحت فرمائی ہے۔ آپ نے استدلال کرتے ہوئے قرآن پاک کی اس آیت کو پیش نظر رکھا:

قد افلح المومنين الذين هم فى صلوتهم خٰشعون والذين هم عن اللغو معرضون والذين هم للزكوة فاعلون، والذين هم لفروجهم حٰفظون الا على ازاجهم او ما ملكت ايمانهم فانهم غير ملومين فمن ابتغى وراء ذلك فأولئك هم العادون، والذين هم لاماناتهم وعهدهم راعون والذين هم على صلوتهم يحافظون، أولئك هم الوارثون، الذين يرثون الفردوس هم فيها خالدون (۱٤)۔

(ترجمہ) یقیناً وہ مومنین فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں اور جو لغویات سے اعراض کرنے والے ہیں اور جو اپنا

تزکیہ کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے کہ ان کے سلسلہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں، ہاں جو کوئی اس کے علاوہ کا طلب گار ہوگا سو ایسے ہی لوگ تو حد سے نکل جانے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی رکھنے والے ہیں، بس یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے، اور اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

مندرجہ بالا آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت ومودت، شفقت وملاطفت، دلداری ودلنوازی اور عفو ودرگزر اسلام کی بنیادی اور نمایاں صفات ہیں، نبی کریمؐ نے صرف انسانوں ہی کے ساتھ شفقت ورحمت کی تعلیم نہیں دی بلکہ حیوانات وحشرات الارض کے ساتھ بھی رحمت و شفقت اور نرمی و ہمدردی کی تعلیم دی۔ احادیث اور سیرت نبوی کی کتابوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں'' (۱۵)۔

معلم علم وحکمت:

مولانا محمد واضح رشید ندوی کا شکوہ ہے کہ سیرت نگاروں نے اللہ کے رسولؐ کی سیرت کے تمام پہلوؤں پر تو تفصیل سے روشنی ڈالی لیکن معلم علم وحکمت کے تابناک پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے جبکہ قرآن پاک جگہ جگہ اس پہلو کی طرف اشارہ کررہا ہے: مولانا ندوی رقمطراز ہیں:

''سیرت نگاری نے حیات طیبہ کے ان روشن پہلوؤں کو خوب اجاگر کیا ہے لیکن حیات طیبہ کے ایک اہم ترین پہلو کو بھرپور طریقے سے پیش نہ کیا جاسکا، اور وہ پہلو ہے آپ کے معلم علم وحکمت ہونے کا۔ یہ آپ ہی کا فیض اور احسان ہے کہ پوری دنیا علم ومعرفت اور حکمت و دانائی کے نور سے منور ہے۔ قرآن کریم نے آپ کی اس صفت عظیم کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعثت نبوی سے پہلے پوری دنیا ضلالت وگمراہی اور جہالت وناخواندگی کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں تھی۔ دنیائے انسانیت پر آپ کے دیگر عظیم احسانات کے علاوہ ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ آپ دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لائے، ارشاد باری ہے:

هو الذى بعث فى الاميين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفى ضلال مبين (١٦)۔

(ترجمہ) وہی جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں ان کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔(۱۷)۔

مولانا ندوی نے اللہ کے رسولؐ کو معلم علم وحکمت کے وصف کو قرآن پاک کی دیگر آیات سے بھی مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے متعدد اوصاف ذکر کئے ہیں، کہیں آپ کو مبشر ومنذر کہا گیا ہے کہیں داعی ومبلغ کہا گیا ہے، کہیں سراجا منیرا اور کہیں معلم وحکمت اور مزکی اخلاق کہا گیا ہے۔ يا ايها النبى انا ارسلنٰك شاهدا ومبشرا ونذيرا، وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا (سورہ احزاب:۴۵-۴۶) اے نبیؐ ہم نے ہی آپ کو گواہی دینے والا، خوش خبری سنانے والا، ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن سورج۔ يٰايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله يعصمك من الناس، ان الله لا يهدى القوم الكافرين (سورہ مائدہ:٦٧) اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی اور آپ کو اللہ لوگوں سے بچالے گا۔ بے شک اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، فاصدع بما تؤمر واعرض عن الجاهلين (سورۃ الحجر:۹۴) غرض آپ کو جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اسے صاف سنا دیجئے اور مشرکین سے گریز کیجئے۔ هو الذين ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون (سورہ صف:۹) اللہ وہی ہے

جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا، تا کہ اسے اور تمام مذاہب پر غالب کردے۔ اگر چہ مشرکین ناخوش ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تھی۔ پڑھنے لکھنے کا کوئی تصور نہ تھا۔ بعض بعض افراد ہی تھے جو انفرادی طور پر لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اللہ کے رسولؐ نے اس دنیا میں تعلیمی تحریک چلائی۔ سب سے پہلا مدرسہ مکہ میں دارارقم اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی قرار پایا۔ اور جیسے جیسے یہ تحریک آگے بڑھتی گئی، پڑھنے پڑھانے کا ماحول اور بہتر انداز سے آگے بڑھتا گیا، مولانا ندوی کے خیال میں اللہ کے رسولؐ نے یہ تحریک قرآن کے فرمان پر عمل کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''بعثت محمدی کے وقت آج کی متمدن دنیا جو صدیوں تک جہالت و ناخواندگی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی، نبی امی محمد ﷺ کی بعثت کے بعد علم کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی۔ اس نبی امی نے علم کا ایسا وقار اور علماء کی ایسی قدر و منزلت بڑھائی کہ کہیں اور اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حصول علم پر نبی امی نے بڑا زور دیا اور اس کی بار بار تاکید فرمائی اور خود قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کو ترقی علم کی تلقین کی وقل رب زدنی علما (سورہ طہ:۱۱۴) آپ کہیے کہ اے میرے رب بڑھا دے میرے علم کو۔ نبی امی محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی کا آغاز لفظ اقرأ (پڑھ) اور علم سے ہوا۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ و ربك الاكرم، الذی علم بالقلم، علم الانسان ما لم يعلم (۱۸)۔

(ترجمہ) پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھئے آپ کا رب بہت کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

اس وحی میں قلم کو علم کا عظیم وسیلہ قرار دیا گیا ہے، جس سے علم کا تاریخی سفر وابستہ ہے اور جس سے تصنیف و تالیف کی عالمگیر تحریک جاری ہوئی اور علم ایک فرد سے ایک قوم (۷) ایک قوم سے دوسری قوم، ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا، دنیا میں علم کی اشاعت اور انسانی ضرورت کے مطابق اس کی عمومیت (پھیلاؤ) کا فخر اسی کو حاصل ہے، اور اس کی گردش و جنبش سے مدارس و جامعات اور علمی اداروں اور کتب خانوں کی دنیا آباد ہے'' (۱۹)۔

محسن انسانیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولانا واضح رشید ندوی صرف عربی زبان و ادب کے ادیب اور ماہر نہ تھے بلکہ اردو زبان و ادب پر بھی یکساں طور سے قدرت رکھتے تھے اگر چہ بعض مضامین کو مولانا محمد وثیق ندوی نے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے، لیکن کتاب کی زبان عام فہم اور قاری کے لیے پرکشش ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور ادبی لطافت سے بھرپور ہیں۔ مولانا کی خوبی یہ ہے کہ اردو و عربی زبان و بیان کی قدرت کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث پر گہری نظر ہے، اور جگہ جگہ قرآن و حدیث سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں، لیکن جہاں کہیں عربی زبان کے ادبی شہ پاروں کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا موقع آتا ہے، اس کو اپنی زبان میں نہ ادا کر کے کسی بڑے ادیب کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہجرت کے بعد حضور اکرمؐ کا قافلہ جب قبیلہ خزاعہ سے گزرا تو ام معبد نام کی خاتون نے جو اللہ کے رسولؐ کی منظر کشی کی اس کو اپنی زبان میں بیان کرنے کے بجائے مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی کی زبان مبارک سے بیان فرمایا۔ مولانا رقمطراز ہیں:

''ام معبد نے حضور اکرمؐ کا جو وصف بیان کیا ہے، وہ ادبی حیثیت سے شاہکار اور اعلی ترین ادبی نمونہ ہے۔ اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے، فن کار صاحب اسلوب ادیب ہی دوسری زبان میں اس کو منتقل کر سکتا ہے۔ ام معبد کے واقعہ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''غار سے نکل کر پہلے ہی دن اس مبارک قافلہ کا گزر ام معبد کے خیمہ پر ہوا۔ یہ خاتون قوم خزاعہ سے تھیں، مسافروں کی خبر گیری اور ان کی تواضع کے لیے مشہور تھیں۔ سر راہ پانی پلایا کرتی تھیں۔ مسافر

وہاں ٹھہر کر ستایا کرتے تھے۔ یہاں پہونچ کر بڑھیا سے پوچھا کہ اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟ وہ بولیں نہیں اگر کوئی شئے موجود ہوتی تو دریافت کرنے سے پہلے میں خود حاضر کر دیتی۔ نبیؐ نے خیمہ کے گوشہ سے ایک بکری دیکھی۔ پوچھا یہ بکری کیوں کھڑی ہے، ام معبد نے کہا کہ کمزور ہے، ریوڑ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ نبیؐ نے فرمایا اجازت ہے کہ ہم اسے دوہ لیں؟ ام معبد نے کہا کہ اگر دودھ معلوم ہوتا ہے تو دوہ لیجئے۔ نبیؐ نے بسم اللہ کہہ کر بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا، برتن مانگا وہ ایسا بھر گیا کہ دودھ اچھل کر زمین پر گر گیا۔ یہ دودھ آنحضرتؐ اور ہمراہیوں نے پی لیا۔ دوسری دفعہ پھر بکری کو دوہا گیا۔ برتن پھر بھر گیا، یہ بھی ہمراہیوں نے پیا، تیسری مرتبہ برتن پھر بھر گیا اور ام معبد کے لیے چھوڑ دیا گیا اور آگے کو روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد ام معبد کے شوہر آئے، خیمہ میں دودھ کا برتن بھرا دیکھ کر حیران ہو گئے کہ یہ کہاں سے آیا، ام معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص یہاں آئے تھے اور یہ دودھ ان کے قدوم کا نتیجہ ہے۔ وہ بولے کہ یہ تو وہی صاحب قریش معلوم ہوتے ہیں جن کی مجھے تلاش تھی، اچھا ذرا ان کی توصیف کرو، ام معبد بولیں:

''میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی نظافت نمایاں، جس کا چہرہ تاباں اور جس کی ساخت میں تناسب تھا، پاکیزہ اور پسندیدہ خو، نہ فربہی کا عیب نہ لاغری کا نقص، نہ پیٹ نکلا ہوا، نہ سر کے بال گرے ہوئے، چہرہ وجیہ، جسم تنومند اور قد موزوں تھا، آنکھیں سرگیں تھیں فراخ اور سیاہ تھیں، پتلیاں کالی تھیں، ڈھیلے بہت سفید تھے، پلکیں گھنی اور لمبی تھیں، پروقار خاموش دلبستگی لیے ہوئے، کلام شیریں اور واضح، نہ کم سخن نہ بسیار گو، گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے موتی، دو نرم نازک شاخوں کے درمیان ایک شاخ تازہ جو دیکھنے میں خوش منظر، رفیق ان کے گرد و پیش رہتے ہیں، جو کچھ وہ فرماتے ہیں، وہ سنتے ہیں، جب حکم دیتے ہیں تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں، مخدوم و مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو''۔

یہ صفت سن کر وہ بولا یہ تو ضرور صاحب قریش ہیں اور میں ان سے ضرور ملوں گا''۔(۲۰)۔

مولانا واضح رشید ندوی نے مولانا ابوالحسن ندوی کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا محمد رابع ندوی کی تحریروں کو بھی اپنی کتاب میں جگہ جگہ پیش کیا ہے اور ان کا باقاعدہ حوالہ بھی دیا ہے۔ حالانکہ مولانا بذات خود اس کا بہترین ترجمہ کر سکتے تھے اور اس کا مفہوم بہترین انداز میں پیش کر سکتے تھے۔

حوالہ جات:

(۱)۔مولانا واضح رشید ندوی، محسن انسانیت ترجمہ و ترتیب محمد وثیق ندوی، ناشر دارالرشید لکھنؤ، ۲۰۱۲ء ص ۵

(۲)۔ نفس مصدر، ص ۶

(۳) نفس مصدر، ص ۹-۱۰

(۴) القرآن الکریم، سورہ آل عمران: ۱۵۹

(۵) القرآن الکریم سورۃ الاعراف: ۱۹۹

(۶) محسن انسانیت، حوالہ بالا، ص ۱۱

(۷) القرآن الکریم، سورۃ توبہ: ۴۰

(۸) محسن انسانیت، حوالہ بالا، ص ۲۶

(۹) القرآن الکریم، سورۃ التوبہ: ۱۲۸

(۱۰) القرآن الکریم، سورۃ آل عمران: ۱۴۴

(۱۱) محسن انسانیت، حوالہ بالا، ص ۳۲

(۱۲) القرآن الکریم، سورۃ الفتح: ۲۹

(۱۳) القرآن الکریم، سورۃ الفرقان: ۶۳-۶۸

(۱۴) القرآن الکریم، سورۃ المومن: ۱-۱۱

(۱۵) محسن انسانی ۹ ت، حوالہ بالا، ص ۴۰، ۳۹

(۱۶) القرآن الکریم، سورۃ الجمعہ: ۲

(۱۷) محسن انسانیت، حوالہ بالا، ص ۷۲

(۱۸) القرآن الکریم، سورۃ اقراء: ۱-۵

(۱۹) محسن انسانیت، حوالہ بالا، ص ۷۶

(۲۰) نفس مصدر، ص ۲۷)

☆☆☆

ادب اہل القلوب کی فنی عظمت

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی
سابق ڈین کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

دل مہبط وحی الٰہی ہے، دل پر انوار کی بارش ہوتی ہے، عربی میں کہا گیا ہے "الانسان بأصغر یه بلسانه و قلبه" (انسان جانا جاتا ہے اپنی دو چھوٹی چیزوں سے، اپنی زبان سے اپنے قلم سے)۔

ادب کی کئی قسمیں کی گئی ہیں، ایک ادب وہ ہے جو کسی زبان کے ادباء وشعراء پیش کرتے ہیں مگر وہ مشق وممارست سے اور محنت سے ادبی شاہکار پیش کرتے ہیں، وہ ادب ہر زبان میں موجود ہے۔ مگر وہ ادب مصنوعی نہیں ہوتا جس کا مقصد پیش ورانہ زندگی اختیار کرنا نہیں ہوتا، اور جس کا مقصد معاشی زندگی حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ ادب دل سے صادر ہوتا ہے، قلوب سے اس کا تعلق ہوتا ہے، عربوں نے کہا ہے "الأدب لا موضوع له" ادب کا کوئی موضوع نہیں ہوتا، ادیب جو کچھ لکھتا ہے وہ ادب ہے یعنی ادیب کی ذات سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ ادب ہے، ادب از دل خیزد بر دل ریزد کا نام ہے، تصنع، تکلف اور محنت سے عمدا بنایا ہوا ادب پر تکلف ادب ہے جیسے حریری کے مقامات، مگر ادب وہ ہے جو دل سے صادر ہو جس کو پڑھ کر دلوں کو خوشی محسوس ہو اور جو بلا اذن دل میں داخل ہو جائے۔

متنبّی نے کہا ہے کہ

قواف اذا سرنا من مقولی
وثبن الجبال وخضن البحارا

ترجمہ: ایسے اشعار جو میری زبان سے نکلتے ہیں تو پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں اور سمندر میں کود جاتے ہیں یعنی پھیل جاتے ہیں۔

پس ادب کا تعلق انسانی دل سے ہے صوفیہ کا طبقہ دلوں سے تعلق رکھتا ہے۔

علامہ سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ اس کتاب اُدب اہل القلوب کے عالمانہ مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ چودہ سو برس میں علمی وثقافتی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات آئے، یونانی لٹریچر کے تراجم عربی میں مغرب سے آئے، ادیبوں نے نفس کی خواہشات اور سستی لذت کو ادب میں پیش کیا، فکری وفلسفیانہ موضوعات بھی آئے، ادیبوں نے متاع دنیا اور آخرت سے غفلت والا ادب پیش کیا۔

لیکن صوفیہ اصحاب تقویٰ اور اصلاح باطن کے علمبردار تھے، وہ نفوس کی تربیت میں اور عبادت میں مشغول تھے، ان علماء وصوفیہ نے زیادہ توجہ لکھنے کی طرف نہیں دی لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ قلیل ہونے کے باوجود بہت جاندار ہے، اس میں اخلاص ہے، دل کی آواز ہے اور ادب کی چاشنی ہے، اور تقویٰ کی روح ہے، بعض صوفیہ نے اس موضوع پر توجہ کی ہے، اس کتاب ''ادب اہل القلوب'' میں اس طبقہ کے ادب کو پیش کیا جس کی ترجمانی خود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ''رجال الفکر والدعوۃ' کی ضخیم جلدوں میں کی ہے، یہ خوشی کی بات ہے کہ میرے بھائی محمد واضح رشید حسنی ندوی نے تلاش کیا ہے ان ایمانی ادب کے شہ پاروں کو جو تراجم وسیر کے پردوں میں چھپے ہوئے تھے، انہوں نے امام حسن بصری، بشر الحافی، حارث المحاسبی، ابو حامد غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، عبدالرحمٰن ابن الجوزی اور شیخ نظام الدین اولیاء کے مواعظ، مجالس اور بیانات میں ایسے قطعات جمع کئے ہیں جن میں قوت حیات ہے، معنوی جمال ہے اور انسانی نفوس وقلوب پر اثر کرنے کا فطری ملکہ ہے جو تزکیہ نفس اور تقوی کی عظمت کے حامل ہیں، یہ ادبی قطعات نفوس واذہان پر اثر کرتے ہیں اور انسانی زندگی کو بدل دیتے ہیں، ان قطعات سے نور کے آبشار رواں ہوتے ہیں، ان میں ابدیت کے

عناصر ہیں جو انسانی زندگی میں صالح ابدی عناصر سے ہماری زندگی کو اور ہمارے قلوب کو روشن کرتے ہیں۔ (مقدمہ مولانا رابع حسنی ندوی، ص۹ تا۱۱)

خود مولانا واضح رشید ندوی صاحب علامہ ابن قیم جوزی کا ایک قول پیش کرتے ہیں کہ قلب کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم قلب میت، یہ وہ قلب ہے جس میں زندگی نہیں، وہ اپنے رب کو نہیں جانتا، اس کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ شہوات ولذات میں مبتلا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی پرواہ نہیں۔

دوسری قسم قلب وہ ہے جس میں زندگی ہے وہ قلب مریض ہے۔

تیسری قسم قلب سلیم ہے، یہی قلب روشن ہے ایمان ویقین سے۔

ادب کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ ادب جو وہ ادیب پیش کرتے ہیں جو پیشہ ور ہیں، وہ اپنی معاشی زندگی کے لئے بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کے گرد گھومتے ہیں، ان ادیبوں کے اندر پیشہ ورانہ انداز ہوتا ہے، ان کو بادشاہ ووزراء نوازتے ہیں۔

(۲) وہ مذہبی طبقہ جو صوفیہ کہلاتے ہیں وہ بادشاہ سے دور رہتے ہیں، مجھ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جہاں بادشاہت قائم ہوتی تھی وہاں دارالسلطنت سے کچھ دوری پر آس پاس صوفیہ آجاتے تھے اور اپنی خانقاہ بناتے تھے، اور بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے، مگر ان کے درباروں سے دور رہتے تھے، ان کے ہدایا قبول نہیں کرتے تھے، اور ان کو اپنی مجالس میں آنے نہیں دیتے تھے۔

ادب اہل القلوب کا تصور بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پیش کیا ہے، وہ ''مختارات من ادب العرب'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جو پیشہ ور ادباء اور شعراء ہیں وہ جو ادب پیش کرتے ہیں وہ روایتی ہے، اس میں تکلف اور تصنع ہے مگر جو ادب علمائے ربانیین پیش کرتے ہیں اور اپنے مواعظ اور مجالس میں دل کی گہرائیوں سے دین کے خلوص کے ساتھ ادبی قطعات پیش کرتے ہیں وہ ادب تصور نہیں کیا جاتا، اس لئے کہ ادباء کے لباس میں یہ طبقہ ظاہر نہیں ہوتا، مگر ان کے ادب میں بڑی جان ہوتی ہے، خلوص ہوتا ہے، اور یہ نمونہ ہوتا ہے، ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا۔

اس لئے حضرت مولانا نے امام غزالی، امام ابن جوزی اور دوسرے صوفیاء واہل قلوب کے لٹریچر سے ایسے قطعات مختارات میں پیش کئے ہیں جن کو لوگ ادیب نہیں سمجھتے تھے، مگر ان قطعات میں زندگی کے آبشار رواں ہیں۔

اسی بنیاد پر حضرت مولانا محمد واضح رشید صاحب نے علماء، صوفیا اور اہل نظر عباقرہ کے پیش کردہ مواعظ اور بیانات سے ایسے جاندار قطعات جمع کئے ہیں جو ان کی عظمت کو واضح کرتے ہیں، ان قطعات میں عام ادیبوں سے زیادہ اثرات ہیں، اس لئے مولانا واضح رشید صاحب کا یہ کام زندہ رہنے والا ہے، ان میں دلوں کی زندگی پوشیدہ ہے، ان میں ادب خالد کی ترجمانی ہے، ان میں جذبات بھی ہیں اور فکری بلندی ہے، ان میں شہوات اور حقیر متاع زندگی کو نظر انداز کر کے آخرت کی زندگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور اس کے لئے انہوں نے محنت کی ہے، اور چند معروف صوفیاء اور اہل دل کے لٹریچر کو غور سے پڑھا ہے، اور ان کا انتخاب کیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے سیرتوں کو پڑھا ہے، مواعظ کو پڑھا ہے، اور ان صوفیاء کے ملفوظات کو پڑھا ہے، اس لئے کہ جو کچھ ان قطعات میں بیان کیا گیا ہے وہ باطن نفس کی ترجمانی ہے اور دین کے ساتھ خلوص اور تقویٰ کی روشنی پیش کی گئی ہے، اس بنا پر کہ یہ ادباء جو ادیب کے لباس میں کبھی سامنے نہیں آئے مگر ان کے اندر فطری ادب کی قوت موجود تھی، یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیاء شاعری بھی کرتے تھے اور بعض صوفیاء شعر سے متمتع بھی ہوتے تھے، حضرت مولانا علی میاں نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر مولانا وصی اللہ صاحب نے مجلس میں پوچھا کہ اس مصرعہ ''میکدہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے'' کا دوسرا مصرعہ کیا ہے کوئی نہ بتا پایا تو خود ہی حضرت مولانا نے فرمایا: مستی کے واسطے بوئے مے تند ہے کافی۔

پس علمائے ربانیین اور صوفیائے عظام کے یہاں جو اعلیٰ ادبی قطعات اور ادبی نمونے نظر آتے ہیں وہ ان کی ادبی عظمت کے نشانات ہیں، چنانچہ امام غزالیؒ، امام حسن بصریؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، عبدالرحمٰن ابن الجوزی اور شیخ نظام الدین اولیاء کی مجالس اور بیانات اعلیٰ ادب کے نمونے سے خالی نہیں ہیں، حضرت مولانا واضح رشید صاحب نے انہیں صوفیاء کو ادباء کے لباس میں پیش کیا ہے، اور ان

کے اقوال بھی پیش کئے ہیں، جو ان کی عظمت پر دال ہیں، سب سے پہلے مولانا واضح صاحب امام حسن بصری پر اپنے مطالعہ اور ان کے ادبی جملوں سے بحث کی ہے، اس لئے کہ امام حسن بصری کی عظمت کو قرآن و حدیث اور اسلامی لٹریچر میں امتیازی حیثیت حاصل ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں کہ امام بصری کے مواعظ میں عمدہ بلیغ ادب کا نمونہ ہے، اور وہ ادب اہل نقد کے مطالعہ کا عمدہ موضوع ہیں۔

امام حسن بصری: (۲۱ھ-۱۱۰):

امام حسن بصری کے اقوال کو بطور نمونے کے ''ادب اھل القلوب'' سے مستعار لے کے یہاں پیش کیا جاتا ہے:

(۱)هيهات هيهات أهلك الناس الأماني، قول بلا عمل، معرفة بغير صبر، ايمان بلا يقين، مالي أرى رجلا ولا أرى عقولا، وأسمع حسيسا ولا أرى أنيسا

ترجمہ: افسوس ہے افسوس ہے، خواہشوں نے لوگوں کو ہلا کر دیا، انکے پاس قول ہے بلا عمل کے، معرفت ہے بغیر صبر کے، ایمان ہے بلا یقین، مجھے کیا ہوا ہے کہ میں دیکھتا ہوں مردوں کو لیکن میں نہیں دیکھتا ہوں عقلوں کو، اور میں سنتا ہوں پھسپھساہٹ کو لیکن میں نہیں دیکھتا ہوں دوست کو۔

(۲)ان من أخلاق المؤمن قوة في دين، وايمانا في يقين، وعلما في حلم، وحلما بعلم، وقيسا في رفق، وتجملا في فاقة، وقصدا في غنى، وشفقة في نفقة، ورحمة لمجهود وعطاء في الحقوق وانصافا في الاستقامة، ولا يحيف على من يغضب، ولا يأثم في مساعدة من يحب، ولا يهمز ولا يلمز ولا يلغو ولا يلهو ولا يلعب ولا يمشي بالنميمة، ولا يتبع ما ليس له، ولا يجحد الحق الذي عليه، ولا يتجاوز في العذر، ولا يشمت في الفجيعة ان حلت بغيره، ولا يسر بالمعصية اذا نزلت بسواه.

ترجمہ: مؤمن کے اخلاق دین میں قوت ہے، اور ایمان ہے یقین میں اور علم ہے برداشت کرنے میں اور عقل ہے علم کے ساتھ، اور بیداری ہے نرمی کے ساتھ، اور فاقہ کی حالت میں شرافت کا اظہار ہے اور اعتدال ہے مالداری کے عالم میں، اور زیادہ خرچ کرنے میں ڈرنا ہے اور حق پسندی کے ساتھ انصاف کرنا ہے، اور جو غصہ میں ہو اس پر زیادتی نہ کرنا ہے، اور کسی کی مدد کرنے میں گناہ نہ کرنا ہے، اور مذاق نہ اڑانا ہے، اور نہ عیب لگانا ہے، اور لغو بات نہ کرنا ہے، اور کھیل کود نہ کرنا ہے، اور چغلی نہ کرنا ہے، اور جہاں اس کا حصہ نہ ہو وہاں کوشش نہ کرنا ہے، اور جو حق اس پر واجب ہو اس کا انکار نہ کرنا ہے، اور عذر میں تجاوز نہ کرنا ہے، اور مصیبت میں خوش نہ ہونا ہے کسی دوسرے پر مصیبت آنے پر، اور خوش نہ ہونا ہے معصیت پر اگر معصیت کسی دوسرے پر آئے۔

یہ اقوال جو حضرت امام حسن بصری کے پیش کئے گئے ہیں ان میں حکمت کا نور بھرا ہے، ان میں موتی و مرجان ہے، ہر فقرہ فکر و دانشوری کا ترجمان ہے، اور ان جملوں میں عملی زندگی کا جادو ہے جن پر عمل کرنے سے زندگی زعفران زار بن جائے گی، اور دل کی دنیا روشن ہو جائے گی، دل میں حق کی چاندنی پھیل جائے گی۔

چونکہ اس کتاب میں سات ادیب صوفیہ کا ذکر ہے اور ان کے ادب پر اور ان کے حکیمانہ اقوال پر بحث کی گئی ہے میرے لئے مشکل ہے کہ سارے اہل نظر صوفیہ کا تفصیلی ذکر کر سکوں اس لئے تمام صوفیہ کے چند اقوال ذکر کے ان کی عظمت کے نقوش کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بشر الحافی (۱۵۰ھ، ۲۲۷ھ):

ان کے اقوال میں سے چند پیش کیے جاتے ہیں:

عقوبة العالم في الدنيا ان يعمى بصر قلبه.

عالم کا عذاب دنیا میں یہ ہے کہ اس کا دل اندھا ہو جائے۔

لا ينبغي أن يأمر بالمعروف وينهى على المنكر الا من يصبر على الأذى.

جو نیکی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو اس کو تکلیف پر صبر کرنا چاہیے۔

لو تفكر الناس في عظمة الله لما عصوا الله.

اگر لوگ اللہ کی عظمت کے بارے میں غور کریں تو پھر اس کی نافرمانی کرنا چھوڑ دیں۔

عز المؤمن استغناء عن الناس وشرفه قيامه بالليل.

مؤمن کی عزت یہ ہے کہ وہ لوگوں سے بے نیاز ہو جائے اور اس کا شرف یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھے، قیام اللیل کرے۔

اكتم حسناتك كما تكتم سيئاتك

اپنی نیکیوں کو چھپاؤ جیسے تم اپنی برائیوں کو چھپاتے ہو۔

الصبر هو الصمت والصمت من الصبر
صبر خاموشی ہے، خاموشی صبر میں سے ہے، یعنی صبر کی ایک قسم ہے۔
لا تعط شيئاً لمخافة ملامة الناس.
کسی کو کوئی چیز ملامت کے ڈر سے مت دو۔
(ادب اہل القلوب مرتبہ مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی، ناشر مکتبہ ابو الحسن علی، دہلی ۲۱۸۲، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، ص ۴۵-۴۶)

الحارث المحاسبی (۱۶۵-۲۴۳ھ):

القلب وأهل القلوب: حارث محاسبی نے قلب کے بارے میں بہت سے اقوال کہے ہیں اور یہ اقوال اکثر احادیث رسول اللہ ﷺ سے عبارت ہیں۔

قال رسول الله ﷺ لمعاذ بن جبلؓ هل يكب الناس في النار على مناخرهم الا حصائد السنتهم
ترجمہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لوگ جہنم میں ڈھکیلے جائیں گے اپنی زبان کے نتائج کے بدلے، (جو زبان قینچی کی طرح دوسروں کی برائی میں چلتی ہے، اس کے بدلے لوگ آگ میں ڈھکیلے جائیں گے)، نگاہوں پر فرض ہے کہ وہ محارم کو دیکھ کر نیچی کر لی جائیں اور جو چیز پوشیدہ رکھی گئی ہے اس کو نگاہوں سے تلاش نہ کیا جائے، حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "النظر سهم من سهام ابليس فمن تركه من خوف الله آتاه ايمانا يجد حلاوته في قلبه.
حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے، پس جس نے اس کو اللہ کے خوف سے چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ایمان عطا فرمائے گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔

فرض السمع تبع للكلام والنظر فكل ما لا يحل لك الكلام فيه ولا النظر اليه لا يحل لك استماعه والتلذذ به.
ترجمہ: سننا اول ہے۔ سننے کے بعد انسان بولتا ہے اور دیکھتا ہے، اس لئے جن چیزوں کے بارے میں گفتگو کو حرام کر دیا گیا ہے اور ان کی طرف دیکھنے کو ناجائز کر دیا گیا تو تم پر لازم ہے کہ نہ تم ان کو سنو اور نہ ان سے لطف اٹھاؤ۔

وفرض الشم تبع للسمع والبصر فكل ما حل لك استماعه ونظره جاز لك شمه.
ترجمہ: سونگھنا اول ہے، سونگھنے کے بعد سننا اور دیکھنا ہے ان چیزوں کا جن کو سننا اور دیکھا جائز ہے، ان کو سونگھنا بھی جائز ہے۔
عجیب کلمات ہیں، اور ان پر غور و فکر سے حضرت حارث محاسبی کی دانشوری کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت ابو حامد غزالی (۴۵۰-۵۰۵ھ):

حضرت امام غزالی کی عظمت کے بیان کے لئے کتابیں درکار ہیں مگر یہاں تنگ دامانی کے باعث ان کے چند اقوال پیش کرتا ہوں:

قال الامام الغزالي: اعلم أن الدين شطران أحدهما ترك المناهي والآخر فعل الطاعات وترك المناهي هو أشد، والطاعات يقدر عليها كل أحد وترك الشهوات لا يقدر عليها الا الصديقون، ولذلك قال النبي ﷺ المهاجر من هجر السوء والمجاهد من جاهد هواه.
ترجمہ: جان لو کہ دین کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ ان گناہوں کا ترک کرنا ہے جن سے منع کیا گیا ہے اور دوسرا حصہ دین کی اطاعت کا ہے، جن برے کاموں سے منع کیا گیا ہے ان پر عمل سخت مشکل ہے، مگر اطاعت پر ہر شخص قادر ہے، شہوتوں کو ترک کرنے پر صدیقین قادر ہیں، اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مہاجر وہ ہے جو برائی کو چھوڑ دے اور مجاہد وہ ہے جو اپنی خواہشات کے خلاف جہاد کرے۔
امام غزالیؒ کے اس بیان میں حقائق کی چاندنی پھیلی ہے، اور ہر ہر جملہ سے حق و سچ کی روشنی عیاں ہے ترک شہوات نفس پر سخت ہے مگر اطاعت پھر بھی آسان ہے۔ (ادب اہل القلوب، ص ۸۴)۔

الشیخ عبدالقادر الجیلانی (۴۷۱-۵۶۱ھ):

یہاں شیخ عبدالقادر جیلانی کے کلام سے کچھ منتخب اقوال ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں:

التواصي بالخير: قالؓ اتبعوا ولا تبتدعوا، وأطيعوا ولا تمرقوا، ووحدوا ولا تشركوا، وصدقوا ولا تشكوا، واصبروا ولا تجزعوا، وثبتوا ولا تنفروا، واسألوا ولا تسأموا، وانتظروا وترقبوا واجتمعوا على الطاعة ولا

تتفرقوا، تحابوا ولا تباغضوا تطهروا عن الذنوب.

ترجمہ: شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا: اللہ کی اطاعت کرو اور بدعت نہ کرو، اطاعت کرو اور نافرمانی نہ کرو، ایک اللہ کو مانو شرک نہ کرو، سچ بولو شکایت نہ کرو، صبر کرو اور ڈرو مت، جم جاؤ بھاگو مت، مانگو اور گھبراؤ مت، انتظار کرو جمع ہو جاؤ اطاعت پر، آپس میں اختلاف نہ کرو، آپس میں محبت کرو بغض نہ کرو۔ گناہوں سے توبہ کرو۔ (ادب اہل القلوب، ص ۱۰۰)

عبد الرحمن ابن الجوزی (۵۱۰-۵۹۷ھ):

رجال لا تلهيهم تجارة (ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت غافل نہیں کرتی)

قال ابن الجوزی: رجال اذا انظروا اعتبروا

ایسے لوگ ہیں جب دیکھتے ہیں تو عبرت حاصل کرتے ہیں

واذا سكتوا تفكروا. (اور جب چپ ہوتے ہیں تو سوچتے ہیں

واذا ابتلوا استرجعوا. (اور جب ان کی آزمائش ہوتی ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں)

واذا جهل عليهم حلموا (اور جب ان کے ساتھ جہالت کی جاتی ہے تو وہ برداشت کرتے ہیں)

واذا علموا تواضعوا (جب وہ جانتے ہیں تو انکساری برتتے ہیں)

واذا عملوا رفقوا (جب عمل کرتے ہیں تو نرمی برتتے ہیں)

واذا سئلوا بذلوا للوارد تفضيلا للمقاصد. (اور جب ان سے مانگا جاتا ہے تو آنے والے پر خرچ کرتے ہیں مقاصد کو ترجیح دینے کے لئے۔ (ادب اہل القلوب، ص ۱۱۹)

الشیخ نظام الدین اولیاء (۶۳۶-۷۲۵ھ):

تلاوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسان تلاوت کرے اور اس کے معانی کے بارے میں غور کرے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تلاوت کرتے وقت اللہ کی عظمت اور جلالت دل پر چھا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قلب اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائے۔

وہ فرماتے تھے کہ جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے کہ وہ اس نعمت کا مستحق نہ تھا جو یہ بڑی نعمت اس کو عطا ہوئی ہے۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کو تلاوت کی توفیق دی ہے۔ (ادب اہل القلوب مکتبہ ابوالحسن علی، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، ۲۰۰۵، ص ۱۶۲)

ادب اہل القلوب کے مصنف مولانا محمد واضح رشید ندوی نے اس کتاب کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ پہلے ان ساتوں صوفی مصنفین کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ بیان فرمائے ہیں پھر ان کے کلام پر اور ان کے ادب پر تبصرہ کیا ہے، تبصرے کے بعد ان کے ادب سے انتخاب کیا ہے، ان کے احوال پیش کئے ہیں، اور ان کے ادب کا نمونہ پیش کیا ہے، اور بسا اوقات بحثوں میں اختصار نہیں برتا ہے، خصوصا ابن الجوزی میں طوالت سے کام لیا ہے، اور خوب لکھا ہے، مگر ان سات مصنفین کے بارے میں ایک مقالہ میں اتنا ہی ممکن تھا کہ میں نے تمام مصنفین سے نمونہ کے طور پر ان کا کلام پیش کر دیا ہے، اور کوشش کی ہے کہ ہر ایک کے انداز بیان کا ناظرین کو اندازہ ہو جائے، ظاہر ہے کہ یہ تمام مصنفین بڑے صوفیہ اور بڑے اہل دل گذرے ہیں جنہوں نے اپنے دور میں زبردست اصلاح وارشاد سے پوری امت کو نفع پہونچایا ہے، اس لئے مولانا واضح رشید صاحب نے سارے صوفیہ کو اس میں شامل نہیں کیا ہے، ورنہ کتاب ضخیم ہو جاتی، مثلا اس میں مجدد الف ثانی اور ان کے مکتوبات سے تعرض نہیں کیا ہے، مگر حضرت مولانا کا مقصد ان ادباء کا نمونہ پیش کرنا تھا جو دل کی زبان سے لکھتے ہیں، اور جو ہمارے اخلاق اور ہمارے اسلامی احساسات کو جلا بخشتے ہیں، اور ان کا ارادہ اس کتاب کے بعد اس کے دوسرے حصوں کی ترتیب وتدوین کا بھی تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم اس کتاب کے دوسرے اجزاء آئندہ پیش کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی کام لیا جو ان کے لئے مقدر تھا، یہ توفیق بھی اس کی مرضی اور رضا سے مولانا واضح رشید صاحب کو عطا ہوئی۔ (دیکھئے ادب اہل القلوب، ص ۱۷۹)

أعد ذكر نعمان لنا فان ذكره

هو المسك، ما كررته، يتضوع

ہمارے لئے نعمان کا ذکر دہراؤ، ان کا ذکر مشک ہے، جب دہراؤ گے تو خوشبو پھیلے گی۔

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی عربی تالیف
''إلی نظام عالمی جدید''-ایک معروضی مطالعہ

ڈاکٹر شاکر فرخ ندوی
مدیر التحریر عربی مجلہ ''المظاہر'' جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی عصر حاضر کے ایک معروف قلم کار، عربی زبان کے معروف ادیب، عظیم اسلامی صحافی، عالی دماغ مفکر، اسلام کے مخلص داعی اور مغربی تمدن کے ممتاز ناقد تھے، آپ سماج کی چیرہ دستیوں، یورپ و امریکہ کی سازشوں، مغربی تمدن و ثقافت کی ریشہ دوانیوں اور دنیا میں اسلام کے خلاف اٹھنے والے نت نئے فتنوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کے مصادر و مآخذ پر آپ کی گہری نگاہ تھی، آپ کے اشہب تیز گام نے ہمیشہ صہیونی واستعماری نظر وفکر پر کاری ضرب لگائی ہے، اور تہذیب حاضر کی چمک اور اس کے پردے میں پوشیدہ خطرات کو بے نقاب کیا اور ملت کو ان خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات اور تمدن کی روشنی میں متبادل پیش کیا، آپ کی ہر تحریر میں کسی نہ کسی زاویہ سے مغربی تمدن کے اخلاق سوز وانسانیت سوز فتنہ کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور آپ کے نوک قلم نے ان کے غبارہ کی ہوا نکالی ہے۔

مغربی تہذیب وتمدن اور اسلامیت ومغربیت کی کشمکش آپ کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، اور اس موضوع پر آپ کے گہربار قلم سے بہت سارے مقالات، کتابیں اور تحریریں عربی اور اردو زبان میں منظر عام پر آئی ہیں، انہیں کتابوں میں سے ایک عربی تصنیف ''إلی نظام عالمی جدید'' ہے، جو مغربی تہذیب وتمدن اور اسلام کے تعلق سے لکھے گئے آپ کے مختلف مقالات کا مجموعہ ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے ۲۰۱۲ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، یہ کتاب ۳۲۷/صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کے آغاز میں آپ کے برادر معظم جناب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کا وقیع مقدمہ ہے، اس کے بعد ''کلمۃ بین یدی الکتاب'' یعنی پیش لفظ کے عنوان سے مولانا نے اپنے جذبات واحساسات کو قلم بند کیا ہے، اس کے بعد مولانا نذر الحفیظ ندوی مدظلہ العالی نے صاحب کتاب اور کتاب کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہے، کتاب میں ایک تمہید دو باب ہیں، پہلا باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے جب کہ دوسرے باب میں دو فصلیں ہیں۔

جیسا کہ کتاب کے مرکزی عنوان ''إلی نظام عالمی جدید'' (ایک جدید عالمی نظام) سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں عصر حاضر کے اس نظام کو نشانہ بنایا گیا ہے جس کو یورپ و امریکہ اور استعماری وصہیونی طاقتیں پورے عالم پر نافذ کرنا چاہتی ہیں، درحقیقت یہ ایک ایسا نظام ہے جس کی بنیاد دین بیزاری اور خواہشات نفس پر ہے بلکہ اس نظام کے تحت خواہشات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، صہیونی فن کاروں نے اپنے غلبہ کی خاطر پوری دنیا پر اس نظام کو لاگو کرنے کا پلان بنایا ہے، اور اسلام اور اسلامی تہذیب کو خصوصیت کے ساتھ نشانہ بنایا ہے، چونکہ انہیں معلوم ہے کہ اگر کوئی طاقت ان کے عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ بن سکتی ہے تو وہ اسلام کی طاقت ہے اور اسلام کی زندہ تہذیب اور روشن تعلیمات ہیں، چنانچہ انہوں نے میڈیا کے تمام وسائل وذرائع کو اس کے لئے استعمال کیا اور تاہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں مغربی تہذیب وتمدن، سامراجیت، عیسائی تبلیغی تحریک، اقتصادی تسلط کی خاطر مغربی دنیا کی سازشوں اور فکری انحراف کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کی پہلی فصل کا عنوان ''مغربی دنیا کی حقیقی صورت حال کے تضادات'' ہے، اس فصل کے پہلے مقالہ میں مؤلف نے قرون وسطیٰ اور عصر حاضر کے یورپ کے حالات کی تصویر کشی کی ہے، اور بتایا ہے کہ قرون وسطیٰ کا جو دور کہلاتا ہے وہ ظلم و جبر، پسماندگی، دینی وگروہی عصبیتوں، جہالت و ناخواندگی، فقر وافلاس اور یورپ کی حرماں نصیبی کا دور ہے، جہاں رؤسا وامراء کے طبقہ نے کمزوروں اور ضعیفوں پر ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو اپنا

حق سمجھ رکھا تھا، اس کے بعد مولانا نے واضح کیا کہ پھر آزادی کی ہواچلی، اور دوعالمی جنگوں کے نتیجہ میں ان اقوام کو آزادی حاصل ہوئی۔انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر بہت ساری تنظیموں کا وجود ہوا، عالمی سطح پر امن وامان قائم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا، اور اس عرصہ میں اس مغربی تہذیب کا نقطۂ ارتکاز فرد کی آزادی اور خوشحالی کو بحال کرنا تھا، اسی نقطۂ نظر سے رائے کی آزادی، مافی الضمیر کے اظہار کی آزادی، عقیدہ وفکر اور طرز زندگی اختیار کرنے کی مکمل آزادی دی گئی، اور جو ممالک سامراج کی زد میں تھے ان کو بھی آزادی کا پروانہ حاصل ہوا جس کے نتیجہ میں اقوام متحدہ میں ارکان ممالک کی تعداد ۱۹۴ تک پہنچ گئی، اقوام متحدہ نے بھی عرصہ تک ان ممالک کی آزادی، تہذیب وتمدن اور عقیدہ وفکر کے تحفظ میں اہم رول ادا کیا اور بڑی حکومتوں کے خطرات سے اور ان کی ظلم وزیادتی سے ان کو محفوظ رکھنے میں مطلوبہ کردار ادا کیا ہے۔

لیکن موجودہ عہد میں جدید عالمی نظام یا نیو ورلڈ آرڈر یا گلوبلائزیشن کے نام سے ایک عالمی انقلاب پیدا ہوا، جس کے بعد اقوام متحدہ یا انسانی حقوق کی خاطر کام کرنے والی دیگر تمام تنظیموں کا رول کلی طور پر ختم ہوگیا، ظاہری طور پر اس نظام کا مقصد یہی تھا کہ دنیا میں خوشحالی پیدا ہو، مالدار ممالک کمزور ممالک کا تعاون کریں، لیکن بہت جلد ہی یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اس جدید عالمی نظام کے نتیجہ میں آزادی سلب کی جارہی ہے، اور ایک مرتبہ پھر دنیا میں سامراج کا غلبہ ہورہا ہے، اور پھر دنیا میں قرون وسطیٰ کا زمانہ واپس آرہا ہے، دینی و قومی عصبیتوں کی آگ پھر بھڑکنے لگی، معصوم باشندوں کے خون کو ارزاں سمجھا جانے لگا، اور وہ ساری خرابیاں جو اس دور میں پائی جاتی تھیں اس دور کا حصہ بن گئیں، اقوام متحدہ، ممالک کی تہذیب وثقافت، عقائد وافکار اور انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر قائم ہونے والی دیگر تنظیموں کی بھی کوئی حیثیت اور کوئی وزن باقی نہیں رہا۔مولانا نے ایک انگریزی اخبار کے حوالہ سے یہ رائے نقل کی کہ دنیا کے ممالک کی تعداد گرچہ ۱۹۴ ہے، لیکن حقیقت میں پوری دنیا ایک ہی ملک ہے، اور تمام ملک اور شہر اس کے تابع ہیں، ٹائمس آف انڈیا کے ایک مضمون میں لکھا گیا کہ امریکہ تنہا ایک ملک اس وقت پوری دنیا میں تسلط قائم کئے ہوئے ہے، صرف فرانس واحد ملک ہے جو اس کی عالمی بالادستی کو قبول نہیں کرتا ہے، اس کے بعد مولانا نے مذہب کے نام پر لڑی جانے والی عصر حاضر کی جنگوں کا تذکرہ کیا ہے اور استشہاد کے طور پر عالمی سطح کے سیاسی جائزہ نگاروں اور مفکرین کے اقوال پیش کرکے یہ ثابت کیا کہ دنیا میں ایک بار پھر قرون وسطیٰ کا عہد عود کرنے والا ہے۔

اس کے بعد بھی اس فصل میں جو مقالات ہیں ان کے ذریعہ مولانا نے جدید یورپ اور مغربی دنیا کی موجودہ صورت حال کا نقشہ کھینچ کر یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی کے نام پر یورپی دنیا میں افراد کا اور قوموں کا استحصال کیا گیا ہے، آپ کے قلم نے صراحت کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ جدید مغربی معاشرہ اس وقت کراہ رہا ہے، اضطراب وبے چینی کی کیفیت سے دوچار ہے، اور یورپی معاشروں کے علمبردار جو مغربی تہذیب وتمدن کی ترقی کے دعوے کرتے ہیں وہ سب کھوکھلے دعوے ہیں، یورپ کا انسان اس وقت زبان، تہذیب، رنگ ونسل، پیشہ وصنعت اور قومی ونسلی عصبیت کے عفریت کا شکار ہے، لیکن یہ چیزیں منظر عام پر نہیں آتی ہیں اس کی وجہ ذکر کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''یورپ نے جس وقت سے مشرقی ملکوں پر تسلط قائم کیا ہے، اس وقت سے اس کی عادت یہ بن گئی ہے کہ اپنے ممالک کی کمزوریوں سے چشم پوشی کرکے ان مشرقی ممالک کے عیوب کو تلاش کیا جائے، وہاں کی سیاست پر بھی یہی رنگ غالب ہے، ان ممالک کے لکھنے والے نہ تو موجودہ تہذیب کی برائیوں اور خامیوں پر کوئی تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی یورپ کے اندرونی خلفشار، اخلاقی انارکی اور خطرات کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ اس کے برعکس خارجی دنیا کے حالات پر لکھتے ہیں، ان کی مثال شتر مرغ کی سی ہے جو ریت میں اپنا سر چھپالیتا ہے''۔(اِلی نظام عالمی جدید/۴۶)

موجودہ یورپ کی صورت حال کے متعلق مولانا تبصرہ کرتے ہوئے اسی کتاب میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: کہ مادی وعسکری قوت نے یورپ کے گھناؤنے چہرہ اور اندرونی خطرات پر پردہ ڈال رکھا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے نوجوان جرائم قتل اور خودکشی اور ہلاکت وبربادی کے عادی ہوچکے ہیں اور وہ اپنی اس تہذیب اور اس کی جھوٹی چمک دمک سے اوب چکے ہیں، جس کی وجہ سے یورپ کا دبدبہ ختم ہوچکا ہے اور عالمی مسائل حل کرنے میں یورپی ممالک پوری طرح ناکام ہورہے ہیں۔

اس باب کی دوسری فصل کا عنوان ہے ''مغربی تہذیب دہشت گردی اور ہلاکت وبربادی پر مبنی ہے اور محرومی وبدبختی کا باعث ہے''،

اس کے ذیل میں جو مقالات پیش کئے گئے ہیں ان میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ یورپ دنیا میں دہشت گردی کا سرچشمہ ہے، اور مغربی تہذیب کے خمیر میں استغلال، ثنویت دوراہی اور دوہرا پن ہے، اور باوجود اس کے کہ اس تہذیب جدید کی ترقی کے بلند بانگ دعوے کئے جارہے ہیں لیکن اس سے انسانیت کے حالات میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا نہیں ہورہی ہے، بلکہ اس کے برعکس ذہنی اضطراب و بے چینی، اخلاقی گراوٹ، انسانی شعور کا فقدان اور سماجی ہمدردی کا خاتمہ ہورہا ہے، اور بلاشبہ اس تہذیب نو کا سب سے پہلا شکار انسان ہے، جس کے اندر سے انسانیت ختم ہوتی جارہی ہے اور انسان حیوان بنتا جارہا ہے، اور انسانی مصائب میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، آج انسان کا وطن، اس کے افکار وخیالات، عقائد، مادی چیزیں سب خطرہ میں ہیں، دلوں کا چین واطمینان رخصت ہو چکا ہے، راحت وآرام کے وسائل کی فراوانی کے باوجود امن وسلامتی اور ذہنی سکون کا تصور ختم ہوگیا ہے، بلند و بالا محلات میں رہنے والا انسان اپنے پہرے داروں اور چپراسیوں بلکہ اپنے گھر والوں تک پر بھروسہ نہیں کرتا ہے، اخبارات میں اس نوعیت کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ لڑکے اپنے والد اور والدا اپنے لڑکوں کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنارہے ہیں، نہ مالداروں کے محلات محفوظ ہیں اور نہ فقیروں کے جھونپڑے، نہ بچوں کے اسکول اور مدارس محفوظ ہیں، اور نہ قید خانے اور جیلیں اور نہ قیدی۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے کہ تعلیم وتربیت بھی آپ کا پسندیدہ موضوع تھا، قدیم وجدید تعلیم اور مشرقی ومغربی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم اور اس کے اہداف ومقاصد پر بھی آپ کی گہری نگاہ تھی، مولانا تعلیم کو سماج کی ترقی، ذہنوں کی بالیدگی اور انسانی تعمیر وترقی کا ذریعہ گردانتے تھے، لیکن یورپ کے فسادزدہ ذہنوں کے تیار کردہ جدید نظام تعلیم اور نصاب تعلیم نے علوم کو کسب معاش اور مادہ کے حصول کا ذریعہ بنادیا، اور اس طرح علم نے انسانی تعمیر کے میدان سے انحراف کا راستہ اختیار کیا۔ تیسری فصل میں مولانا نے اسی موضوع پر ناقدانہ مضامین اور تجزیاتی تبصرے پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ تعلیم کے راستہ سے اخلاقیات کے شفاف چہرہ کو کیسے گدلا کیا جارہا ہے، اور تعلیم کے نام پر اباحیت ولذتیت کا راستہ صاف اور عقیدہ وفکر کے جیب وگریباں کو کیسے تار تار کیا جارہا ہے، اور کس طرح خطرناک رجحانات چوردروازوں سے انسانیت کو تباہ کررہے ہیں، اور علمی ترقی کے نام پر دنیا کس عظیم خطرہ کی طرف بڑھتی جارہی ہے، مولانا نے بتایا کہ اس نئے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے ذریعہ اسلامی تاریخ کی شبیہ کو بگاڑنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے، اور یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ اسلام علمی ترقی کا مخالف ہے، تعصب کا دین ہے، جہالت و رجعت پسندی چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ، پھر مولانا نے اسلامی تعلیمات کے چہرہ کو صاف شفاف کرنے کی کوشش کی ہے، اور بتایا کہ ان اسلام دشمن مؤلفین کا مقصد تحقیق، علم اور ریسرچ کے نام پر ایسے باطل مزعومات وافکار کو فروغ دینا ہے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اور اسلام اور اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے ایسی باتیں عام کرنا ہے جن سے عوام کے اندر اسلام سے نفور پیدا ہوجائے اور دنیا کے دیگر مذاہب اور آئیڈیالوجیز کی طرح اسلام بھی ایک فرسودہ اور ازکار رفتہ مذہب اور پرانی یادگار خیال کیا جائے، جو محض ایک شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار وخیالات کا نتیجہ اور کچھ رسمی عبادات کا مجموعہ ہے، چنانچہ اس ذیل میں جو کوششیں ہوئیں ان میں سے چند کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''ایک مغربی نامور عالم جس کو اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کا ماہر خیال کیا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسلام ایک تاریخی اسطورہ ہے، دوسرے ایک عالم کا قول ہے کہ اسلام کی ہر خوبی کا مصدر و ماخذ یونان ہے، ایک اور عالم کا قول ہے کہ اسلام عہد رسول میں پائے جانے والے سابقہ ادیان و مذاہب کی نقل ہے''، اس کے لئے یہ بھی ضروری خیال کیا گیا کہ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار اس طرح کیا جائے کہ ان کی عظمت دلوں سے نکل جائے، چنانچہ ایک عالم کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک قومی قائد ورہبر تھے، دوسرا کہتا ہے کہ وہ تو صحرا کے ایک فرد تھے، کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک کامیاب سیاسی قائد تھے لیکن نبی نہیں تھے، کوئی نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکوک العقل وغیرہ کہتا ہے، یہ اور اس طرح کی چیزیں علم وتحقیق کے نام پر عام کی جارہی ہیں، آخر ان کا علم وتحقیق سے کیا تعلق؟ گویا کہ علم وتحقیق کے نام پر دلوں میں پوشیدہ بغض وعناد اور دشمنی کا اظہار ہورہا ہے۔ (ص:۱۴۶)

چوتھی اور پانچویں فصل میں مولانا نے واضح کیا ہے کہ اصطلاحات کے ساتھ کس طرح کھلواڑ کیا جارہا ہے، الفاظ کے معانی و مفاہیم کو تبدیل کرکے غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، اصلاح پسندوں کو مفسدین اور فساد پھیلانے والوں کو مصلح کہا جارہا ہے، غلط تصورات کو عام کیا جارہا ہے، دینی اقدار وقیم کی حفاظت کرنے والوں کے لئے

اصولیین یعنی فنڈامینٹلسٹ کا لفظ استعمال کیا گیا، لیکن بعد میں خالصۃً اسلام پسندوں کے لئے یہ لفظ بولا جانے لگا، اوران کے اوپر پابندیاں لگائی گئی، اس کے برعکس یورپی معاشروں میں عیسائیت کے پیروکاروں اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے والوں کو پوری چھوٹ دیدی گئی، اور وہ اصطلاح جس کو اصلا یورپی معاشرہ میں عیسائیت کی مخالفت میں رائج کیا گیا آہستہ آہستہ اسلام دشمنی میں اسی اصطلاح کو اسلام پسندوں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا، ''اسلامی اصولیت'' فنڈامینٹلزم'' کے مغربی مفہوم'' کے عنوان سے مولانا ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''عیسائی اصولیت (فنڈامینٹلزم) علم وتہذیب کے مخالف ایک سلبی ومنفی تحریک تھی، لیکن ان مغربی حضرات کی نظروں میں اسلامی اصولیت اسلامی اصولوں کی پیروی کا نام ہے، چنانچہ ہائرڈلمحان جوایک جرمن امریکی عیسائی ہے، نیویارک یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس کا استاذ ہے، اور اسلامی علوم اور مشرقی تمدن کے ایک ماہر کی حیثیت سے بھی متعارف ہے، ایک دوسرے ادارہ میں مشرق وسطی کے حالات کے متعلق لکچر دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اسلامی اصولیت کے مظاہر مندرجہ ذیل ہیں:

مسجد میں اہتمام کے ساتھ پانچوں وقتوں کی نماز ادا کرنا۔ارکان خمسہ کی ادائیگی کی پابندی کرنا۔شراب وغیرہ جیسی حرام چیزوں سے بچتے ہوئے مثالی زندگی گذارنا۔ دینی امور میں غور وفکر اور قرآن کی تلاوت کرنا اور اہتمام سے اسلام کے متعلق لکھنا۔اسلام پر عمل کرنے کی نیت سے داڑھی بڑھانا۔مونچھیں کٹانا۔عورتوں اور مردوں کو مخصوص لباس استعمال کرنا۔

آگے کہتا ہے کہ کچھ الفاظ ایسے کہ اصولی لوگوں کے یہاں ان کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، مثلاً: جاہلیت، فساد، توحید، مکروہ، افتراء، کافر، اللہ کے دشمن، شرکی طاقتیں، نور وظلمت، موت، بدعت، طاغوت، ملحد، گمراہ، زندیق، اللہ کی مدد، فتح قریب، حلال وحرام وغیرہ''۔(ص:۱۶۹)

گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اگر یہ امور آپ کے اندر پائے جائیں گے تو یورپی معاشرہ میں آپ کو فنڈامینٹل اور رجعت پسند اور ترقی کے مخالف تصور کیا جائے گا، لہذا اس طرح کے امور کی پابندی کرنے اور ان الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

دوسرے باب میں مولانا نے دو فصلیں کی ہیں: پہلی فصل کا عنوان إلی نظام عالمی جدید ہے، جس کے تحت مولانا نے اس جدید عالمی نظام کے اغراض ومقاصد اور اہداف ونتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کو ایک بہتر متبادل کے طور پر پیش کیا ہے، اور پھر دوسری فصل میں اسلامی وغیر اسلامی نظام کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے اسلامی نظام کی خوبیوں اور امتیازات کا ذکر کیا ہے، نیز دنیا سے مطالبہ کیا ہے کہ اگر آج کی یہ ترقی یافتہ دنیا حقیقی معنی میں سکون واطمینان کی متلاشی ہے اور امن وامان کی طلبگار ہے اور اس نے بہت سارے نظاموں، آئیڈیالوجیز اور ازموں کو آزما کر دیکھ لیا ہے اب وہ اسلام کے آفاقی نظام کا تجربہ کر کے دیکھے، اسلام میں جو انسانی اقدار کا تحفظ ہے اور اسلامی معاشرہ میں جو ہمدردی وغم گساری پائی جاتی ہے اسلام دشمنی چھوڑ کر انصاف کی آنکھ سے مطالعہ کرے اور اپنے معاشروں کو اسلامی طرز پر ڈھالے تو دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوگا، مظلوم ومقہور اقوام وملل کو ان کا حق حاصل ہوگا، اور وہ لوگ جو اسلام کو علم کا دشمن اور ترقی کا حریف سمجھتے ہیں ان کے سامنے بھی حقیقت آشکارا ہوجائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا واضح رشید ندوی ان معدودے افراد میں سے ہیں جنہوں نے اپنے عقابی ذہن اور دوررس نگاہ سے مغرب کے فکری حملوں اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے خطرات کا ادراک کرلیا تھا، اور عرب کے جدت پسند مصنفین کی مغربی افکار و خیالات سے متاثر تحریروں کو پڑھ کر آپ کی ایمانی حمیت پھڑک اٹھی اور ایک مجاہد وسپہ سالار کی حیثیت سے اسلام سے دفاع کی خاطر آپ نے یہ مقالات تحریر کئے، اور مغربی فکری ڈھانچہ کا علمی پوسٹ مارٹم کیا، مغرب اور سامراج کے حقیقی اہداف کو بے نقاب کیا، مغرب کی تمدنی، سیاسی اور دینی تاریخ کے عمیق مطالعہ اور دلائل وبراہین پر مبنی علمی اور موضوعی جائزہ پیش کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مغربی تہذیب دہشت پسندی، استغلال وشنویت کی تہذیب ہے، انسانی شعور کا اس تہذیب میں فقدان ہے، مغربی علوم نے انسان کی تعمیر سے انحراف کا راستہ اختیار کرلیا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان اس تہذیب کے سایہ میں ہر طرح کی حرماں نصیبی کا شکار ہے، اور جب تک عالمی قیادت مغربی دنیا کے ہاتھ میں رہے گی انسان زوال وانحطاط اور پسپائی کا شکار ہوتا رہے گا، مغربی تہذیب، اس کے ذریعہ وجود پذیر ہونے والے سیاسی واقتصادی نظام، تعلیمی وتربیتی مناہج، عیسائی مشنریز کے وسائل یہ سب سامراج کے مقاصد کو پورا کرتے رہیں گے، مؤلف پورے اعتماد اور دلائل کے ساتھ واضح کرتے ہیں کہ ان سارے مسائل اور مشکلات کا حل اسلامی نظام کو اپنانے میں ہے جو تمام وضعی قوانین سے جدا اور ممتاز ہے، اس کے لئے مغربی دنیا کو اسلام اور مسلمانوں

کے تئیں اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی اور صلیبی جنگوں کے خوف سے اور مغربی تمدن کی جھوٹی شان وشوکت کے خول سے باہر نکلنا ہوگا۔ یہاں پہنچ پر مؤلف محترم اسلامی نظام کو بہتر متبادل کے طور پر پیش کرتے ہیں، اور اسلامی نظام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: اسلام اخلاقیات واقدار اور ذمہ داری کا احساس پیدا کر کے فرد کی تربیت اور معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے، اس کے لئے مثالیں اور نمونہ پیش کرتا ہے، آقا وغلام کے درمیان ہر طرح کی عبودیت و پرستش پر قدغن لگاتا ہے، ہر طرح کی رواداری، اقربا پروری، ہمدردی وتعلقات سے بالاتر ہوکر فتنہ وفساد کی تمام راہوں کو مسدود کرتا ہے، حقیقت یہی ہے کہ یہ اسلامی نظام انسانی فطرت کے عین مطابق، نفاذ کے اعتبار سے سب زیادہ آسان، آسانی سے برتا جانے والا، زیادہ مؤثر اور زندگی کی ضروریات وتقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ہم جیسے مبتدی قارئین کے سامنے مغربی تہذیب، صلبیت وصہیونیت، سامراج اور جدید عالمی کے تعلق سے نئے انکشافات سامنے آتے ہیں اور پھر اس تہذیب کی خامیاں اور اسلامی تہذیب کا تفوق و امتیاز سامنے آتا ہے۔ ذیل میں اس کتاب کے اہم خصائص کو ذکر کیا جاتا ہے:

۱- پیش کرنے اور تنقید وتحلیل کا اسلوب خالص علمی اور موضوعی ہے، جس میں وقار ہے اور توازن ہے، مغربی تہذیب وتمدن اور مادی فلسفہ کی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے، مغرب میں پائے جانے والے جدید فکری وادبی رجحانات، سیاسی سرگرمیوں، تباہ کن تحریکوں کا بہترین تجزیہ ہے، ہر لفظ کے پیچھے مغرب کی تاریخ سے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جس وقت یورپ کو مولانا دہشت گردی کا مصدر قرار دیتے ہیں تو مغربی تہذیب کی تاریخ، موجودہ نظام، دہشت گرد جماعتوں، اور ان افواج کا تذکرہ کرتے ہیں جن کو مغربی حکومتوں کی امداد اور حمایت حاصل ہے، انہیں کے زیر تربیت یہ فوجی پروان چڑھتے ہیں، انہیں ممالک نے ان کو اسلحہ فراہم کیا ہے، ان کی عسکری تربیت کی ہے اور ان کو مادی مدد پہنچائی ہے۔

۲- کتاب میں شامل مقالات کے ایک ایک لفظ سے مولانا کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ایک مجاہد اسلام کے دفاع کے معرکہ میں سرگرم عمل ہے اور اپنے ماتحت لشکر کو محاذ سنبھالنے اور جدید وطاقتور وسائل کے ذریعہ اسلام کا پرزور دفاع کرنے کی دعوت دے رہا ہے، تاکہ اسلام اور اسلام کا مضبوط قلعہ دشمنوں سے اور ان کے خطرناک حملوں سے محفوظ رہ سکے۔

۳- مولانا چونکہ ایک قرآنی انسان تھے، اس لئے ہر پریشانی کا حل اسی کتاب الٰہی میں تلاش کیا کرتے تھے، اور قرآنی نور سے روشنی حاصل کیا کرتے تھے، جس سے مولانا کے اسلوب اور تحریر میں قوت پیدا ہوجاتی تھی، اور تنقید کا صحیح معیار بھی قائم ہوتا تھا۔

۴- اس کتاب کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ اس نے مغربی دنیا کو ہر طرح بے نقاب کیا ہے، اور مغربی پروپیگنڈے نے مغرب کے سیاہ اور گھناؤنے چہرہ پر جو دبیز پردہ ڈال دیا ہے اس پردہ کو چاک کر کے دنیا کو دکھایا ہے کہ موجودہ مغربی دنیا قرون وسطی کے عہد سے زیادہ تاریک ہے اور موجودہ متمدن انسان حیوانی زندگی گذار رہا ہے، جبر و استبداد کا شکار ہے، عبودیت و مذلت اس کا مقدر ہے وہ اپنے اور انسانیت کے مستقبل سے ناامید ہے۔

۵- کتاب کی آخری فصل جو اسلام، اسلامی نظام اور اسلامی تہذیب وتمدن کے امتیازات وخصوصیات پر مبنی ہے، اس کو پڑھ کر مؤمن کے دل میں اطمینان پیدا ہوتا ہے، اپنے دین پر اعتماد اور اس دین سے انتساب پر فخر محسوس ہوتا ہے، اسلامی پیغام کی ابدیت و آفاقیت، جاودانی وعالمگیریت اور ہر دور اور ہر زمانہ میں نوع انسانی کی قیادت کے لئے اسلام کے استحقاق وصلاحیت کا علم ہوتا ہے، مغربی تہذیب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی نفسیاتی بیماریوں اور پریشانیوں کا حل اسلام اور اسلامی تعلیمات میں نظر آتا ہے، اور جو خودکشی کر رہے ہیں جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں، سکون واطمینان کے متلاشی ہیں دین متین سے ان کی دوری پر افسوس ہوتا ہے، اور اللہ نے ہمیں اس دین سے نوازا ہے، اس پر شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اپنے مذہب پر اعتماد مزید پختہ ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی کتابیں اور مقالات دنیا کی مختلف زبانوں میں پیش کئے جائیں تاکہ مغربی تہذیب وتمدن کی حقیقت دنیا کے سامنے آئے، اور اسلام اسلامی تہذیب وتمدن کا تفوق وامتیاز اور خصوصیات بھی سامنے آئیں اور اس کی روشنی میں انسان قوت فکر کا استعمال کرتے ہوئے صحیح فیصلہ کرے اور انسانی تعمیر و ترقی کے لئے صحیح منہج اور نظام کے تحت کام کرے۔

☆☆☆

الغزوالفکری-ایک تجزیاتی مطالعہ

ابوسعد اعظمی
شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا واضح رشید ندویؒ کا تعلق علماء کی اس مختصر جماعت سے تھا جنہیں عربی زبان وادب کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل ہے۔آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستگی نے انہیں زبان کی نزاکتوں کا ماہر بنادیا۔مولانا زکریا کاندھلویؒ کے ایماء پر آپ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس سے منسلک ہوگئے اور آخر تک اس سے وابستہ رہے۔مولانا کی سادگی،تواضع،علم دوستی اور مہمان نوازی کا ہر شخص معترف ہے۔البعث الاسلامی میں صور واوضاع کے تحت آپ مستقل قومی وبین الاقوامی حالات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ پیش کرتے رہے۔استشراق پر آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا،سیرت کے موضوع پر جن مستشرقین نے قلم اٹھایا ہے آپ نے بڑی باریک بینی سے ان کا مطالعہ کیا تھا اور دوران درس سیرتی مباحث میں مستشرقین کے عائد کردہ الزامات اوران کی تحریروں میں موجود میٹھے زہر کی اکثر نشاندہی کرتے،اسی طرح مغربی تہذیب،اس کے خدوخال اور فکری پستی وزبوں حالی بھی آپ کے مطالعہ کا خصوصی موضوع تھا،اپنے مضامین میں اس پر خوب تنقید کرتے۔البعث الاسلامی اور الرائد کے صفحات اس کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔

زیر تعارف کتاب ''من قضایا الفکر الاسلامی:الغزوالفکری'' مولانا کی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کے طلبہ کے سامنے مولانا کے پیش کردہ مقالات ومحاضرات کا مجموعہ ہے۔عرصہ دراز سے یہ قیمتی تحریریں مختلف فائلوں اور مجلّات کے صفحات میں دبی ہوئی تھیں،مولانا کے شاگرد عزیز اوران کے علمی معاون محمد وثیق ندوی نے اس کی جمع وترتیب اور مراجع کی نشاندہی کی،اس کام میں انہیں محمد سالم سولانکی کا تعاون بھی حاصل رہا۔پھر دارالرشید لکھنؤ نے ۲۰۱۶ میں اسے خوب اہتمام سے شائع کیا۔کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مولانا رابع ندوی،مولانا محمد اکرم ندوی اور جعفر مسعود حسنی ندوی کی تحریریں بھی بالترتیب مقدمہ،تعریف الکتاب اور کلمۃ الناشر کے عنوان سے شامل ہیں۔

اس کتاب میں الغزوالفکری،اس کے مختلف پہلو،اس کے سنگین نتائج اور دوررس اثرات کو بڑے ہی اختصار اور جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔پیش لفظ میں مولانا کتاب کی غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں،''یہ کتاب درحقیقت ان مقالات کا مجموعہ ہے جو میں نے آج سے بیس سال قبل اس معہد میں پیش کیا تھا۔اس کتاب میں یورپ کی تاریخ،اس کی نشأۃ،اس میں رونما ہونے والی تحریکات وافکار اور مختلف نظامہائے سیاسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ معہد عالی کے طلبہ یورپ کے افکار اور عالم اسلام کے فکر اور سیاسی نظام پر قابض ہونے کے لئے یورپ کی طرف سے کی جانے والی مسلسل ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے کسی سطح پر واقف ہوسکیں''۔

فکری یلغار کی اپنی ایک تاریخ ہے۔اس کا بنیادی مقصد اسلامی عقائد میں شکوک وشبہات پیدا کرنا اور تشدد وتلوار کی راہ چھوڑ کر مسلمانوں کو دین اسلام سے بیزار کرنے کی کوشش کرنا ہے۔اس لئے کہ میدان جنگ میں صلیبیوں کی پے درپے ہزیمت نے ان پر اس بات کو واضح کردیا کہ مسلمانوں کی قوت کا اصل راز اور حقیقی سرچشمہ دین اسلام ہے اور اگر مسلمانوں پر فتح حاصل کرنی ہے تو ان کا رشتہ اس چشمہ صافی سے کاٹنا ہوگا۔چنانچہ مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنے اور عقائد اسلامی میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے انہوں نے طرح طرح سے کوششیں کیں جو غزوفکری کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا محمد رابع ندوی-حفظہ اللہ ورعاہ-مقدمہ میں کتاب کی علمی

قدر و قیمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس کتاب کے مطالعہ سے مغربی تہذیب کی بدنمائی، اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لئے ان کی ریشہ دوانیوں اور نت نئے منصوبہ بندیوں کا بھی علم ہوگا۔ غزو فکری، اس کے اسباب ووسائل، مختلف افکار ونظریات اور مغربی تحریکات وتنظیمات سے واقفیت ہوگی۔ امت مسلمہ جن مسائل ومشکلات سے گزر رہی ہے اس کا حل تلاش کرنے میں بھی آسانی ہوگی اور زندگی کے تئیں مغربی افکار ونظریات اور آئیڈیالوجی کا سامنا کرنے کا طریقہ کار بھی واضح ہوگا''۔

ڈاکٹر اکرم ندوی نے اس کتاب کو فکر اسلامی اور مغربی فکر کے درمیان جاری کشمکش کا قابل اعتماد علمی سرمایہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کتاب ثقافتی یلغار کی حقیقی تصویر کشی کرتی ہے۔ معتدل ومتوازن اور علمی انداز میں عالم اسلام پر اس کے اثرات کا فکری وثقافتی حل پیش کرتی ہے۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ان میں موضوع کا مکمل طور پر احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے باب میں الغزو الفکری، تاریخ ووسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: ''فکری جنگ جدید تعبیر ہے اسے عسکری جنگ کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے، ان دونوں کے درمیان فرق صرف وسائل کا ہے، مقصد دونوں کا ایک ہے تسلط اور قبضہ۔ جنگ کا مقصد بھی دشمن پر قابو پانا ہی ہوتا ہے البتہ فکری جنگ میں انسان کے افکار واذہان پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی ہے''۔

تعلیم یافتہ مسلم نوجوان اس فکری جنگ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا ہے، اس کی بود وباش، رہن سہن اور تہذیب وثقافت پر مغربی تہذیب کے اثرات واضح طور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے غیر معمولی اثرات کا کسی قدر اندازہ مشہور امریکی مؤرخ فرانسس فوکومویا (Francis Fukuyama) (پ۱۹۵۲) کے اس تجزیہ سے کیا جاسکتا ہے، ''اسلامی تہذیب کے یقیناً اپنے امتیازات ہیں اور ان کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی ہے، لیکن یہ ناکام اور کمزور کوشش ہے۔ کیوں کی مغربی تہذیب کی بہ نسبت اسلامی تہذیب غیر مسلموں حتی کہ مسلمانوں کی اکثریت تک کے لئے قابل قبول یا باعث کشش ہرگز نہیں۔ چند غیر مسلم ہر سال اسلام بلاشبہ قبول کرتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ہر سال لاکھوں مسلمان نوجوان مغربی تہذیب اور طرز فکر کو برضا ورغبت اختیار کرتے ہیں۔ مسلم معاشرہ بھی نقالی مغرب پر کمربستہ ہے لہٰذا اسلام یا اسلامی تہذیب سے مغرب کو کوئی خطرہ نہیں''۔ مذکورہ اقتباس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ آج مغربی تہذیب اگر کسی کو اپنے لئے خطرہ سمجھتی ہے تو وہ صرف اور صرف اسلامی تہذیب ہے۔ اس لئے کا مغرب کا اصل تصادم اسلام سے ہے، اس کے علاوہ دنیا کے کسی مذہب اور کسی تہذیب میں یہ تاب وتوانائی نہیں ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا مقابلہ کرسکے۔

مولانا نے نشأۃ سے قبل یورپ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے، دین اور اخلاقی قدروں سے بغاوت پر روشنی ڈالی ہے۔ سائنس اور کلیسا کے درمیان جاری چپقلش کو واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں، ''دسویں صدی عیسوی تک پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، گھنے جنگلات میں آباد تھا، زراعت میں انتہائی پس ماندہ۔ دسویں صدی عیسوی یورپ کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ اس میں ارباب علم اور پادریوں کے درمیان زبردست مخاصمت آرائی ہوئی اور کلیسا کے علم دشمن رویہ کی وجہ سے بہت سے سائنس دانوں کو سخت ترین عذاب سے دوچار ہونا پڑا اور کفر کے الزام میں ان میں سے کئی ایک کو پھانسی دے دی گئی''۔ اس کے بعد مصنف نے نشأۃ کے بعد یورپ کی صورتحال کا جائزہ لیا ہے اور عالم اسلام سے غزو فکری کے آغاز پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے باب میں معاصر مغربی تہذیب اور اس کے بنیادی عناصر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس ضمن میں یونانی ورومانی رجحانات وفلسفات اور تحریف شدہ یہودی ونصرانی افکار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح اسلامی تہذیب کے خالص دنیوی ومادی پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا ہے، جسے یورپ نے اندلس، مصر اور ترکی میں مسلمانوں کے دور عروج کے دوران حاصل کیا تھا۔ اور میکاوَلی، فرانس بیکن، رینی، ڈیکارت، اسحاق نیوٹن، داروِن، فرائڈ، سارتر، کارل مارکس، اور ان جیسے متعدد فلاسفہ کا بھی اختصار کے ساتھ تعارف پیش کیا ہے جن کا موجودہ مغربی تہذیب کی تشکیل اور اس کے رجحانات کی تعیین میں اہم کردار ہے۔

تیسرے باب میں عالم اسلام سے یورپ کی جنگ پر روشنی ڈالی ہے۔ تغریب، استعمار، تبشیر واستشراق وغیرہ جیسے متعدد وسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں استشراق، اس کی انواع اور اہم مستشرقین کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مستشرقین نے عموما مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور عالم اسلام کی زمام قیادت اور اقتدار کی حامل شخصیات کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ عقیدہ، دین کے بنیادی مصادر، سیرۃ النبی، ازواج مطہرات، حیاۃ الصحابہ، تاریخ اسلامی اور علوم اسلامیہ کے باب میں

استشراق کے انتہائی سنگین اور دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

فاضل مصنف نے استشراق کے اہم ترین مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ان میں سے چند اس طرح ہیں:

۱-رسالت نبوی ﷺ کے باب میں شک پیدا کرنا اور اس خیال کو عام کرنا کہ حدیث ابتدائی تین صدیوں میں مسلمانوں کا تیار کردہ کام ہے

۲-قرآن کریم کی حجیت میں شک پیدا کرنا اور اسے ہدف تنقید بنانا

۳-فقہ اسلامی کی قدر و قیمت کو کم کرنا

۴-اسلام کو یہودیت و نصرانیت سے ماخوذ قرار دینا

۵-عربی زبان کو ہدف تنقید بنانا اور اسے زمانہ کی رفتار کا ساتھ دینے سے عاجز قرار دینا

۶-حدیث کے ساتھ کھلواڑ کرنا اور اپنی آراء کے استحکام کے لئے ضعیف احادیث کا سہارا لینا

۷-مسلمانوں سے اخوت کی روح کو کمزور کرنا اور ان کی تاریخ کو جھٹلانا

۸-اسلام کی تصویر مسخ کرنا اور مسیحی اقوام سے اس کے محاسن کو مخفی رکھنا

۹-مصادر اسلامی اور تعلیمات اسلامی میں شکوک وشبہات کو فروغ دینا۔

۱۰-ادب، سیاست، اور تصوف کے باب میں اسلام اور شریعت کی تعلیمات سے انحراف کرنے والی شخصیات کو نمایاں کرنا

اس باب کی ترتیب وتدوین میں فاضل مصنف نے جن مصادر سے استفادہ کیا ہے ان میں اس موضوع سے متعلق تمام اہم مصادر ومراجع شامل ہیں۔مصادر پر ایک نظر ڈالنے سے مولانا کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔مولانا چونکہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے اس لئے آپ نے انگریزی کتب سے بھی براہ راست استفادہ کیا ہے۔اس ضمن میں مولانا نے ان انصاف پسند مصنفین کی بھی تحسین کی ہے جنہوں نے خالص علمی انداز میں عظیم الشان علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔

چوتھے باب میں سیکولرزم، اشتراکیت اور نظریہ ارتقا وغیرہ متعدد افکار ونظریات کا ذکر کیا ہے جس کے عالم اسلام پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، اسی طرح قومیت، وطنیت، عصبیت اور جنسی ونسلی برتری کے ان چیلنجز کا بھی جائزہ لیا ہے جس کا فکر اسلامی کو سامنا ہے۔آپ نے تفصیل سے ان سر برآوردہ شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان میں کارفرما باطل مقاصد اور دسیسہ کاریوں بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اس سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو،''اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ جن حالات سے گزرا ہے اس کے نتیجے میں قومیت ووطنیت کا تصور وجود میں آیا اور عالم اسلام پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔وطنیت کا آغاز فرانس سے ہوا جس نے انیسویں صدی کے آخر میں اقتدار دین اور شاہی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اس میں فرد کی آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا اور طبقہ واساس کی بنیاد پر فرق کا ازالہ کیا گیا۔

پانچویں باب میں بالتفصیل عصر حاضر میں فکر اسلامی، اس کا آغاز، اسلامی نشأۃ ثانیہ، اس کی علامتیں اور مسلم مفکرین کے اختیار کردہ وسائل وذرائع پر روشنی ڈالی ہے۔جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام سے متعلق مغربی افکار ونظریات کے اثرات سے آزادی حاصل کی جائے اور اس کے راہ راست سے منحرف رجحانات اور اس کی روشن تعلیمات کو مسخ کرنے والے تصورات سے آگاہی حاصل ہو سکے۔عصر حاضر میں فکر اسلامی کو پہلے سے بڑھ کر نئے چیلنجز کا سامنا ہے۔

اس کتاب کا اصل امتیاز یہ ہے کہ اس میں زیر بحث موضوعات میں عدل وانصاف، توازن اور اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔مطالعہ مستشرقین کے باب میں فاضل مصنف نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے اور کتاب میں ان انصاف پسند مستشرقین کی پذیرائی کی ہے جنہوں نے اسلام اور علوم اسلام کا خالص علمی انداز میں تجزیہ کیا ہے اور عربی واسلامی ورثہ کی تدوین وترتیب میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔اسی طرح مغربی تہذیب کے تجزیہ میں بھی فاضل مصنف نے انصاف کا دامن نہیں چھوڑا ہے اور اس کے بہت سے مثبت پہلوؤں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

کتاب کے سلسلہ میں ڈاکٹر اکرم ندوی کا یہ تجزیہ مبنی برحقیقت ہے کہ کتاب اپنے مواد ومحتویات کے لحاظ سے فکر اسلامی کے مکتبہ میں ایک اہم علمی اضافہ ہے۔اس میں موضوع سے متعلق تمام مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔اور فکر اسلامی کے اہم ترین مسائل اور اسے درپیش چیلنجز کا انتہائی دقت وباریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔کتاب اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے، اس کے افکار ونتائج اور تجاویز کو غور وفکر کا موضوع بنایا جائے۔بالخصوص اس وقت تہذیبی اور ثقافتی سطح پر مسلم قوم جس زوال سے دوچار ہے اس میں ہر طالب علم کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

☆☆☆

مختصر تاریخ ثقافت اسلامی-ایک مطالعہ

محمد جرجیس کریمی
سینئر رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو عروج حاصل رہا ہے، جیسے بابلی، کلوانی، عبرانی، یونانی، ایرانی، رومی، مصری، ہندو، بدھ، اور مجوسی وغیرہ، یہ تمام تہذیبیں (ہندو اور بدھ تہذیب کو چھوڑ کر) وقت کے ساتھ دنیا سے تقریبا مٹ چکی ہیں، جب اسلام کا غلبہ ہوا تو اس نے بھی ایک تہذیب وثقافت برپا کی جس کے اثرات آج بھی موجود ہیں، اوران اثرات کو مٹانا آسان نہیں ہے، مسلمانوں کو تعمیر وترقی اور علم سے بڑا شغف تھا، انھوں نے جس ذوق وشوق سے کتب خانوں کی ترتیب وآرائش اور حسن انتظام کیا، علوم کے مراکز قائم کیے، طلبہ کی سرپرستی کی اور علماء، ادباء، شعراء، فلاسفہ، متکلمین اور فنکاروں، مصوروں، کاریگروں، پیشہ وروں، اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے ساتھ، جو حسن سلوک کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی ایک وقیع کتاب ''تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ'' ہے، جس میں انہی علوم وفنون میں مسلمانوں کے کارناموں کو انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، زیر نظر مقالہ میں اس کے مشتملات کا مختصر تعارف اور تبصرہ مقصود ہے۔

کتاب میں مقدمہ اور تقریظ کے علاوہ چھ فصلیں ہیں، ہر فصل میں اسلامی ثقافت کے ایک پہلو کو نمایاں کہا گیا ہے، پہلی فصل میں ثقافت کی تعریف، دین وتہذیب کے درمیان فرق اور اسلامی ثقافت کی خصوصیات زیر بحث لائی گئی ہیں، دوسری فصل میں اسلامی ممالک کے حدود اربعہ اور اسلامی ثقافتی مراکز کی نشاندہی کی گئی ہے، تیسری فصل میں ہندوستان میں اسلامی حکومت اور یہاں کے اصحاب فضل وکمال کا تذکرہ ہے، چوتھی فصل میں علمی تحریک کے تحت اسلامی ثقافت کے برگ وبار اور مختلف علوم وفنون کی توسیع کا ذکر ہے، پانچویں فصل میں اسلامی فن تعمیر کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور مسلمانوں کے ذریعہ نئے شہروں کی آبادکاری اور ان کی خصوصیات مذکور ہیں، چھٹی فصل میں مساجد مدارس، تعلیمی مراکز، اور شفاف کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب اسلامی ثقافت کی تاریخ کو جامعیت کے ساتھ بہت ہی عمدگی سے پیش کرتی ہے۔ ذیل میں اسی اجمال کی کسی قدر تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ثقافت کی لغوی اور اصطلاحی تشریح کرتے ہوئے مختلف علمائے لغت کا حوالہ دیتے ہیں، اور اس کا مالہ وما علیہ کی وضاحت کرتے ہیں، اس کے خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ ماہرین اور اہل نظر کے نزدیک ثقافت وہ موروثی علم ہے جس کے مطابق نسلیں اپنی زندگی گذارتی ہیں، اس میں زبان لہجہ، طریقہ تعمیر، کھانے پینے کے عادات واطوار، کھانے پینے کے سامان فراہم کرنے کا طریقہ، لباس تیار کرنے کا طریقہ، قومی حکایتیں، روایتیں، امثال، دنیا کے متعلق ان کے تصورات وخیالات، زندگی کے متعلق ان کے نظریات اور آراء کاری گری، معیشت کے طریقے وغیرہ سب شامل ہیں، انھیں چیزوں کی بنیاد پر ایک قوم دوسری قوم سے ممتاز وجدا نظر آتی ہے، لہذا تہذیب وثقافت کا رشتہ وتعلق قوموں کی تاریخ، وطن، دینی عقائد، مسلک ومشرب، ذہنی و فکری مزاج وطبیعت سے وابستہ ہوتا ہے۔ (ص ۳۰)

مولانا محترم دین وثقافت کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی ثقافت میں دیگر ثقافتوں کے اثرات کا حوالہ دیا ہے، اوران سب چیزوں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلامی ثقافت عربی ماحول میں پروان چڑھی، اس لئے جاہلی عناصر کو علیحدہ کردینے کے بعد صالح عربی خصوصیات اس میں غالب رہیں، اور یہ خصوصیات جس میں عرب دوسروں سے ممتاز تھے، اسلامی ثقافت میں سرفہرست رہیں، ان میں حق، عدل، شرافت ومروت، شجاعت ومساوات قابل ذکر ہیں، اور یہ تمام عربوں کے مابین مشترک

اقدار تھیں، وہ ان پر فخر کرتے تھے اور انھوں نے اپنے ادبی سرمایہ یعنی شعر، امثال وحکم اور وصایا میں اس کا خوب خوب ذکر کیا ہے۔ اسلام نے ان خصوصیات کو نہ صرف بڑھاوا دیا بلکہ اس کی ضروری اصلاح بھی کی، اور عربوں کی زندگی سے جاہلی عادات وتعصّبات اور اخلاقی انحراف کو دور کیا جو زمانہ جاہلیت میں ان کے یہاں خوب پایا جاتا تھا، عربی اور موروثی اقدار وروایات کو اسلامی اقدار وروایات میں ضم کر دیا، اور اس طرح یہ خصوصیات مقامی فضا کی تنگیوں سے نکل کر ایک وسیع دنیا کا حصہ بن چکی تھیں، چنانچہ داعیان اسلامی جہاں بھی گئے، اپنی زبان ساتھ لے گئے، پھر جن لوگوں نے اسلام قبول کیا انھوں نے اپنی مقامی زبانوں کی حفاظت کے ساتھ عربی زبان کو بھی سینے سے لگا کر حفاظت کی، اس طرح صالح اقدار اور سلوک ومعاملات کے بہترین طریقے اور حق وعدل کے میدان میں جدت طرازیاں منتقل ہوئیں، اسی کے ساتھ عربی اسلامی ثقافت نے اپنے گرد وپیش کی ثقافتوں سے حق وعدل سے میل کھانے والی اقدار کو بھی اپنے دامن وسعت میں جگہ دی اور ان ثقافتوں کے نقائص وسلبیات سے بڑی چابک دستی سے اور بڑی خوبصورتی سے اپنے دامن بے داغ کو بچالیا۔

قرآن کریم سنت نبویؐ اور ان صحابہ کرام کی زندگیاں جنہوں نے آغوش نبوت میں تربیت پائی اسلامی ثقافت کے اصل قالب ومصدر ہیں، پھر انھیں دونوں مصادر کی روشنی میں دیگر علوم ومعارف وجود میں آئے، شاعری، بنیادی فنون، اور تعمیری کاموں وغیرہ میں ندرت وجدت پیدا ہوئی، ایسی حکومتیں وجود میں آئیں جنہوں نے اولین مصادر پر نظر رکھتے ہوئے، نیز عہد اول کی خصوصیات کو لازم پکڑنے کے ساتھ دیگر مصادر سے بھی بھرپور استفادہ کیا'' (ص۴۲)۔

اس کے بعد مولانا نے اسلامی ثقافت کی کئی خصوصیات کا ذکر کیا ہے، وہ چھ خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں میں رنگ ونسل اور زبان ووطن کے تنوع اور اختلاف کے باوجود اخوت اسلامی کی سبب یہ ممتاز ہے،

۲۔ اسلامی ثقافت جسمانی وروحانی دونوں غذا فراہم کرتی ہے، اور دنیا اور آخرت کے خیر کو جمع کرتی ہے،

۳۔ اسلامی ثقافت فرد اور جماعت دونوں کے کے حقوق کی رعایت کرتی ہیں۔

۴۔ اسلامی ثقافت تعصب سے پاک ہے، وہ تمام ادیان کا احترام اور سب کے حقوق کی کفالت کرتی ہے،

۵۔ اسلامی ثقافت پوری انسانیت کے اتحاد اور وحدت کی قائل ہے۔

۶۔ اسلامی ثقافت علم ومعرفت میں توسع پیدا کرنے کی داعی ہے۔

اس میں مولانا محترم نے اسلامی مملکت اور ثقافتی مراکز کے قیام کے ضمن میں لکھا ہے کہ ''پچاس سال سے کم کی مدت میں عرب مسلمان جزیرۃ العرب سے باہر نکلے، مشرق ومغرب میں دور دراز علاقوں کو فتح کیا۔

نتیجہ میں مسلمانوں کا دیگر اقوام سے اختلاط وملاپ ہوا، جلدی ہی فارس وروم کی بڑی بڑی سلطنتیں بھی سرنگوں ہوگئیں، اور عراق وشام ومصر اسلامی مملکت کا حصہ بن گئے، پھر مسلمانوں نے اندلس پر فتح کا پرچم لہرایا، اور ہندوستان کے بعض علاقوں کو فتح کیا، اب مسلمانوں نے جدید شہروں کی تعمیر کا احساس کیا، ان اسلامی شہروں میں سے جن کی اولین دور میں تعمیر کی گئی اور بعد میں علم وثقافت کے مرکز قرار پائے، عراق میں بصرہ وکوفہ، مصر میں فسطاط قابل ذکر ہیں، ان کی تعمیر عہد خلافت راشدہ میں ہوئی اور مکمل زندگی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ان شہروں کی تشکیل ہوئی، یعنی تعلیم وتربیت اور تجارت نیز رفاعی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر یہ شہر بسائے گئے۔

مولانا محترم نے مختلف عہد کی حکومتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان میں ثقافتی مراکز اور شخصیات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اسی طرح ان ادوار میں مختلف شہر بسائے گئے یا جو مختلف فتوحات ہوئیں، علوم وفنون میں جو ترقیاں ہوئیں، شعر وادب میں جن شعراء ادباء نے نمایاں شہرت حاصل کی، ان سب کا حوالہ تفصیل کے ساتھ دیا ہے، اس کے بعد مولانا محترم نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام اور استحکام کے ضمن میں لکھا ہے:

''عالم اسلام کے نقشے میں ہندوستان پہلی صدی ہجری میں داخل ہوا، جبکہ محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا، جس کو ولید بن عبدالملک کے دور میں حجاج بن یوسف نے ہندوستان بھیجے جانے والی لشکر کی کمان سونپی تھی، مغربی ہندوستان کے شمالی خطے میں افغانی قبائل متعدد بار اور مختلف مراحل میں ہندوستان میں داخل ہوئے، اور پھر اپنے وطن واپس ہوگئے، اس دوران حکومت مختلف ہاتھوں میں رہی، جن کا تعلق کبھی غزنویوں سے رہا تو کبھی غوریوں سے رہا، ان کے علاوہ دیگر حاکم خاندان اور موالیوں نے بھی حکومت کی تا آنکہ مغل بادشاہ ہمایوں بن بابر ۹۳۳ھ، میں ہندستان کا حاکم ہوا، اس نے وہ مغل حکومت قائم کی جو تیرہ صدی ہجری تک پورے آب وتاب سے چلتی رہی، اور اس کا خاتمہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط سے ہوا (جبکہ ۱۲۷۳ھ میں

آخری مغل فرمانرواں بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔

مسلمانوں نے اس طویل دور میں ہندوستان کو مختلف پہلوؤں سے ترقی دلائی اور اس دوران بے شمار اصحاب فضل وکمال پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف علوم وفنون اپنے جوہر دکھائے اور ملک کو ان سے مالا مال کیا، مولانا محترم نے ایسے اصحاب فضل وکمال کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ اوران کے بارے میں تفصیل فراہم کی ہے، جن کی تعداد تقریباً ۲۶۲ ہے، ظاہر ہے کہ ان سب کے بارے میں تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے ملک کو تہذیب وثقافت کے پہلو سے دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، بلکہ بعض مواقع پر عالم عرب میں ایسے جید علماء پیدا نہیں ہوئے جیسے ہندوستان میں پیدا ہوئے، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغۃ، اوران کے خانوادہ کے دوسرے اصحاب علم وفضل اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی صاحب ابجد العلوم اور ایسے ہی دسیوں موقر شخصیات موجود ہیں، جن کی علمی خدمات پر عالم اسلام بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

مولانا محترم نے اسلامی ثقافت کی تاریخ کے ضمن میں مسلمانوں کی علمی تحریک اور علمی مراکز کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، مولانا محترم لکھتے ہیں: ''علم کی ترویج میں مسلم ممالک کا کردار بھی تاریخی وقائدانہ رہا ہے، اس سلسلہ میں عالم اسلام میں قیروان فسطاط دمشق سمرقند، بخارا، بلخ، ہرات، اصفہان، رے، مرو، نیشاپور، شیراز، طبرستان، قسط، وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر اور لائق فخر ہیں، کہ یہ علم وفضل کے مرکز کے طور پر جانے گئے، یہاں مختلف علوم کی ترویج بزبان عربی ہوتی تھی، چودھویں صدی عیسوی میں اہل یورپ جب مسلمان علماء سے شرف تلمذ حاصل کر رہے تھے، اس وقت پورا عالم اسلام مختلف علوم وفنون کی روشنی سے منور تھا''۔

مولانا محترم نے علوم وفنون کی مختلف شاخوں میں مسلمانوں کی ترقیوں کا حوالہ بڑی تفصیل سے دیا ہے، جیسے تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، ادبی علوم، علم لغت، علم البیان، نحو، تاریخ، جغرافیہ، نقاشی، وتصویر نگاری، فلسفہ وعلم کلام، علم تصوف علم طب، وغیرہ، ان تمام علوم میں علماء اسلام نے قائدانہ کردار ادا کیا، اور بے شمار جید علماء وفضلاء نے ان کی مختلف پہلوؤں سے خدمات انجام دی ہیں۔

اسلامی ثقافت کا ایک امتیازی شان فن تعمیر بھی ہے، اسلام نے فن تعمیر پر ویسے ہی نقوش مرتب کئے جیسے اس نے دوسرے علوم وفنون میں اپنا جوہر دکھایا، اسلام سے قبل فن تعمیر جنسیت کو فروغ دینے انسانوں میں حیوانی مزاج پیدا کرنے کا کام کرتا تھا، یہ رجحان عمارتوں، پارکوں، اور کھیل کے میدانوں میں خوب نظر آتا تھا، جبکہ فن تعمیر کے دوسرے پہلو جو زیادہ نمایاں تھے، ان میں تصویر نگاری، مجسمہ سازی، موسیقی اور غنائیت کا اہتمام کیا جاتا تھا، اسلام کی بعثت کے بعد مسلم معماروں نے اپنے آپ کو انسانوں حیوانوں اور بت پرستی کی آثار ونقوش کی تصویر گری سے الگ کر لیا، اور ایسی تصاویر سے بھی گریز کیا جن سے شہوانی جذبات بھڑکیں، چنانچہ مسلم فن کاروں نے ایسے دل پذیر اور دلکش فن تعمیر کو ایجاد کیا جس میں درختوں، پھولوں، ٹہنیوں، بیلوں کی تزئین کاری، اور محرابوں، گنبدوں اور نکھرتی چھتوں کا بے مثال حسن پیدا ہوتا، مسلم فنکاروں کی شخصیت اس وقت اور نکھر کر سامنے آئی، جب انھوں نے مختلف رنگوں کی آمیزش سے ایک جدت بھرا ایسا نظام مرتب کیا، جو نہ صرف خوش منظر ودلکش ہو، بلکہ اس میں آنکھوں کی تسکین کا سامان بھی ہو، مولانا محترم نے اسلام کے دور عروج کے دوران مختلف شہروں کی آبادکاری کا حوالہ دیا ہے، بصرہ، کوفہ، فسطاط، واست، دمشق، بغداد، سامرا، قاہرہ فاس، قرطبہ، زہرہ، غرناطہ، اشبیلہ، قیروان، مراکش، رباط، وغیرہ، جیسے شہروں کی تفصیل بیان کی ہے، جو اسلامی ثقافت کی نمایاں یادگاریں ہیں۔

مولانا محترم نے فن تعمیر ہی کے ضمن میں عظیم الشان مساجد کی تعمیر کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں خاص طور سے ''قبۃ الصخراء'' جامع زیتونہ، جامع قرطبہ، جامع ابن طولون، جامع ازہر، جامع اموی، جامع قزین، جامع قیروان، جامع الکبتیہ، جامع الصالح، جامع الاقمر، وغیرہ جیسی عظیم الشان مساجد عالم اسلام کی شان وشوکت کو بڑھاتی ہیں۔

اس طرح مولانا محترم نے مختلف تعلیمی مراکز ومدارس کا بھی حوالہ دیا ہے، عہد اسلامی کے کتب خانوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور اخیر میں عہد اسلامی کے شفاخانوں کی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں، اس طرح یہ کتاب بہت ہی جامعیت کے ساتھ ثقافت اسلامی کی تاریخ کو واضح کرتی ہے، اور خاص طور سے عربی مدارس کے طلبہ کے لئے یہ کتاب ایک مرجع وماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، مولانا محترم نے کتاب میں تاریخ کی امہات کتب کو پیش نظر رکھا ہے، اوران کے حوالے دیے ہیں۔

یہ مقالہ کتاب کے اردو ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے، جس کے مترجم ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب ہیں، ترجمہ سلیس ورواں ہے، فاضل مترجم نے ترجمہ کے ساتھ مفید تعلیقات وحواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی تصنیف
الدعوۃ الاسلامیۃ و مناھجھا فی الھند-ایک مطالعہ

محمد انس صدیقی
ریسرچ فیلو، شعبۂ دینیات (سنی)، اے۔ایم۔یو علی گڑھ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔آپ عربی زبان کے ایک صاحب طرز ادیب اور عظیم اسلامی مفکر تھے، ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام اور مغرب پر گہری نظر رکھتے تھے، مغرب کی دسیسہ کاریوں اور مغربی نظام تعلیم کی خرابیوں اور تباہ کاریوں کے خلاف آخری عمر تک قلمی جہاد کرتے رہے۔مولانا کا اصل میدان عربی زبان وصحافت تھا، اس لئے زیادہ تر عربی زبان میں ہی آپ کے قلم کے جوہر سامنے آئے اور آپ نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ عربی واسلامی سرمایہ میں گرانقدر اضافے کئے۔ہندوستان سے زیادہ عرب دنیا میں آپ کی تحریریں ونگارشات بڑے ہی شوق واحترام کے ساتھ پڑھی جاتیں۔مرحوم نے دو درجن سے زائد عربی واردو تصنیفات اپنے پیچھے چھوڑیں، مقالات ومضامین کی تعداد تو سینکڑوں میں ہے۔

اس مقالہ میں سید واضح رشید حسنی ندوی کی کتاب "الدعوۃ الاسلامیۃ و مناھجھا فی الھند" کے مطالعہ وتجزیہ کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب چھوٹی تقطیع میں ۱۲۰/صفحات پر مشتمل ہے۔میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ دارالرشید لکھنؤ سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا ہے۔یہ کتاب دراصل ایک مقالہ تھا جو ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ۸۵/سالہ جشن تاسیس کے موقع پر ایک تعلیمی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔جس میں مصنف نے ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لیکر عصر حاضر تک دعوت وتبلیغ، تزکیۂ نفس اور عوام وخواص کی دینی تربیت کرنے میں علماء ہند کی کوششوں وقربانیوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے اور امراء وسلاطین کو وعظ ونصیحت اور ان کی اصلاح کرنے کا جو علماء ہند کا طریقہ ومنہج رہا ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

دعوت وارشاد اور اسلامی تشخص کی صیانت وحفاظت اور تربیت نفوس کے سلسلہ میں علماء کے مناہج اور طریقۂ کار کیا رہے اور بدلتے ہوئے سیاسی ومعاشرتی حالات کے مطابق کیا حکمت عملیاں ومناسب طریقۂ کار علماء ربانین نے اختیار کئے اور مسلم اقلیت کو ہندو بت پرست اکثریت کے رنگ میں رنگنے سے بچانے میں ان علماء کا کیا کردار رہا ہے۔اس کا مختصر جائزہ اس کتاب میں لیا گیا ہے۔

مصنف نے علماء ہند کے دعوتی مناھج کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

۱- اسلامی حکومت یا مسلم دور حکومت
۲- انگریزی اقتدار کا زمانہ
۳- آزادی کے بعد کا دور انیہ

یہ مقالہ بعد میں البعث الاسلامی میں شائع ہوا، جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور قبول عام حاصل ہوا۔بعد میں اس مقالہ کو دار عرفات سے ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں مولانا رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے تعارفی کلمات کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

کتاب کے دوسرے ایڈیشن جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا (جس کی طباعت واشاعت میں مکتبہ ابوالحسن دہلی نے خصوصی تعاون کیا) میں علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے طریقۂ اصلاح ومنہج دعوت کا اضافہ کیا گیا۔کیونکہ علامہ ندویؒ تین بڑے دعوتی مناہج کی نمائندگی کرتے تھے، وہ تھے: شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور سید احمد شہیدؒ۔علامہ ندویؒ کی شخصیت مسلم وغیر مسلم، طبقۂ حکمراں وعوام الناس تقریباً سبھی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول تھی اور آپ کا منہج

دعوت وسطیت اوراعتدال کا تھا۔لہٰذا مصنف نے ضروری سمجھا کہ مولانا ندوی کے منہج دعوت کا بھی جائزہ پیش کیا جائے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''رجال الفکروالدعوۃ فی الاسلام'' کے کئی حصوں میں دعوت وفکر کے اس تاریخی تسلسل کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس میں علماء ودعاۃ نے دعوت دین واصلاح مسلمین کا فریضہ مختلف ادوار میں انجام دیا ہے۔اور کچھ جلدوں میں ان تینوں متذکرہ بالا شخصیات کی دینی ودعوتی خدمات پر علیحدہ طور پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

لیکن عام قاری کیلئے ان ضخیم کتابوں کے بالاستیعاب مطالعہ کیلئے وقت نکالنا کار دشوار ہے۔چنانچہ مصنف نے ان تینوں شخصیات کا ایک جامع ومختصر جائزہ اپنی کتاب میں پیش کرنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ مختصر طور پر یہ دکھا سکیں کہ ان حضرات کا دعوت دین واصلاح مسلمین کیلئے منہج وطریقۂ کار کیا رہا اور ملت اسلامیہ ہندیہ پر ان کی دعوت واصلاح کے کیا اثرات مرتب ہوئے اور عقیدۂ اسلامی اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی حفاظت کا فریضہ کس طور پر اور کن نازک حالات میں انجام دیا گیا۔[۱]

اس کتاب کی تیاری میں مصنف نے قابل اعتبار تاریخی مآخذ سے استفادہ کیا ہے جن میں سرفہرست علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصانیف (خاص طور سے رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام، المسلمون فی الھند وغیرہ) اور سید عبدالحئی حسنی کی مشہور زمانہ تصنیف ''نزھۃ الخواطر'' ہیں۔اس کے علاوہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے دوسرے مآخذ ومصادر کو بنیاد بنایا ہے۔[۲]

مصنف نے اس کتاب میں چار فصلیں قائم کی ہیں اور ابتدا میں تمہیدی گفتگو کی ہے جو تقریباً ۱۰ر صفحات پر مشتمل ہے،جس میں مصنف نے مختصر طور پر ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لے کر آزادی کے بعد تک علماء کے دعوتی وتربیتی اور اصلاحی کردار کا نقشہ کھینچا ہے،اور تاریخی تسلسل کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ علماء ودعاۃ نے کس طرح اسلام کی نشر واشاعت اور اصلاح بین المسلمین کا فریضہ انجام دیا اور طبقۂ حکمراں کی کس نہج پر اصلاح وارشاد کا کام کیا۔اس حصہ میں شہاب الدین غوری کے پرتھوی راج چوہان کو شکست دینے کے بعد خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اجمیر میں قیام اور ان کے دعوتی واصلاحی اثرات کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔اور پھر دہلی کے سیاسی استحکام کے بعد خواجہ اجمیریؒ کے اپنے مرید قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دعوتی مقاصد کے تحت دہلی روانہ کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔آخری حصہ میں مختصر طور پر معاشرہ کے دو طبقات بیان کئے ہیں: ایک حکمراں طبقہ ہے جس کا کام نظام حکومت چلانا ہے،ان کی حکمرانی انسان کے جسموں پر ہوتی تھی۔دوسرا طبقہ،دعوت واصلاح کے قائدین یعنی طبقۂ علماء وصلحاء کا ہے جن کی حکمرانی دلوں پر ہوتی تھی،اور اس طبقہ نے انسانی مساوات وبھائی چارے کا درس دیا اور لوگوں کی تعلیم وتربیت،اصلاح وتزکیہ اور اسلامی خطوط پر ذہن سازی کا کام کیا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بھی انگریزی سامراج میں علماء نے دعوت واصلاح کے مشن کو جاری رکھا،پہلے آزادیٔ ہند کیلئے جدوجہد کی اور اپنی جانوں کی قربانیاں دیں اور آزادی وتقسیم ہند کے بعد نئی نسل کو اسلامی تعلیم وتربیت دینے کا کام کیا اور نسل نو کی ذہنی وفکری ارتداد نیز مغرب کے ملحدانہ نظریات سے حفاظت کیلئے کئی تحریکیں وتنظیمیں چلائیں۔[۳]

پہلی فصل عناصر تربیۃ العلماء وخصائصھم الذاتیۃ کے عنوان سے قائم کی ہے،جس میں علماء کی اصلاح وتربیت کے بنیادی عناصر اور ان کے ذاتی کمالات وخصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔

مصنف نے پانچ بنیادی خصوصیات ذکر کی ہیں:

(۱)تسخیر القلوب بالمحبۃ: سب سے پہلی خصوصیت لوگوں کے دلوں کو اپنے اخلاص ومحبت کے ذریعہ فتح کرنا،علماء ربانین اپنے اخلاق وعادات اور دنیا سے بے رغبتی اور مال ومتاع اور جاہ ومنصب سے بے نیازی کی بدولت عوام وخواص کے دلوں پر حکمرانی کرتے تھے،جس کی وجہ سے سلاطین وامراء ان سے خوف کھاتے تھے۔

سید آدم بنوریؒ گیارہویں صدی ہجری کے مشہور عالم دین وصوفی بزرگ تھے،شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے،ان کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ ان کے دستر خوان پر روزانہ ایک ہزار لوگ کھانا کھاتے تھے،اور ان کے ساتھ ہزاروں مریدوں اور علماء کا قافلہ چلتا،۱۰۵۳ھ میں لاہور تشریف لے گئے،۱۰ر ہزار سے زائد اشراف ومشائخ ساتھ تھے،مغل فرمانروا

شاہجہاں کوان سے خوف ہوا توانہیں حج پر جانے کا حکم دیا،سید آدم بنوریؒ، بادشاہ کے ارادہ کو بھانپ گئے،انہوں نے حرمین شریفین کا سفر باندھا اور کوئی تعرض نہیں کیا،عمر کے آخری ایام مدینہ منورہ میں قیام کیا اور وہیں وفات پائی۔[۴]

(۲)اتباع الشریعة والتزامها والتمسك بالسنة النبوية:

علماء کا دوسرا امتیازی وصف اتباع شریعت ،سنتوں کی پابندی اور بدعات سے اجتناب ہے۔اس کے تحت شیخ احمد سرہندیؒ کے کچھ خطوط ومراسلوں میں اتباع سنت اور اجتناب من البدعۃ کے حوالہ سے گفتگو کی ہے۔اس کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ،بدرالدین سمرقندیؒ،شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے اقوال وخطوط میں اتباع شریعت واستمساک بالسنۃ کے نمونوں کو بیان کیا گیا ہے۔نیز شیخ علم اللہ حسنی رائے بریلوی اور فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۱۲۰۸-۱۳۱۳ھ) کی سنتوں کی پیروی اور زھد ورع کا تذکرہ ہے۔[۵]

(۳)أسوة فی الحیاة الخاصة والعامة:

علماء اخلاق وکردار کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتے اوران کی زندگیاں ہرخاص وعام کیلئے نمونہ وآئیڈیل ہوتی تھیں۔

(۴)العلم والتفقه فی الدین:

علم میں پختگی اور تفقہ فی الدین ان علماء ربانیین کا خصوصی امتیاز ووصف ہوتا تھا۔

(۵)اهتمام الربانیین بتربیة الحکام وحثهم علی الدعوة والجهاد:

علماء اگرچہ صاحبان حکومت سے زیادہ میل ملاپ نہیں رکھتے تھے اوران سے اپنے ذاتی مفادات حاصل نہیں کرتے تھے،لیکن وہ برابر حکمراں طبقہ کی اصلاح کا کام کرتے رہتے اوران کی غیراسلامی وغیراخلاقی حرکتوں پر نکیر کرتے رہتے۔

مصنف نے فیروزشاہ تغلق کے دور میں نصیرالدین چراغ دہلوی کے دعوتی کردار کے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔اور آخر میں ''الحکام والسلاطین الذین نشأوا فی تربیة الربانیین'' کے تحت انصاف پسند ونیک دل حکمراں وسلاطین کا علماء سے تعلق واحترام اورانتظامی امور میں ان سے صلاح ومشورہ لینے کا تذکرہ کیا ہے۔اس فہرست میں شیرشاہ سوری (۹۵۲ھ)،شمس الدین التمش (۶۳۳ھ)،سلطان مظفر حلیم بن سلطان محمود گجراتی اوراورنگ زیب عالمگیر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔[۶]

فصل ثانی دعوت دین کے تین بنیادی مناہج: شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور سید احمد شہیدؒ کے تعارف وتجزیہ پر مشتمل ہے۔یہ حصہ سب سے طویل اور کتاب کا لب لباب ہے جو ص ۵۶ سے ص ۸۹ تک محیط ہے۔

اسلام ہندوستان میں محمد بن قاسم ثقفی کے حملہ کے ساتھ داخل ہوا۔[۷] لیکن اس کی ترویج واشاعت کا کام علماء ودعاۃ نے انجام دیا جن کی کوششوں سے ملک کے کونے کونے میں اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔تاریخ میں کئی مواقع ایسے آئے جب ایسا لگنے لگا کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا،اور اسلامی عقیدہ اپنی صحیح واصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ پائے گا،لیکن ایسے نازک حالات میں بھی ان علماء ودعاۃ نے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام کیا اور عقیدۂ توحید کو شرک وبدعت کے اثرات سے محفوظ رکھا۔

یوں تو ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ ودعوت دین کے فریضہ کو پورا کرنے والے علماء کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن تاریخی طور پر ان میں تین شخصیات کا کردار خاص طور سے بہت اہم ہے،جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں مشکل ترین حالات کے باوجود اسلام کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا،ان میں سب سے پہلے ''شیخ احمد سرہندی'' المعروف بہ مجدد الف ثانی متوفی ۱۰۳۴ھ ہیں،اس فہرست میں دوسرا نام امام احمد بن عبدالرحیم المعروف بہ شاہ ولی اللہ دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ کا ہے،تیسری شخصیت ''امام احمد بن عرفان شہید رائے بریلیؒ متوفی ۱۲۴۶ھ کی ہے۔ان تینوں مصلحین ومجددین نے اسلامی ہند کی تاریخ میں عقیدۂ توحید کی صیانت وحفاظت اور اسلامی تہذیب وثقافت کو زندہ کرنے کا کارنامہ انجام دیا،اور سب سے اہم اپنے اپنے زمانے کی حکومتوں کا قبلہ درست کیا،حکمراں طبقہ کی غیراسلامی حرکتوں پر سرزنش کی،عوام وخواص دونوں طبقوں کی اصلاح کی اور مسلمانوں کی نسلوں تک صحیح اسلامی فکر پہنچانے کا کام کیا۔

شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی نے جس دور میں آنکھیں

کھولیں وہ مغلیہ سلطنت کے عروج کا دور تھا، علماء سوء کے مناظروں اور روز روز کے اختلافات سے بدظن ہوکر مغل فرمانروا جلال الدین محمد اکبر نے ایک نیا دین ''دین الٰہی'' کے نام سے ایجاد کیا، یہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی آزمائش تھی، ایک وقت کو ایسا لگنے لگا کہ شرک والحاد کی یہ آندھی اسلامی عقیدہ کی بنیادوں کو کھوکھلا کردے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے نازک ترین حالات میں مجدد الف ثانی کی شخصیت کو ہندوستان کی سرزمین پر پیدا کیا، جنہوں نے بڑی ہی حکمت ودانائی کے ساتھ صحیح اسلامی فکر کی آبیاری کی اور حکومت ورعایا کی صحیح اسلامی نہج کی طرف رہنمائی کی اور فاسد عقیدہ ونظریات کی اصلاح کا کام کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''حضرت شیخ احمد سرھندی سے اسلام کی حفاظت وتقویت کا وہ تاریخ ساز اور عہد آفریں کام انجام پایا جس کو حدیث کی سادہ ومعروف اصطلاح میں تجدید کہا گیا..... یہ کام کیا تھا؟ روح وفکر اسلامی کی جلا وتازگی، وقت کے اہم ترین اور سنگین فتنوں کا سدّ باب اور استیصال، نبوت محمدی اور شریعت اسلامی کی صداقت وابدیت پر ازسرنو اعتقاد واعتماد بحال کرنا، ریاضت واشراقیت پر مبنی اس روحانی تجربہ اور تلاش حقیقت اور خدارسی کی کوشش کی طلسم شکنی جو محمد عربی ﷺ کی پیروی اور اتباع سے بے نیاز ہو، ہمہ اوست اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ اور نظریہ کی پردہ کشائی جو اپنے غلو ومبالغہ اور اشاعت ومقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہونچ چکا تھا، اور جس سے عقائد میں تزلزل اور مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا ہورہا تھا، اور اس کے متوازی وحدۃ الشہود کے مسلک ونظریہ کو مدلل ومرتب شکل میں پیدا کرنا، بدعات کی کھلی ہوئی تردید ومخالفت..... ہندوستان میں اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدموں کے جمانے، اکبری عہد کے مخالف اسلام اثرات کے ختم کرنے، اور ہندوستان میں ایک ایسا تجدیدی دینی انقلاب لانے کی حکیمانہ اور کامیاب کوشش جس کے نتیجہ میں ایک طرف اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر متمکن ہوتا ہے، دوسری طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خلفاء وتلامذہ کا وہ سلسلہ وجود میں آتا ہے جو روحانی اور باطنی طور پر اسی سلسلہ سے وابستہ اور منسوب ہے''۔[۸]

بارہویں صدی ہجری میں جب ہندستان کی مسلم حکومت انحطاط وزوال کا شکار تھی مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی، انگریز اپنے قدم جماتے ہوئے شمال کی طرف بڑھ رہے تھے اور دہلی پر قابض ہونا چاہتے تھے، مذہبی اختلاف وتفرقہ اور اخلاقی پستی وگراوٹ انتہا کو پہنچ گئی، نہ صرف مسلم حکومت کو خطرہ درپیش تھا بلکہ مسلمانوں کے عقیدہ وعمل اور سلوک واخلاق میں فساد پیدا ہورہا تھا، ایسے مایوس کن حالات میں سرزمین ہند پر ایک غیر معمولی، ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ذات میں پیدا ہوئی۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے ان حالات کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا ہے:

''ہندستان کی یہی کیفیت تھی جب اسلام کا وہ اخترِ تاباں نمودار ہوا جس کو دنیا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نام سے جانتی ہے، مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا، مسلمانوں میں رسوم وبدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ جابجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے..... عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکام وارشادات اور فقہ کے اسرار ومصالح سے بے خبر تھے''۔[۹]

ایسے حالات میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے انحطاط کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد قلمی جہاد کیا اور ہر طرح کی مخالفت کے بعد قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کرکے عام مسلمانوں کو قرآن کی تعلیمات سے قریب تر کیا، مدارس میں فلسفہ ومنطق کے بجائے حدیث کے درس وتدریس پر زور دیا، اپنے زمانے کے کرامت فروشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تقلید جامد کے علمبرداروں پر ضرب لگائی اور اجتہاد کے دروازے کو کھول کر فقہی جمود کو توڑا۔

علامہ شبلی نے شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزلی شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل ودماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا، کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس واپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی،

رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے''۔[۱۰]

سید احمد شہیدؒ جس دور سے تعلق رکھتے ہیں اس دور میں ہندوستان کے اکثر حصوں سے مسلم حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور استعماری طاقتوں کا قبضہ ہو چکا تھا، مسلمانوں کے عقیدہ میں دراڑیں پڑنا شروع ہو چکی تھیں، مسلمان جہاد جیسے اسلامی فریضہ کو یکسر بھلا چکے تھے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے سید احمد بن عرفان شہیدؒ کو کھڑا کیا، جنہوں نے کافر و جابر حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، مسلمانوں میں جہاد کا نعرہ بلند کیا، مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی تربیت اسلامی خطوط پر کرنے کے ساتھ دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیا، جس کے نتیجہ میں ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کفر و الحاد کے دلدل میں جانے سے بچ گیا۔

مولانا نے ابوالحسن علی ندویؒ، سید احمد شہید کی ایمان آفریں تحریک اور ان کی دعوت و تربیت کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت سید احمد شہیدؒ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ، اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے، اس کا اثر صرف ان کے میدان کارزار، ان کی معاصر نسل تک محدود نہ رہا، بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد آنے والے اہل حق، اصحاب دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے، بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ، ہندوستان اور اسکے پڑوسی مسلم ممالک کی حفاظت اور قیام حکومت اسلامیہ علی منہاج الخلافۃ الراشدہ کی جدوجہد کی ابتدا بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدّ و جہد کی زمام قیادت ہندوستان میں اول اول اسی جماعت کے علماء اور قائدین کے ہاتھ میں رہی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف، اور ترجمہ اور نشر و اشاعت کی جدید تحریک انھیں کی کوششوں کی رہین منت ہے، مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری بالواسطہ اور بلا واسطہ اسی دعوت و تحریک کا نتیجہ و ثمرہ ہے، اس تحریک کے اثرات، علم و ادب، فکر اسلامی، اور زبان و اسالیب بیان پر بھی پڑے، اس نے اصلاح معاشرہ، جاہلی رسوم کے ابطال، ہندوانہ اثرات کے ازالہ اور صحیح اسلامی زندگی کی طرف بازگشت کا زبردست کام انجام دیا''۔[۱۱]

تیسری فصل میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قیام کے دوران پھیلے فکری و دینی ارتداد کے تدارک کیلئے علماء کی کوششوں و تحریکوں سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ جس میں مصنف نے بڑے ہی اختصار و جامعیت کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے قیام کے پیچھے کارفرما مقاصد اور ہندوستان میں آباد مسلمانوں پر پڑنے والے اس کے دوررس اثرات، نیز دین کی حفاظت اور عقیدۂ اسلامی و ملی تشخص کی حفاظت میں ان دونوں اداروں کے لازوال کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر قدیم صالح و جدید نافع کے علمبردار ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مقصد قیام و نصب العین کا ہلکا سا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے معاً بعد ہندوستان کی تحریک آزادی میں علماء کے نمایاں کردار کو نمایاں کیا ہے، جس کے سرخیل شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی، عطاء اللہ بخاری، ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا داؤد غزنوی وغیرہ ہیں، جن کا ذکر کیے بغیر تحریک آزادی کی تاریخ ادھوری رہے گی۔

آخر میں مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی اصلاحی تحریک تبلیغی جماعت کے دینی و اصلاحی اثرات کا چند لائنوں میں احاطہ کیا ہے۔[۱۲]

چوتھی اور آخری فصل میں آزادی و تقسیم ملک کے بعد علماء کے ذریعہ چلائی گئیں دینی و دعوتی تحریکوں اور اصلاحی کوششوں سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے مولانا مودودیؒ کے ذریعہ قائم کی گئی ''جماعت اسلامی'' اور ان کے ذریعہ تیار کردہ وسیع اسلامی لٹریچر (جس نے جدید ذہنوں سے اسلام کے متعلق شکوک و شبہات کو رفع کرنے میں اہم کردار ادا کیا) کو آزادئ ہند کے بعد ہندو پاک کے مسلمانوں میں اسلامی بیداری لانے اور دینی رجحان پیدا کرنے میں اہم کردار کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

مذہب اسلام کی تبلیغ و دعوت کیلئے مختلف زبانوں میں جو وسیع اور معیاری لٹریچر تیار کیا گیا ہے، ان علمی مراکز و اشاعتی اداروں کا نئی نسل میں اسلام کے تعلق سے پیدا شدہ شکوک و شبہات کو دور کرنے اور مسلمانوں کا اپنے مذہب پر اعتمادی بحال کرنے میں جو غیر معمولی

کردار رہا ہے اس کا اعتراف بھی مصنف نے کیا ہے۔جن میں نمایاں طور پر مولانا شبلی نعمانی کے ذریعہ قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے،جس کے دائرہ کو بعد میں ان کے لائق وفائق شاگرد سید سلیمان ندویؒ جیسے یگانۂ روزگار نے مزید وسعت دی،مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا دہلی میں قائم کردہ ''مجمع ندوۃ المصنفین'' بھی اسی فہرست میں شامل ہے،اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ذریعہ قائم کیا گیا''المجمع الاسلامی العلمی (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)اس حیثیت سے نمایاں طور پر ذکر کئے جانے کے قابل ہے۔۱۳؎

فصل کے آخر میں مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے منہج دعوت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔علامہ ندویؒ نے دعوت واصلاح اور ارشاد وتربیت کا نیا طریقہ ومنہج اختیار کیا اور ''پیام انسانیت'' تحریک کے ذریعہ مسلم وغیر مسلم عوام کو جوڑنے کا کام کیا۔۱۹۷۴ء میں ''پیام انسانیت'' تحریک کی بنیاد رکھی اور مذہب ومسلک سے اوپر اٹھ کر ہر ہندوستانی تک مانوتا (انسانیت) کا پیغام پہنچایا۔ ۱۹۸۲ء میں پورے ملک کے دورے کئے جس میں ملک کے دانشور طبقہ واصحاب اقتدار سے ملاقاتیں کیں اور تشدد،ظلم وقتل ،فرقہ وارانہ فسادات اور دوسری سماجی واخلاقی برائیوں کے خلاف انہیں متحد کیا۔

دینی تعلیمی کونسل کے ذریعہ برابر اصلاح وتربیت کے کام کو جاری رکھا،سلاطین وحکام سے اپنے تعلقات استوار کئے اور ان تک اسلام کی دعوت وتبلیغ حق کا فریضہ پہنچایا،اسلام کے پیغام کو عام کرنے اور غلط فہمیوں کے ازالہ کیلئے ڈائلاگ کئے نیز اپنی تحقیقات وتصنیفات کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور علمی سرمایہ میں اضافہ کیا۔۱۴؎

یہ مختصر سی کتاب تاریخی طور پر علماء ہند اور ان کے مناہج دعوت وتبلیغ کا ایک جامع تعارف پیش کرتی ہے،جس سے ایک طرف مسلم دور حکومت سے لے کر آزادی کے بعد تک علماء ہند کے ذریعہ چلائی گئیں دعوتی واصلاحی تحریکوں کا ایک خاکہ معلوم ہو جاتا ہے تو دوسری طرف دعوت وتبلیغ کے مناہج واسالیب کا تاریخی نمونہ سامنے آجاتا ہے جس سے روشنی پا کر ہم موجودہ دور میں مسلم وغیر مسلم عوام وصاحبان حکومت واقتدار تک اسلام کی دعوت پہنچا سکتے ہیں۔

اس مختصر سی کتاب کی اہمیت وافادیت دوچند ہو جاتی ہے جب موجودہ حالات میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے،اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالمی پیمانہ پر اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ کو پلاننگ کے تحت بگاڑا جا رہا ہے اور انٹرنیٹ والیکٹرانک وسوشل میڈیا کے اس دور میں اسلاموفوبیا کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ایسے نازک حالات میں علماء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ تبلیغ دین ودعوت اسلام کا اہم فریضہ انجام دیں۔

حواشی:

۱۔ الدعوۃ الاسلامیۃ ومناھجھا فی الھند،الأستاذ محمد واضح رشید الحسنی الندوی،تقدیم محمد رابع حسنی ندوی،ص۱۵-۱۶، دارالرشید،لکنائو الھند الطبعة الثالثه،۲۰۰۹ء
۲- ایضاً،ص۱۶
۳- ایضا،ص۱۸۔۲۷
۴- ایضاً،ص۲۸۔۲۹
۵- ایضاً،ص۳۰۔۳۸
۶- ایضاً،ص۳۹۔۵۵
۷- عرب وہند کے تعلقات،سید سلیمان ندوی،ص۱۳،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یوپی،ایڈیشن ۲۰۱۰ء
۸- تاریخ دعوت وعزیمت،ص۱۹۲،جلد چہارم،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام،لکھنؤ، جولائی ۲۰۰۶ء
۹- مقالاتِ سلیمان،حصہ دوم،ص۲۴،مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ص۲۴،مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء
۱۰- علم الکلام شبلی نعمانی،ص۸۷،مسعود پبلیشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۹۴ء
۱۱- تاریخ دعوت وعزیمت،جلد پنجم،ص۳۷۴
۱۲- الدعوۃ اسلامیۃ ومناھجھا فی الھند،ص۹۰۔۹۶
۱۳- ایضاً،ص۹۷۔۱۰۱
۱۴- ایضاً،ص۱۰۲۔۱۱۷

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ بحیثیت مفکر و دانشور

ابوفہد، نئی دہلی

آج سے ٹھیک اٹھارہ برس پہلے جب مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی نے اہل ندوہ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا تھا تو اہل ندوہ کو اِس احساس نے بہت ستایا تھا کہ اب ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں۔اس وقت اہل ندوہ کے لیے دوطرح کے رنج والم ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے، ایک مفکر اسلام کی رحلت کا الم اور دوسرے ان کی مسند علم وفکر کے خالی رہ جانے کا رنج۔

اور یہ ستایا جانا کوئی پہلی اور آخری بار نہیں تھا۔لہذا جب جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ مفکر اسلام کا کوئی جانشیں اہل ندوہ کوالوداع کہتا ہے تو ایک بار پھر وہی دوہری نوعیت کا دکھ بھرا احساس اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ ان پر وارد ہو جاتا ہے۔کیونکہ عموما ایسا ہی ہوتا ہے کہ جانے والوں کی جگہ خالی ہی رہ جاتی ہے۔یہی احساس ان پر اس وقت بھی وارد ہوا اور اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ وارد ہوا جب مفکر اسلام کے تربیت یافتہ ایک ہونہار ندوی عالمِ دین یعنی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی اہل ندوہ کو داغ مفارقت دے گئے۔انا لله وانا اليه راجعون۔

اس موقع پر مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا سعید الرحمان اعظمی ندوی صاحب نے اسی دوہری نوعیت کے دکھ بھرے احساس کا اس طرح اظہار کیا:

’’آپ کومعلوم ہونا چاہئے کہ جب کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس خلا کا پر ہونا بہت مشکل ہوتا ہے،مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا شمار انہیں شخصیات میں ہے جن کا خلا پر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے۔‘‘(تعمیر حیات 25 جنوری 19)

یہ بڑا عجیب سا وقت ہے جس میں ہم جی رہے ہیں۔اس زمانے میں اکتشافی اور عمرانی علوم ترقی کر رہے ہیں مگر علم دین،احسان وسلوک اور تقویٰ واخلاق کے معاملے میں زمانہ گویا پیچھے کی طرف دوڑ رہا ہے۔اور حضورﷺ کے فرمان (خَيرُ النَّاسِ قَرنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم (بخاری ومسلم) کے مصداق،مستقبل سے آنے والا ہر دن ماضی میں گم ہو جانے والے ہر دن سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔

ایک دانشور اور مفکر کی ہمہ جہت ذات میں جو صفات اور خصوصیات ہوتی ہیں،جس قسم کی دروں بینی اور ژرف نگاہی کی اسے ضرورت ہوتی ہے اور جس نوعیت کے ذوق وشوق کا وہ محتاج ہوتا ہے اور بقول اقبال:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز وساز رومی کبھی پیچ وتاب رازی

وہ جس طرح رومی کے سوز وساز اور رازی کے پیچ وتاب،یعنی علوم باطنی اور علوم ظاہری کا مجموعہ ہوتا ہے،وہ سب کی سب مولانا مرحوم کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں اور نہ صرف جمع ہوگئیں تھیں بلکہ اپنے تمامتر حسن کے ساتھ جمع ہوئی تھیں۔

اگر کوئی مسلمان ہے اور عالم دین ہے،ایک سے زائد زبانوں کا ماہر ہے،اس کا مطالعہ وسیع ہے،وہ شریعت کے مزاج سے آشنا ہے، بلکہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں شریعت کے تقاضے کیا ہیں اور نئی دنیا میں زندگی کے مسائل کو حل

کرنے میں شریعت کی رہنمائی کس طرح کی اور کس نوعیت کی ہے، وہ ماضی وحال کے تمامتر مدوجزر پر نگاہ رکھتا ہے اور نہ صرف یہ کہ ماضی وحال پر نگاہ رکھتا ہے بلکہ وہ اپنے گہرے علم، وسیع مطالعے اور قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے واقفیت اور نیکی وتقویٰ کی اساسی اور اضافی خصوصیات کی بنیاد پر اس لائق ہے کہ وہ مستقبل کے لیے ہمہ گیر لائحہ عمل بھی طے کرسکتا ہے، نیز وہ اپنی عالمانہ اور زاہدانہ زندگی کے طویل تجربات کی روشنی میں اور تحلیل وتجزیے کی قابل اعتماد صلاحیت کے بھروسے پر امت کو ایسی گائڈ لائن بھی فراہم کرسکتا ہے کہ امت اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کے لئے بہتر فیصلے لے سکتی ہے اور کامیاب وکامران ہوسکتی ہے۔ تو ایسے شخص کو بلاشبہ مفکر اسلام یا دانشور کہا جاسکتا ہے۔

اور جب ہم مولانا مرحوم کی زندگی کو، ان کے قول وعمل کی یکسانیت کو، ان کی پختہ مزاجی کو، ان کے رسوخ فی العلم کو دیکھتے ہیں، نیز ان کی اس صلاحیت پر نظر کرتے ہیں کہ وہ مافی الضمیر کے اظہار پر پوری طرح قادر ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اظہار کے پیرائے میں حسن وخوبی بھی پیدا کرسکتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ مولانا مرحوم کے سر پر مفکر اسلام کا تمغہ خوب جمتا اور جچتا ہے۔

مولانا مرحوم کی فکر کے سوتے وہی ہیں جو کسی بھی بڑے عالم دین کے ہوتے ہیں یعنی قرآن کریم اور سیرت رسول اللہؐ، اس کے بعد مولانا نے اپنے مطالعے کی جو نہج رکھی وہ فقہی اور کلامی نہیں تھی، بلکہ فکری اور دانشوارنہ تھی۔ قرآن وحدیث اور اسلامیات کے دیگر مضامین کے گہرے اور پرشوق مطالعے کے علاوہ مولانا مرحوم نے جن مضامین کو پڑھا، برتا اور پھر اظہار خیال فرمایا ان میں صحافت بھی ہے، ادب بھی، نصاب تعلیم بھی، تبلیغ دین بھی اور تصوف وسلوک بھی۔ عالم اسلام کے سیاسی احوال پر آپ کی گہری نظر تھی، قوموں کے عروج وزوال اور عروج وزوال کی وجوہات اور پھر اس کے اثرات سے بھی بخوبی واقفیت تھی اور سب سے بڑھ کر استعمار اور سامراج کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے واقفیت اور آگہی حاصل تھی۔ ایسی گوناگوں اور اعلیٰ درجے کی خصوصیات کے ساتھ مولانا جب اپنے رخش قلم کو حرکت دیتے تھے تو وہ صبا رفتار ہوجاتا تھا۔ اور اپنے قارئین سے عرب وعجم ہر دوجگہ داد وتحسین وصول کرتا تھا۔ آپ نے مترجم کی حیثیت سے بھی کم وبیش پندرہ بیس سال کام کیا اور پھر جب 'الرائد' کے ایڈیٹر بنائے گئے، تب سے تادم آخر آپ کے سیال اور مسافر قلم نے کسی بھی منزل یا محمل کو قبول کرنا گوارہ نہیں کیا، اس اجنبی کی طرح بھی نہیں، جو جہاں چھاؤں گھنی دیکھتا ہے، ستانے بیٹھ جاتا ہے۔

ع بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

مولانا مرحوم کے مطالعے کا نہج وہی تھا جو شبلی و ابوالکلام کے مطالعے کا نہج تھا، یعنی اسلامیات کے علاوہ تاریخ، ادب، تنقید اور سیاست، پھر اس پر مستزاد تحلیل وتجزیے کی خداداد صلاحیت تھی اور سیر وسیاحت کا موقع بھی۔ اور یہ آج کے زمانے میں جب کہ دنیا گلوبل ولیج بن گئی ہے اور انٹرنیٹ سروس گویا اُس عالمی کھڑکی کی مانند ہے جو گلوبل ولیج کی طرف کھلتی ہے، یہ گویا جام جمشید ہے اور ہر کسی کی دسترس میں ہے، آج بھی سیر وسیاحت کی افادیت اسی طرح برقرار ہے۔ قرآن نے بھی سیر وسیاحت کو علم کا ایک بہتر ذریعہ بتایا ہے، (العنکبوت: 20، الحج:46)۔ گرچہ قرآن میں سیر وسیاحت کا تذکرہ یا ترغیب مجرد علم کے حصول کے لیے نہیں ہے کیونکہ سیر وسیاحت کی ترغیب پر مبنی تمام آیتیں اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والوں کے عبرت ناک انجام سے نصیحت حاصل کرنے کے ضمن میں آئی ہیں۔ تو قرآن میں گرچہ سیر وسیاحت سے مجرد تحصیل علم مقصود نہیں ہے پھر بھی ان آیات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سیر وسیاحت بھی علم کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ممدوح اس حوالے سے بھی خوش قسمت ٹھہرتے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو گھوم پھر کر دیکھا اور مسلمان اور اسلام کے حقیقی مسائل کو تجربات کی روشنی میں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ممدوح جب پروفیسرس، صحافی اور سوکالڈ انٹلیکچولس کے درمیان کبھی بولتے تھے تو وہ حیرت میں پڑجاتے تھے کہ کوئی عالم دین بھی اس طرح کی گفتگو کرسکتا ہے۔ اتنی سنجیدہ، اتنی مدلل اور اتنی معیاری۔؟

اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ مولانا کا انداز تحریر اور انداز تکلم بھی

روایتی طرز تحریر سے مختلف اور روایتی طرز تکلم سے جدا تھا۔ آپ دوسرے قلم کار سے مولانا کے قلم کا موازنہ کریں گے تو پائیں گے کہ مولانا کی کوئی تحریر ایسی نہیں ہے یہاں تک کہ تنقیدی تحریر بھی نہیں، جو رد عمل کی نفسیات کے تحت یا جاو بے جا محبت وعداوت کے جوش وجنون کے عالم میں سپرد قلم کی گئی ہو۔ حالانکہ مولانا جس دور میں لکھ رہے تھے وہ عالمی پیمانے پر انتشار کا دور تھا، مغرب ومشرق کی کشمکش کے عروج کا دور تھا، نہ صرف فکری اور ڈائلاگ کی سطح پر بلکہ عسکری سطح پر بھی عالم اسلام پر مغرب کی یلغار جاری تھی، گویا سارا عالم کفر حملہ آور تھا اور عالم اسلام ضعف وناتوانی کے باوجود نشانے پر تھا۔ ایسے عالم میں کس میں جگر ہے کہ وہ خود کو پرسکون رکھ سکے اور رد عمل کی نفسیات کا شکار نہ ہو۔ مگر حیرت انگیز طور پر ایسا ہے کہ مولانا ممدوح کے سینکڑوں مضامین، مقالات اور دو درجن سے زائد کتابوں میں کوئی ایک پیرا گراف بھی ایسا نہیں دکھایا جاسکتا جو رد عمل کی نفسیات کے تحت لکھا گیا ہو، یا یہ کہ شتابی وانفعالی کیفیت اس میں در آئی ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کا اسلوب تحریر بھی ان کے فکر ورجحان کے بالکل مطابق یا سپورٹیو (supportive) ہے۔

کوئی بھی بات، نکتہ یا خیال جو غور وفکر کے نتیجے میں حاصل کیا گیا ہوگا وہ جوش وجنون کی کیفیت میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کیا جائے گا تو مؤثر نہیں ہوگا۔ اسی طرح اس کے بالکل برعکس کوئی بھی خیال، نکتہ یا فیصلہ جو غصے کی کیفیت یا جوش وجنون کے عالم میں سوچا یا لیا گیا ہوگا اسے میٹھے لب ولہجے، ڈھنڈے اور دھیمے انداز میں بیان نہیں کیا جاسکتا کہ یہ غیر فطری بھی ہوگا اور خلاف واقعہ بھی۔ اس بات کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو عقل ونطق سے نوازا ہے تو اس عقل ونطق کے سروکار اور افعال کو کارگر بنانے کے لیے انسان کو سپورٹیو (supportive) جسم بھی دیا ہے۔ فرض کریں اگر یہ عقل اور نطق کسی جانور کو عطا کردی جاتی تو چونکہ اس کا جسم عقل ونطق کی کارکردگی اور جولانیوں کو سپورٹ دینے والا نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی عقل اور نطق سے وہ کام نہیں لے سکتا تھا جو ایک انسان لے سکتا ہے یا لیتا ہے۔

بالکل یہی حال علم، صلاح وتقویٰ اور ان سب کے اظہار کے اسلوب کا بھی ہے۔ بدی کے اظہار کا اسلوب مختلف ہوگا اور نیکی کے اظہار کا اسلوب الگ۔ اسی طرح جوش وجنون کے اظہار کا اسلوب الگ ہوگا اور ہوش وخرد کے اظہار کا اسلوب مختلف۔ اور یہ بھی نہایت ہی تعجب خیز بات ہے کہ ہم مولانا ممدوح کو اس صفت میں بھی ممتاز پاتے ہیں کہ ان کا مزاج، طرز زندگی اور اسلوب تحریر باہم دگر معاون اور مددگار ہیں، گویا دونوں ہم رخ ہیں، جس طرح سورج مکھی کے تمام پھول ہم رخ ہوتے ہیں۔

اگر ہم ایک اور ناچیے سے مولانا ممدوح کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیں تو ہمیں بجا طور پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی تمامتر علمی وتنقیدی کاوشوں کا رخ خارجی زیادہ رہا اور داخلی کم رہا۔ اگر کسی قلم کار کے سروکار عالمی اور آفاقی ہیں تو لازمی طور پر یہ ہوگا کہ اس کی علمی اور تنقیدی کاوشوں کا رخ بھی لامحالہ خارجی ہوگا۔ یعنی وہ امت کے اندرونی مسائل میں خود کو نہ الجھا کر بیرونی اور عالمی مسائل سے اپنے سروکار بڑھائے گا اور اس کی نوک قلم وزباں پر فقہی مسائل اور مسلکی وطبقاتی جھگڑے نہیں ہوں گے اور اگر ہوں گے بھی تو تجزیاتی اور معروضی طرز پر ہوں گے، ان کے بیان کی نوعت کچھ اس طرح کی ہوگی کہ وہ تفہیم وتشریح سے شروع ہوں گے اور کسی قابل قبول حل اور تصفیے کی طرف منتہی ہوں گے۔ ایسا شخص یہ نہیں دیکھے گا کہ امت کو کسی مسلک سے یا طبقے سے یا کس خاص مکتبہ فکر کے رجحان سے اور کاوشوں سے کتنا اور کیسا نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ اس کا مطمح نظر یہ ہوگا کہ موجودہ وقت میں نیو ورلڈ آرڈر کی تباہ کاریاں کیسی ہیں، متحدہ اقوام اور سلامتی کونسل کی سرگرمیوں کا رخ کیسا ہے، ناٹو اتحاد کی فوجی وعسکری ماراماری بلکہ مہاماری پوری انسانیت کے خلاف اور بطور خاص عالم اسلام کے خلاف کیسا اور کس نوعیت کا مستقبل ترتیب دینے کی راہ پر گامزن ہے۔ اقوام عالم کے باہمی سیاسی، عسکری اور تجارتی تعلقات مسلم دنیا کو کس طرح الگ تھلگ ڈال رہے ہیں۔

چنانچہ اگر ہم اس اعتبار سے بھی مولانا ممدوح کی علمی کاوشوں کا تجزیہ کرتے ہیں تب بھی ہمیں کسی قسم کی مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی کاوشوں کا تمامتر رخ خارج کی طرف

ہے۔ چنانچہ وہ کبھی مغرب پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں، کبھی اس کے نظام تعلیم پر اور کبھی اس کے اخلاق اور تہذیب پر، کبھی وہ عالم اسلام کی موجودہ صورت حال پر خامہ فرسائی کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی لوگوں کو صلاح وتقویٰ اور نیکی وخیر خواہی کی طرف متوجہ کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ امت کو اعتدال کی راہ سمجھا اور سجھا رہے ہوتے ہیں اور کبھی عربوں کو عالمی سامراج کی دسیسہ کاریوں سے واقف کرانے کے لیے بالفاظ غالب تہیۂ طوفاں کیے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

گرچہ ایسا ہے کہ مولانا مرحوم کا یہ طرز زندگی، اسلوب تحریر اور مطالعہ وتنقید کا خاص نہج اور لب ولہجہ سب کچھ مفکر اسلام سے راست طور پر فیض پانے کا نتیجہ ہے مگر ساتھ ہی اس فیض میں مولانا ممدوح کا خود اپنا وژن بھی شامل ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب نے لکھا ہے:

''مولانا واضح رشید حسنی کی تحریروں کے مطالعے کے دوران مولانا علی میاں کی کتاب ''انسانی دنیا پر عروج وزوال کا اثر'' اور ''مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' کی یاد آجاتی ہے اور صاف طور پر ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے اسی خرمن فکر سے خوشہ چینی کی ہے لیکن صرف افکار ونظریات میں استفادہ ہے جہاں تک اسلوب اور طرز تحریر کا تعلق ہے تو وہ مختلف ہے۔ مولانا علی میاں کی عربی تحریروں میں (خاص طور پر ''الاسمعیات'' کے حوالے سے'' حکمت لقمانی کے ساتھ جمال الدین افغانی کی گل افشانی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مولانا واضح حسنی کی تحریروں میں دھیما پن ہے، ہوش وخردمندی کا سایہ ہے وہ عہد حاضر کے ایک اسلامی مفکر ہیں، بڑے مفکر۔'' (بحوالہ: مضمون ''مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں''

پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب کا یہ خیال کہ 'مصنف نے اسی خرمن فکر سے خوشہ چینی کی ہے' محض ایک خیال ہی نہیں ہے بلکہ خود مولانا مرحوم نے مذکورہ دونوں کتابوں یعنی 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' 'الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والغربیۃ فی الاقطار الاسلامیۃ'' اور 'الی الاسلام من جدید' کا نام لے کر یہ بتایا ہے کہ ان کی فکر کا چراغ مفکر اسلام کے چراغ علم وفکر سے ہی روشن ہے۔

مولانا مرحوم نے جدید تعلیم بھی حاصل کی اور اس سے خوب فائدہ بھی اٹھایا مگر وہ جدید تعلیم کی ان جدتوں اور روشن خیالیوں کی طرف مائل نہیں ہوئے جو انہیں بے گانگی کی راہ پر ڈالنے کا باعث بن سکتی تھیں اور نہ ہی اس سے اس درجے متاثر ہوئے کہ وہ اسلام کے چشمہ ؟ شافی کو گدلا محسوس کرنے لگیں جیسا کہ بعض جدت پسندوں اور روشن خیالوں کا رویہ رہا، کہ وہ سائنسی وطبعی علوم اور جدید فلسفوں اور ازمات سے متاثر ہو کر اسلامی تعلیمات کو فرسودہ بتانے لگے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے عربی صحافت وادب کے ذریعے عالم عرب کو خاص طور پر جو میسج دیا افسوس اس کا ہے کہ اہل عرب نے اس میسیج کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مولانا مرحوم نے اپنی آخری تقریر میں اسی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اگر اخوان المسلمون مفکر اسلام کی معروضات اور گزراشات کو پیش نظر رکھتے تو نہ صرف یہ کہ وہ کامیاب ہوتے بلکہ آج جو حالات ان پر ہیں شاید وہ ایسے حالات سے دوچار ہونے سے بھی بچ جاتے۔ اور جب کوئی دینی جماعت کسی عالم کی بات پر دھیان نہ دے تو پھر حکومت اور بادشاہوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ مولانا مرحوم کے مطابق مفکر اسلام نے اخوان کو متنبہ کیا تھا کہ وہ نبی کے طریقے کو اپنائیں۔

پروفیسر محمد انیس چشتی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا کی زندگی کی آخری تقریر کا جو مختصر احوال بیان کیا ہے، جو اتفاق سے پروفیسر صاحب کی کتاب کے اجراء کے موقع پر کی گئی تھی، اس میں اس بات کی وضاحت اس طرح آئی ہے:

''20 دسمبر 2018 کو میری ہلکی پھلکی تصنیف ''تذکرہ سید ابوالحسن علی ندوی'' کا اجراء تھا۔ اس پروگرام کا علم خود مجھے تقریباً نصف گھنٹے پہلے ہوا تھا۔ میں اس وقت مولانا واضح صاحب کے دفتر میں ہی موجود تھا۔ جب ہم چلنے کو ہوئے تو انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں جتا جتا کر کہا کہ ''دیکھیے ہم تقریر بالکل نہیں کریں گے۔ ہمارا نام نہیں پکارنا۔'' ہم نے کہا کہ نہیں آپ تقریر بالکل نہیں کریں گے، صرف بات چیت کریں گے۔'' اور پھر یہی ہوا کہ ان کا نام (مولانا) نذر الحفیظ صاحب نے تقریر کے لیے پکار ہی لیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ ان کی

زندگی کی آخری تقریر ہے۔ مولانا دھیما اور کم بولنے والوں میں سے تھے، لیکن اس دن وہ گرجے، ان کی آواز میں بلا کا جوش اور الفاظ میں پہاڑی آبشار کا بہاؤ تھا۔ وہ بغیر رکے نفس مضمون کی طرف پہنچے اور ندوہ سے ہوتے ہوئے شبلی اسلوب کا احاطہ کیا اور روم و یونان کے فلسفوں کا ذکر کر کے مغرب کی ریشہ دوانیوں اور جھوٹی تاریخ کی مجسمہ سازی کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مغرب نے کس طرح عربوں کے فلاسفہ کو ترجمہ کر کے اپنی یافت بنا کر پیش کیا ہے اور اس میں بھی ترجمہ کاری کی لاتعداد غلطیاں کر بیٹھے ہیں۔ پھر اس کے بعد مفکر اسلام (سید ابوالحسن علی ندوی) کی فکر کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح انہوں نے اخوان المسلمون کو متنبہ کیا تھا کہ نبوی طریقہ اختیار کیجئے۔ مولانا (واضح صاحب) نے جتایا کہ اگر اخوان اس وقت یہ طریقہ اختیار کر لیتے تو آج یہ نہ ہوتا جو اخوانیوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

اس تقریر میں مولانا نے دم بخود مجمع کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور تحریک پیام انسانیت اور اس کے کار پردازاں خوب خوب ذکر کیا۔ چالیس منٹ تک برپا ہونے والے اس جلسے میں میں نے ایسی نورانیت اور سکینت دیکھی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جب ہم لوٹے ہیں مولانا رابع صاحب نے سب سے پہلے یہ کہا کہ ''کتاب کے اگلے ایڈیشن میں واضح کی یہ تقریر دیباچے کے طور پر شامل کی جانی چاہئے۔''

مولانا نے فکری کتابوں کا مطالعہ زیادہ کیا تھا اور اسی لیے ان کی کتابیں فکر و دانش کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ مولانا دو درزن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جو ثقافت اسلامی اور اس کی تاریخ کے بیان سے لے کر تبلیغ و تذکیر دین اور پھر تعلیم و تدریس کے کئی میدانوں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ بھی عالمی مسئلہ ہے اور مولانا نے اس مسئلے کو بھی خوب وضاحت اور قوی دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی فکر و دانش جس کتاب میں زیادہ جلوہ گر ہوئی ہے وہ 'الغزو الفکری ہے'۔ جس کا اردو ترجمہ 'عالم اسلام پر فکری یلغار' کے نام سے ہوا ہے۔ اور ابھی زیر طبع ہے۔ ایک اہم کتاب 'الی نظام عالمی جدید' ہے جو مغرب و مشرق کی تہذیب کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ نظام تعلیم و تربیت پر بھی مولانا کی ایک گراں قدر کتاب ''نظام تعلیم وتربیت، اندیشے، تقاضے اور حل'' کے نام شائع ہوئی ہے، یہ بھی ان کے دروس، مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ سب مضامین بھی اصلاً عربی میں ہی لکھے گئے تھے۔

مولانا نے اپنی مختصر کتاب ''اسلام مکمل نظام زندگی'' میں، جس میں انہوں ایسی چالیس احادیث نبوی جمع کی ہیں جو انسان کی کل زندگی اور مکمل نظام حیات کا احاطہ کرتی ہیں، موجودہ عہد کا ایک مرض اسلام کی من مانی تشریح بتایا ہے اور دوسرا مرض عمل میں عدم توازن بیان کیا ہے۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''اس عہد کا اصل مرض اسلام کی من مانی تشریح اور عمل میں عدم توازن یا جزوی عمل ہے اور یہی اس عصر کا مرض اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب ہے۔

سورہ مائدہ کی اس آیت (الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً ۔الخ) پر غور کر کے میرے ذہن میں ایک نقشہ آیا جو خود قرآن کریم کی آیت (أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ...ابراهيم: 24،25) سے ماخوذ ہے۔ میں نے اسلام کو ایک شجر تصور کیا اور اس کی تعلیمات کو جو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں شاخیں تصور کیا اور اس کا نقشہ بنایا اور اس کے مطابق حدیثوں کو جمع کیا، جو زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق ہیں۔ اب اگر ان سارے شعبوں کو جمع کیا جائے اور اسلام کامل وجود میں آجائے تو اس کی مثال شجر کی طرح ہوگی جو ہر دور میں خدا کی مدد اور حکم سے پھل دے گا اور (تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا) کا مصداق ہوگا۔''

اس سے ماقبل کے پیراگراف میں انہوں نے عالم اسلام کی عجیب مگر ہر زمانے میں پائی جانے والی ٹریجڈی کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اسلامی تاریخ کی ایک ٹریجڈی یہ ہے کہ مختلف ادوار میں علماء اور

مفکرین نے اسلام کے بعض اجزاء پر زیادہ زور دیا کہ وہی اسلام سمجھے جانے لگے اور بعض حضرات نے دوسرے اجزاء پر زور دیا کہ بس وہی اس فرقے کے لیے اہمیت کے حامل ہوگئے۔

اسی طرح اعمال واحکام میں تناسب کا خیال نہیں رکھا گیا، اپنے ذوق اور علم کی بنیاد پر بعض کی اہمیت پر زیادہ زور دیا اور بعض پر کم، اسی لیے مسلم سماج میں توازن قائم نہیں رہا۔''

مولانا مرحوم کی جتنی بھی کتابیں اب تک منظر عام پر آئی ہیں، ان میں سے بیشتر اصلا عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب کتابوں کی شکل میں آنے سے پہلے مقالات، مضامین اور درس کی تیاری کے لئے جمع کئے گئے نوٹس کی شکل میں تھیں۔ بعد میں ان مضامین ومقالات پر نظر ثانی کی گئی اور انہیں کتابی شکل دی گئی۔ مولانا کے اکثر مضامین میں ان کی فکر اور استدلال تین بنیادی نکات کے اردگرد گھومتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ ایک مغربی تہذیب کی توضیح و تفسیر، اس پر تنقید، اس کی مضرتوں کا بیان۔ دوسرے اس خدشے کی وضاحت کہ اگر انسانیت اسی طرح مغربی انداز فکر ورجحان کے تحت تخلیق کئے گئے عالمی نقشے کے مطابق آگے بڑھتی رہی تو وہ کس طرح کے خطرات سے دوچار ہوسکتی ہے اور اسے مستقبل میں کن کن مشکلات کا سامنا کرپڑسکتا ہے اور نہ صرف آخرت اور ایمان وعقائد کے باب میں امت بہت برے خطرے اور خسارے سے دوچار ہوسکتی ہے بلکہ دنیاوی علوم فنون اور عسکری وسیاسی میدانوں میں بھی ناقابل تلافی نقصان اٹھا سکتی ہے۔ تیسرے نکتے کے طور مغربی تہذیب وتمدن کے نقصانات اور مضر اثرات سے بچنے اور محفوظ رہنے کی تدابیر اور حل کی وضاحت ہے۔ اور کل انسانیت کے لیے اور بطور خاص امت کے لیے یہ میسج ہے کہ اگر بنی نوع انسانی کو اور خاص طور پر اسلامی سوسائٹی کو مغربی طرز زندگی اور نظام تعلیم کے زیر اثر پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے والی مادیت اور خدا بیزاری کے عام رجحان کے مضمرات سے بچنا ہے اور انسانی قدروں کی حفاظت اس کے لیے کسی بھی درجے میں ضروری ہے تو مسلمانوں کو اسلام کی طرف پلٹنا ہوگا، اسے ایک بار پھر اپنی زندگی اور سرگرمیوں کا محور بنانا ہوگا۔ اور دنیا کو اسلام اور اسلامی تعلیم کی طرف قدم بڑھانے ہوں گے اور اسلام کو کسی حریف اور مخالف نظام، پیغام اور تعلیمی رجحان کی طرح ٹریٹ کرنے کے بجائے اسے ایک ممکنہ، آسان اور کارآمد آپشن اور حل کی طرح لینا ہوگا۔ اور خاص کر مسلمانوں کو ایک ایسا اسلامی معاشرہ تشکیل دینا ہوگا جو ایک طرف تو حتی الوسع اور تمام جائز حدود میں جدید علوم وفنون سے استفادہ کرنے والا ہو اور دوسری طرف اس کی اہمیت یہ ہو کہ وہ اسلامی اخلاق وتعلیمات کیز یرنگرانی اور رہنمائی کے بغیر آگے نہ بڑھے۔ یہ وہ تین بنیادی نکات ہیں جو مولانا مرحوم کے اکثر مضامین کا ایک طرح سے ابتدائی نقش یا خطہ ہیں، مولانا نے اپنی کتاب ''الی نظام عالمی جدید'' کے پیش لفظ میں اس کی صراحت کی ہے۔ اور مولانا کی یہ صراحت صرف اسی ایک کتاب پر یا اس کتاب میں جمع کئے گیے مقالات ومضامین کے تعلق سے ہی درست نہیں ہے بلکہ مولانا کی تمام کتابوں کے تعلق سے یہ وضاحت درست ہے۔ کیونکہ مولانا مرحوم کی تمام فکر اور تمام قلمی کاوش انہی تین بنیادی باتوں یا نکات کی وضاحت وتفسیر ہے۔

یہاں شاید یہ کہنا درست ٹھہرے کہ ریڈیو کی جاب نے مولانا ممدوح کا بہت وقت لے لیا، تقریبا پورے بیس سال۔ اگر مولانا وہاں سے آٹھ دس سال قبل فارغ ہوگئے ہوتے تو ندوہ، اہل ندوہ، طلبہ ندوہ اور قوم وملت کو اپنی واضح اور متواضع فکر اور علم وعمل نیز ہمہ دانی وزباں دانی سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ اور عربی زبان وادب اور صحافت ان کی اعلیٰ پائے کی نگارشات سے اور بھی زیادہ مالامال ہوجاتی۔ آخر میں میں کہنا چاہوں گا کہ مولانا کو سچا خراج عقیدت پیش کرنا شاید یہی ہوگا کہ ان کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یا پھر کسی ملحقہ معتبر ادارے میں صحافت یا پھر مطالعات بین المذاہب کے نام سے کسی شعبے کا افتتاح کیا جائے۔

☆☆☆

تعلیم وتربیت اور مولانا واضح رشید حسنیؒ کا موقف

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اللہ رب العزت نے انسان کو جن صلاحیتوں سے نوازا ہے ان میں قلم ایک عظیم طاقت ہے۔ اگر انسان قلم کو مثبت وتعمیری کاموں میں لگادے تو اس فانی دنیا کا ایسا انمول رتن بن جائے جس کی چمک دمک اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کی کمی کا احساس نہ ہونے دے۔ استاد شاعر ذوق دہلوی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے ہے سلسلہ یہی دو پشت چار پشت

۱۶؍جنوری ۲۰۱۹ء کی صبح جب مولانا واضح رشید ندوی صاحب کے اچانک انتقال کی اطلاع سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی تو باوجود اس کے کہ مولانا سے کبھی کوئی ملاقات نہیں تھی۔ دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ محسوس ہوا کہ کوئی اپنا عزیز ترین رختِ سفر باندھ کر رخصت ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور دعائے مغفرت کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا لیکن وہ سارا دن عجیب وغریب بے چینی میں گذرا۔ اس کی وجوہات پر غور کرنے لگا تو اندازہ ہوا کہ ملت کا ہر وہ فرد جو ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑتا رہے ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ اس کے جانے کا غم اپنوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کاملہ اور مرحوم کے جملہ متعلقین بالخصوص مشفق ومکرم حضرت مولانا سید رابع حسنی صاحب مدظلہ العالی کو صبر جمیل اور ملت اسلامیہ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

مرحوم عربی زبان وادب کے دلدادہ، شیدائی، پختہ قلمکار اور اس عالمی زبان کے ذریعہ اپنے افکار وخیالات کو پوری قوت واستدلال کے ساتھ قارئین کے دل ودماغ تک پہنچانے والے تھے۔ عرب وعجم کے بہت سے عربی اخبارات وجرائد ان کی تحریروں کو شائع کرنا اپنے لئے باعث فخر تصور کرتے تھے۔ کچھ ایسے مضامین جو برصغیر کے اردو داں طبقہ تک پہنچانا ضروری سمجھتے تھے انھیں کبھی خود اور کبھی کسی دوسرے ترجمان کے ذریعہ اردو قالب میں بھی ڈھال دیتے۔ مولانا مرحوم کی نگارشات سے مولانا کی ملی حمیت اور اسلامی غیرت کا انداز لگانا چنداں دشوار نہیں۔ راقم کے پیش نظر مولانا مرحوم کے تعلیمی مضامین کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے مولانا کے شاگرد مولانا وثیق احمد ندوی نے ''نظام تعلیم وتربیت۔ اندیشے، تقاضے اور حل'' کے نام سے اردو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

پیش نظر کتاب محض ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے جسے دارالرشید لکھنؤ نے ۱۴۳۴ھ (۲۰۱۳ء) میں شائع کیا۔ کتاب کے موضوعات ''صلیبی جنگوں کے بعد''، ''تجدد کے نام پر تقلید مغرب کی دعوت''، ''سامراجی ذہنیت''، ''سامراجی تربیت کے اثرات''، ''تعلیم وتربیت کے قدیم وجدید عناصر''، ''قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات''، ''نصاب تعلیم اور دعوتی تقاضے''، ''نصاب تعلیم میں عربی زبان وادب کی اہمیت''، ''اسلامی نظام تربیت کے اثرات''، ''ثقافتی پروگرام اسلامی تناظر میں'' اور ''نصاب تعلیم سے زہر آلود مواد کے ازالہ اور عمدہ نصاب تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت'' اور پھر ان موضوعات کے درجنوں ذیلی عنوانات کتاب کی ضرورت اور مولانا کے ملی درد اور حساس دل کو سمجھنے کے لئے کافی سمجھے جاسکتے ہیں۔

مولانا واضح رشید ۱۹۳۳ء میں اس فانی دنیا میں رائے بریلی کے خانوادۂ حسنی میں معرض وجود میں آئے۔ حسب دستور اور گھریلو روایت کے مطابق انھوں نے علوم دینیہ سے تعلیم کا آغاز کیا اور ندوہ کے نصاب

کی تکمیل کی، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فیضیاب ہوئے اور اوائل جوانی میں ہی عربی زبان و ادب پر عبور حاصل کرلیا۔ عملی زندگی کی شروعات انھوں نے اپنے دور کے ابلاغ و ذرائع کے اعلیٰ ترین ادارے آل انڈیا ریڈیو کی عربی نشریات سے کی، جہاں وہ ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے اٹھارہ سال تک اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے لیکن بزرگوں کے اشارے پر انھوں نے شہرت و تشہیر کے اس ادارے سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے مشفق و مربی ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں اپنی صلاحیتوں کو درس و تدریس اور تحریر و تقریر سے وابستہ کر دیا۔

عربی زبان و ادب سے انسیت و محبت کے باعث مولانا مرحوم کی فکری تحریروں کا عظیم ترین سرمایہ اسی زبان میں موجود ہے لیکن کبھی کبھی وقت اور حالات کی مناسبت سے اردو زبان میں بھی اظہار خیالات فرما دیتے تھے اگر مولانا کے اردو مضامین کو یکجا کیا جائے تو وہ بھی انتہائی ضخیم ہونے کے ساتھ ساتھ ملت کے بیش قیمت سرمایہ کی شکل میں وجود میں آسکتا ہے۔

مولانا نے یوں تو زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا لیکن بطورِ خاص آپ کی توجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے، اس کے اسباب کو سمجھنے و سمجھانے اور ملت کو یہ احساس دلانے میں رہی کہ تعلیم سے منہ موڑنے کے کتنے بھیانک نتائج ہو سکتے ہیں اور پھر صرف تعلیم برائے تعلیم نہیں بلکہ اس کا مقصد متعین ہونا چاہئے اسی کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و پیش کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تعلیم کے عنوان سے مغرب نے مسلمانوں کے مذہبی علوم پر جس انداز سے فکری یلغار کی، پیش نظر کتاب میں اس کے تئیں بے انتہا اضطراب پایا جاتا ہے۔

تعلیم جیسے خشک موضوع کو تاریخی حقائق کے پس منظر کے ساتھ دلچسپ پیرایے میں بیان کر کے ملت کو بیدار کرنا اور سامراجی سازشوں کو بے نقاب کر کے مسلمانوں کو ان کے مذہبی فریضہ ''تعلیم و تربیت'' کی مؤثر انداز سے یاد دہانی کرانا مولانا کی تعلیمی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔

کتاب کے موضوعات ملی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے سبھی حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ پیش گفتار مولانا کے لائق و فائق صاحبزادے مولانا جعفر مسعود ندوی صاحب کا ہے۔ پیش لفظ خود مولانا واضح رشید ندوی صاحبؒ کا ہے جنھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''پیش نظر مجموعہ میں ان تینوں پہلوؤں (تعلیم، ذرائع ابلاغ اور تربیت) پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مضامین مختلف موقعوں پر لکھے گئے۔ اس کا مقصد حل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ توجہ مبذول کرانا ہے یہ کتاب احساسات اور تجربات پر مبنی ہے۔'' (ماخوذ از پیش لفظ، ص ۱۸)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب مدظلہ العالی کے گراں قدر مقدمہ اور مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب اسلامک سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی (لندن) کی تقریظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ کتاب بہر طور تجربات و مشاہدات پر مبنی اور چشم کشا حقائق کا مظہر ہے۔

تعلیم کے تعلق سے ملت کے اندر دو طبقات شروع سے ہی موجود رہے ہیں ایک طبقہ تو وہ ہے جو ہر قسم کے علوم کو بالضرورت یا بلا ضرورت ہر قیمت پر حاصل کرنا خواہ اس کا مذہبی تشخص و تحفظ باقی رہے یا نہیں رہے ضروری سمجھتا ہے۔ اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس سودے میں العیاذ باللہ اس کی متاع آخرت بھی چلی جائے۔ دوسری مقدس ترین جماعت وہ ہے جس نے تعلیم کو ایک مذہبی فریضہ مانتے ہوئے اس کا مقصد رضاء خداوندی کو جانا اور اس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ پہلے گروہ نے حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر دنیا پرستی کو اپنا مقصد حیات بنایا جس کے نتیجے میں وہ شیطان کی راہوں پر چل پڑا اور اسلام سے چشم پوشی کر کے مسلمانوں کے درپئے آزار ہو گیا۔

دنیا کی چند روزہ نمائشی چکا چوند نے تعلیمی نظام کو سامراجی و صہیونی طاقتوں کے زیر اثر کر دیا جس کے نقصانات بطورِ خاص ملت اسلامیہ کو ماضی میں بھی پہنچے ہیں۔ حال بھی ان سے خالی نہیں اور مستقبل میں بھی یہ اندیشے قوی ترین ہیں کہ ملت پر اس تعلیمی نظام کے مہلک اثرات مرتب ہوں گے اس لئے بہی خواہان ملت نے ہر دور میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اللہ کو ایک ماننے والی قوم کے افراد تعلیم کے ذریعہ اس کی وحدانیت کا نعرہ بھی بلند کریں اور اس نے جس مقصد کے لئے کائنات کی تخلیق کی ہے اس سے خود بھی مستفید ہوں اور دوسروں کو بھی

فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں۔ ''جدید تعلیم'' کے نام پر پہچانے جانے والے نظام تعلیم نے معاشرہ کو کس حد پر پہنچا دیا ہے اس کا اظہار مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا جعفر مسعود صاحب نے پیش گفتار میں اس انداز سے کیا ہے کہ ''مغربی نظام تعلیم کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب نے اپنے اس نظام تعلیم کی بدولت سائنس، ٹکنالوجی، صنعت، حرفت ریاضی، انجینئرنگ، فلکیات، طبعیات اور دوسرے علوم وفنون میں کامیابی کی منزلیں طے کیں۔ ایجادات پر ایجادات یعنی چاند پر کمندیں ڈالیں سمندر کی گہرائیاں ناپیں فتوحات پر فتوحات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ آج وہ اپنے اسی نظام تعلیم کی بدولت اس منزل تک پہنچ گیا کہ اس نے دنیا کو اپنی مٹھی میں کر لیا لیکن ساتھ ساتھ اس نے انسان کو بحیثیت انسان جینے سے محروم کر دیا، امن کو غارت کیا، سکون کو برباد کیا، خاندانی نظام کو درہم برہم کیا۔ دلوں کو محبتوں سے خالی کیا اور اس کی شکل بدل کر ایک تجوری بنا دیا۔'' (ص ۱۱)

مولانا مرحوم نے اپنے پیش لفظ میں تعلیمی تجربات کی روشنی میں اس تشویش کا اظہار کیا ہے جو تعلیم کے مثبت نتائج کی خواہش رکھنے والے بہت سے علماء ومفکرین کے سامنے ہے، فرماتے ہیں کہ ''اہل فکر کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم وتربیت کیا ہو اور اس میں انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کو جو مشرق کی خصوصیات رہی ہیں، کیسے شامل کیا جائے اور اس کے مضر اثرات سے کیسے بچا جائے؟ دوسری طرف ہمارا قدیم نظام تعلیم ہے جو دینی علوم تک محدود ہے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کی مادی ضروریات اور تقاضوں کے اعتبار سے جن علوم کی ضرورت ہے ان کا تناسب بہت کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اور اس سے استفادہ کرنے والے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں حصہ نہیں لے سکتے۔ (ایضاً، ص ۱۷)

مولانا سید رابع حسنی ندوی صاحب نے اپنے مقدمہ اور ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب نے اپنی تقریظ میں تعلیم کو ذریعہ معاش بنانے کی مغربی ذہنیت اور سامراجی سازش پر تنقید کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موجودہ نظام تعلیم جن ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے، ان کا مقصد نسل انسانی کو تباہی کے غار کی طرف دھکیلنا ہے، اس صورتِ حال کے پیش نظر مولانا واضح رشید صاحب کی یہ کتاب مشعل راہ ثابت ہوگی۔

کتاب کے پہلے باب ''صلیبی جنگوں کے بعد'' میں مولانا نے مغربی دنیا کے رہنماؤں کی ان سازشوں کی طرف اشارات کئے ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کو ان کے جذبۂ ایمانی و جوش مسلمانی سے ہٹانے کے لئے بڑے منصوبہ بند طریقے سے اختیار کئے۔ فرماتے ہیں کہ ''مغربی دنیا کے رہنماؤں نے اس ایمانی طاقت وقوت کی رگوں کو کاٹنے اور اس کے سرچشموں اور سوتوں کو خشک کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کا طریقہ اختیار کیا تاکہ نئے اقدار وروایات کے ذریعہ ان کو روایتی اقدار وروایات سے ہٹا دیا جائے اور وہ اپنے آباء واجداد اور اسلاف کے طریقہ کار کو بھول جائیں۔ چنانچہ مغربی دنیا نے اسکولوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کا ایک جال پھیلا دیا اس کے لئے ایک خاص نصاب تعلیم تیار کیا جس میں ایسے مضامین شامل کئے گئے جس سے تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ اپنی روشن تاریخ اور شاندار ماضی کی طرف سے بدگمان ہوں اور اس کی طرف ذلت وحقارت آمیز نگاہوں سے دیکھیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ ''مغربی دنیا کا تیار کردہ نظام تعلیم وتربیت ایسی کتب پر مشتمل ہے، جن میں اسلام اور اسلامی عہد پر حملہ کیا گیا ہے۔ (ایضاً، ص ۳۶-۳۵)۔

اس ضمن میں مصنف کتاب نے مشہور عیسائی مبلغ صموئیل زویمر کی ان رپورٹوں کو بطور ثبوت پیش کیا ہے جو اس نے ۱۹۲۴ء میں عیسائی مبلغین کی ایک کانفرنس میں پیش کی تھیں۔ علاوہ ازیں مسٹر ٹاکلی، ایس ماسینون، عیسائی مبلغہ انا مالیگاں، گب اور ڈاکٹر واٹسن وغیرہ کے ان رجحانات کو بھی پیش کیا ہے جو ان حضرات نے اس کام کو انجام دینے کے لئے کئے، اس فکر کے جو نتائج برآمد ہونے چاہیے تھے آپ نے ان کو بھی اجاگر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''یوروپین فکر کے موافق تیار یہ نئی نسل ایک طویل عرصہ سے پوری دنیا میں قیادت اور اثر ورسوخ کی اہم جگہوں پر فائز ہے۔ جو ہر اس چیز پر ایمان رکھتی ہے، جس کی مغرب تلقین کرتا ہے یہ نسل مغرب کے مقاصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے اور یہ یورپین مدارس مسلسل ''مثقفین'' کی کھیپ کی کھیپ تیار کر رہے ہیں اور اکثر مسلم ملکوں کی قیادت اور اس کی تعلیم گاہوں میں نئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ذمہ دار ہے۔ (ایضاً، ص ۴۲)

مغرب نے یہ کام محض اس لئے کیا کیونکہ وہ اسلامی حمیت میں جوش وجذبات سے لبریز مسلم نسل کو جنگی محاذ پر شکست دینے سے قاصر تھا جس کا مظاہرہ صلیبی جنگوں میں بار بار ہو چکا تھا۔ اپنے عزائم و منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے ان فسطائی طاقتوں نے اس جنگ کا رخ تعلیم کی طرف موڑ دیا اور جدید تعلیم کے نام پر اسلام مخالف مواد کو نصاب کا جزء بنا کر اس تعلیم کے اثرات سے متاثر ایک بڑے طبقہ کو اسلام سے فکری طور پر برگشتہ کر دیا اور فسطائی عناصر جس جنگ کو محاذ پر ہار چکے تھے اسے جیتنے کے لئے بڑے عیارانہ انداز سے منصوبہ بند سازش کر کے تعلیمی اداروں کا جال پھیلا کر اپنے افکار ونظریات کی اشاعت شروع کر دی اور پوری دنیا کو اپنی فکر کی لپیٹ میں لے لیا۔ حالانکہ اس سازش کو سمجھنے کے بعد نئی نسل میں بیداری بھی آئی اور اس نے اس فکر کا مقابلہ کرنے کی جرأت بھی کی۔ ایک طبقہ ابھی بھی اس فکری یلغار سے برسر پیکار ہے لیکن مشرقی سادہ لوح افراد کی اکثریت اہل مغرب کی تقلید اور ان کی تحقیقات کے سامنے عقیدت مندی پر مجبور ہوگئی۔ اس عقیدت کے جذبہ پر مولانا اظہار حیرت کئے بنا نہیں رہے فرماتے ہیں کہ ''مشرقی قوموں کے نزدیک اہل مغرب کی تحقیقات، بدیہات سے کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ عقل ونقل کے درمیان نقل و روایت کو ہفوات وخرافات سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کیونکہ عقل اور سائنس ہی ان کے نزدیک معیار حکمت اور صحیح وصواب کا تھرمامیٹر ہے لیکن اگر یہی نقل (مغربی) روایات سے ماخوذ ہو تو ہر طرح قابل ترجیح اور لائق عمل ہو جاتا ہے۔'' (ص ۴۸)۔

مولانا اسے ذہنی غلامی اور مغرب سے مرعوبیت مانتے ہیں اور اس بات کو قابل افسوس گردانتے ہیں کہ ''تحقیق و ریسرچ کرنے والے مسلمان، اسلامیات کے سلسلے میں مستشرقین پر اعتماد کرتے ہیں اور اسلامی علوم وفنون میں مستشرقین کی تشریحات اور تصنیفات ان کے لئے مرجع اور مآخذ ہوتی ہیں اور وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ کہاں کہاں ان مستشرقین نے غلط بیانی سے کام لیا اور کہاں کہاں اپنے قاری کو دھوکہ دینے کی کوشش کی اور کس طرح بے بنیاد باتوں کا سہارا لے کر ایک مضبوط اور پختہ بنیاد پر قائم اسلامی پر شکوہ عمارت کو ڈھانے کی کوشش کی۔'' (ایضاً، ص ۵۰)

مولانا عموماً مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلم دانشوران ومفکرین کو مشورہ دیتے ہیں کہ ان کے اندر سے مغرب کے بارے میں تفوق و برتری کا احساس ختم ہونا چاہئے کیونکہ انسانی شرافت وعزت اور آزادی کے حصول اور اسلامی تشخص کو باقی رکھنے اور سامراج کے مقابلے کے لئے یہی بہتر اور صحیح راستہ ہے۔

دوسرے باب ''سامراجی ذہنیت'' میں مولانا نے سامراجیوں کے اس تعلیمی نظام کی ترویج کے نتیجے میں ''عیسائیت کی ترویج'' ''اسلام دشمن عناصر کی پشت پناہی'' ''اسلامی شعائر پر پابندی'' جیسے ذیلی عنوانات کے ذریعہ اظہار خیال کرتے ہوئے مذہب کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا ہے اور اپنے مشاہدات وتجربات کی بنیاد پر ثابت کیا ہے کہ مغرب کے اس (غیر مذہبی یا تعلیم کے پردہ میں ایک مخصوص مذہب کی اشاعت وتبلیغ پر منحصر) نظام تعلیم سے وجود میں آنے والا معاشرہ دین واخلاق سے عاری ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''اس غیر دینی اور غیر اخلاقی تربیت کے نتیجہ میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جو بظاہر ترقی وپیش قدمی کرتا نظر آتا ہے مگر درحقیقت وہ خودغرضی میں مبتلا اور اپنی ذات تک محدود ہے جس میں اگر آدمی خود غرضی وخود پرستی سے نکلتا بھی ہے تو خاندان اور ماحول کے اسی دائرہ تک جس میں وہ خود زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس سے مزید انانیت اور اپنی برادری اور اپنی سرزمین کے لئے مزید عصبیت پیدا ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص ۵۹)

مولانا مرحوم ان رجحانات کو تباہ کن اور اس صورت حال کو خوفناک صورت حال قرار دیتے ہیں کیونکہ موجودہ زمانہ میں حرص وہوس خود غرضی اور دوسرے بہت سے سماجی امراض اسی جدید تعلیم کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں، اس کے بالمقابل، مذہب اسلام ایسا سچا مذہب ہے جو انسانیت کی بقاء، ایک دوسرے کا احترام، ایثار واخلاص کو اپنے ماننے والوں کی رگ وپے میں پیوست کر دیتا ہے۔ ان ہی چیزوں کو اسلامی تعلیمات کا ماحصل بتاتے ہوئے وہ اسلام کو ایسا مذہب ثابت کرتے ہیں جس کی طرف واپسی ہی موجودہ سماج کے بحرانوں کا حل ہے۔ اس کی تفصیلات میں مولانا نے تعلیم وتربیت کے قدیم وجدید عناصر کا موازنہ کرتے ہوئے بڑا موثر تجزیہ کیا ہے۔

قدیم نظام تعلیم (یعنی اسلامی نظام تعلیم وتربیت) میں ذوق و شوق اور حصولِ علم میں یکسوئی اور طالب علم کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے اخلاقی و ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔ نئے تعلیمی مواقع اور وسائل سے استفادے کی راہیں تلاش کی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس جدید نظام تعلیم جن عناصر سے مرکب ہے ان میں ''طالب علم، کتاب یا نصاب تعلیم، اور استاد یا اس کی صلاحیت ولیاقت تک ہی محدود نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس نصاب کے ذریعہ طالب علم کے فکری منہج کو بدلنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ جس کو درست ثابت کرنے کے لئے وقت کے تقاضوں اور حالات کا بہانہ بنا کر اس کے لئے ایسا تعلیمی ماحول پیدا کیا جاتا ہے جس میں ذرائع ابلاغ، فلموں، ڈراموں اور من گھڑت جھوٹے سچے تمثیلی واقعات وحکایات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ تصورِ زندگی کو اسلامی تصور کے مطابق کرنے کے لئے صرف نصاب کی تبدیلی کافی نہیں بلکہ اسلام کے نظریہ علم کو سمجھ کر اسے عام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ مغربی تصورِ زندگی پر مبنی نظام تعلیم نے علم کے دائرے کو وسعت نہیں دی بلکہ اسے تنگ کر کے مادی دائرے میں محدود کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ ''یورپین تصور تعلیم میں انسان اپنی خواہشات ومرضیات کی تکمیل کے لئے وسائل کے اختیار میں آزاد ہے، وہ کسی اخلاقی بندش اور انسانی قدروں کا پابند نہیں، اس یوروپین تصور کی وجہ سے انسانی معاشرے میں باہمی مناقشت و رسہ کشی، استحصال، خودغرضی، مفاد پرستی، موقع پرستی، اخلاقی بے راہ روی وانارکی، آوارگی، مصلحت پسندی، انانیت اور غرور وتکبر جیسی اخلاقی بیماریاں عام ہورہی ہیں۔ مغربی مفکرین تعلیم کو اخلاقی تربیت سے الگ رکھتے ہیں۔ موجودہ مغربی نظام تعلیم کی بنیاد انھی ذہنی مغربی نظریات وافکار اور خالص مادی تصورات پر ہے جن میں اخلاقی قدروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' (ایضاً، ص ۷۰)

مادہ پرستانہ نظام تعلیم وتربیت کی تباہ کاری کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے عالم اسلام میں کشمکش کا بنیادی سبب آپ اسی نظام تعلیم وتربیت کو قرار دیتے ہیں کیونکہ ''شخصیت کی تعمیر میں اساتذہ، تعلیمی فضا، ماحول ذرائع ابلاغ، ادب وفن، صحافت وغیرہ کے اثرات پڑتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ صرف نصاب تعلیم ہی نہیں بلکہ ہر ہر سطح پر ہماری اصلاحی کوششیں ہوں بالخصوص موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کو اسلامی تصور کے مطابق ڈھالنا اور ان کی اصلاح کرنا ضروری ہے تاکہ اہل قلم اور فنکاروں کی ایسی نسل تیار ہوجائے جو اسلامی روح اور فکر کی حامل ہو اور کائنات اور انسان کے متعلق اسلام کے تصور سے ہم آہنگ ہو۔ (ایضاً، ص ۷۶)

قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے اساتذہ کے اخلاص وایثار کو بنیادی وصف قرار دیا ہے۔ درس میں انہماک اور طلبہ کا اساتذہ سے جو تعلق ہوتا تھا وہ مثالی ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہانِ وقت اور رؤساء بھی ان کی قدر کیا کرتے تھے۔ اساتذہ کی کوشش ہوتی تھی کہ طالب علم کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہوں، وہ ایسے کارآمد انسان کی صورت میں نظر آئے جو زندگی کے ہر میدان میں انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔ اساتذہ کا کام طالب علم کو ظاہری علوم سے مزین کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت کرنا ہوتا اور ان سب پر مستزاد اساتذہ اپنے شاگردوں کے باطن کی اصلاح کرنے کے لئے انھیں اہل دل سے مراجعت پر اکساتے تھے۔ اسی باب میں مولانا نے بہت عادلانہ و منصفانہ انداز سے درس نظامی پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے فوائد و نقصانات پر بھی گفتگو کی ہے۔

''نصاب تعلیم اور دعوتی تقاضے'' یہ باب کتاب کا اہم ترین باب ہے جسے وجہ تالیف بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اس کے ذیل میں آپ نے ''تعلیم کے مغربی نظریات'' پر مسلم علماء کی فکرمندی کو بھی اجاگر کیا ہے اور ہندوستانی علماء کے مثالی کردار کو بھی پیش کیا ہے۔ نئے عہد میں جو نت نئے خطرات درپیش ہیں ان کا حل عوام سے رابطہ کو مضبوط کئے بنا نہیں نکالا جاسکتا۔ اساتذہ اور دینی درسگاہوں کے لئے دعوتی کاموں کو ترجیحی بنیادوں پر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ''دعوتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی فکر اور اسلامی ثقافت کی حفاظت اور عصری تشریح کے لئے ضروری ہے کہ علماء اپنے نظام تعلیم وتربیت پر نظر ثانی کریں کیونکہ موجودہ عصر کا معاشرہ کھلا ہوا معاشرہ ہے اس میں کسی معاشرہ کو فکری لحاظ سے الگ تھلگ نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ نظریات، افکار،

طرز زندگی کے منتقل ہونے کے وسائل کی ایسی فراوانی ہے جن پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ سمعی، بصری اور دوسرے ذرائع ابلاغ مغرب کے قالب میں ڈھل رہے ہیں جو گمراہ کن نظریات کی تبلیغ و ترویج کرتے ہیں''۔(ایضاً،ص۹۳)۔

مولانا نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے گذشتہ صدی کے اواخر میں معرض وجود میں آنے والے ایسے لٹریچر کی طرف اشارہ کیا جو مغرب کے علمی تفوق کی تردید کرنے کے لئے تیار کیا گیا لیکن اپنی مخلصانہ کوششوں کے باوجود بہت سے مصنّفین کے مغرب میں تربیت پانے اور مغربی اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ اس کے برے اثرات کو پوری طرح ظاہر نہیں کر سکے اس لئے وہ اس لٹریچر میں پوشیدہ خطرات سے مامون نہیں رہے۔

برصغیر کے اسلام پسند محققین و مصنّفین میں آپ علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہم اللہ کو ایسے باشعور علماء وصاحب فکر دانشوروں میں شمار کرتے ہیں جن کی علمی وقلمی کاوشوں کے ذریعہ برصغیر ہند پاک و بنگلہ دیش کے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں خود اعتمادی اور اسلامی دعوت وتحریک کے جذبات پیدا ہوئے اور نئی نسل کو علمی وفکری رہنمائی ملی۔

اسی طرح عالم عرب میں بھی چند ایسے مصنّفین و مؤلفین پیدا ہوئے جو فکر اسلامی اور اسلامی علوم سے واقفیت کے جامع تھے ان میں خاص طور سے مالک بن نبی، سید قطب، محمد المبارک، معروف دوالیبی، محمد الہبی، مصطفیٰ سباعی، مصطفیٰ زرقاء، محمود محمد شاکر، یوسف قرضاوی اور سعید رمضان بوطی وغیرہ قابل ذکر ہیں، یہ ایسے مصنّفین، مؤلفین اور مفکرین ہیں جنھوں نے موجودہ تقاضوں کے مطابق نئی نسل میں اسلام کا تعارف بھی کرایا اور نوجوانوں کو اسلام کی روح سے روشناس کراتے ہوئے ان میں تحریکی جذبات بھی پیدا کئے۔

''نصاب تعلیم میں عربی زبان وادب کی اہمیت'' سے معنون باب میں آپ نے عربی زبان کو تمام اسلامی علوم وفنون کی کنجی مانتے ہوئے اسے تصنیف وتالیف کی زبان مانا ہے اور اس زبان کے نثری وشعری سرمایے میں جن ہندوستانی علمائے گرامی قدر نے تصنیفات پیش کی ہیں ان میں سے چند شخصیات کی طرف اشارات کئے ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے عالم عربی میں ہندوستانی محققین کی ان تصانیف کو بھی بیش قیمت قرار دیا۔ جن پر انھوں نے عرب کی علمی دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''ایسے ایسے نابغہ روزگار ادباء اور محققین بھی ہوئے ہیں جنھوں نے عربی ادب (نثر ونظم) کی کتابوں کی شرح اور ایسی تحقیقی خدمات انجام دی ہیں کہ عربی ادب کے اسکالروں اور شائقین کو غیر ہندوستانی علماء اور محققین اور متقدمین کی تحقیقات اور شروحات سے بے نیاز کر دیا۔'' (ص۱۰۰)

اس ضمن میں آپ نے بطور خاص ہندوستانی محقق شیخ عبدالعزیز میمنی کی علمی، تاریخی، ادبی، تحقیقات وتعلیقات کو خراج تحسین پیش کیا ہے کیونکہ ان کی کتاب ''سمط اللآلی شرح الآمالی'' اور ''ابوالعلاء ومالیہ'' کو عربوں کی علمی دنیا میں جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ مثالی ہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ اگر انسان کی تربیت نہ ہو تو وہ معاشرے کے لئے قطعی مفید نہیں ہوتا۔ موجودہ مغربی نظام تعلیم حصولِ تعلیم پر تو راغب کرتا ہے لیکن اس میں تربیت کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نظام تعلیم ''تربیت'' کے بنا مکمل نہیں ہوتا۔ مولانا نے اس پہلو پر بطور خاص توجہ مبذول کی ہے اور ''اسلامی نظام تربیت کے اثرات'' سے ایک باب میں ''انسان کے متعلق مغرب کا تصور'' اور اس کے نظام تعلیم وتربیت'' کا موازنہ ''انسان کے متعلق اسلام کا تصور'' سے کرتے ہوئے سورۂ اسراء کی آیت نمبر ۷۰ ''ولقد کرمنا بنی آدم'' الیٰ اٰخرہ، سے ثابت کیا ہے کہ ''اسلام انسان کو حیات بخش سرگرمیوں کی اجازت دیتا ہے، اسے غور وفکر، تدبر اور وسائل زینت اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ حق آزادی سے بھرپور صحیح فائدہ اٹھانے پر ابھارتا ہے اور انسان کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی جسمانی وعقلی صلاحیتوں اور روحانی طاقتوں کو انسان کی خدمت، اس کی عزت وشرافت کی حفاظت جیسے اعلیٰ اور بلند مقاصد میں استعمال کرے نہ کہ محدود بشری تقاضوں میں جن میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا کھانا، پینا، اوڑھنا اور نفسانی خواہشات کی تکمیل یہ تو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کل مقصد حیات نہیں''۔(ایضاً،ص۱۱۰)۔

اسلام کا نظام تربیت بے انتہا متوازن ہے۔ اسے آپ نے

قرآن مجید کی متعدد آیات سے ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام شعور اور عقیدے کی تربیت کا فریضہ انجام دے کر انسان کو ایک مثالی انسان بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو تمام عالم انسانیت کو فیض پہنچاتا ہے۔

''ثقافتی پروگرام اسلامی تناظر میں'' کے عنوان سے معنون باب میں آپ نے وضاحت کی ہے کہ اسلام نے تفریح اور دل بستگی کو انسانی ضرورت قرار دیا ہے لیکن اس کے کچھ حدود متعین کئے ہیں۔ اسلام میں اس کا جو تصور پایا جاتا ہے، آپ نے اس کو بھی پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''اسلام نے دلوں کو فرحت و مسرت کے لئے جائز امور و وسائل کو اپنانے کی دعوت دی ہے۔ اسلام نے تیر اندازی، جہاز رانی اور گھوڑ دوڑ کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس ضمن میں آپ نے قدماء کی آراء پیش کرتے ہوئے ''وسائل تفریح طبع کے فوائد،'' ''مغرب کا تصور تفریح،'' ''موجودہ کھیل،'' ''تفریح کا دائرہ،'' ''وسائل ابلاغ کی شرانگیزی،'' ''ذہنی تشکیل کے وسائل میں فاسد عنصر'' کے ذیلی عناوین کے تحت جائزہ لیا ہے اور اس میدان میں اسلام کے معتدل رویہ کو پیش کیا ہے۔

کتاب کے آخری باب ''نصاب تعلیم سے زہر آلود مواد کے ازالہ اور عمدہ نصاب تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت'' پر آپ نے اپنی اس کتاب کا ماحصل پیش کیا ہے جس میں آپ نے مشرق و مغرب کے درمیان ''اختلاف اور امتیاز'' کو ایک خاص فلسفہ حیات اور تصور زندگی پر مشتمل مانا ہے۔ جس میں مغربی فلسفہ حیات کے دائرہ اثر کے پس پشت ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ان خطرات و اندیشوں سے بھی باخبر کیا ہے جو مستقبل قریب میں ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں۔ آپ نے اس کے مقابلہ کے لئے نئی نسل کے ذہنوں کو بیدار کرتے ہوئے اس اپیل پر کتاب کو ختم کیا ہے کہ:

''اس لئے حالات کا تقاضا ہے کہ نوخیز بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کے لئے نہایت مؤثر و دل آویز اور دلچسپ ادبی کتابیں تصنیف کی جائیں۔ درحقیقت یہ صرف عرب دنیا کا مسئلہ نہیں، بلکہ پوری اسلامی دنیا کا مسئلہ ہے، ہندوستان کے نصاب تعلیم میں بھی شدت سے ہمیں اس کمی کا احساس ہے۔ صرف درسی کتابوں کی تہذیب و تنقیح، نصاب تعلیم سے زہر آلود مواد کا ازالہ اور عمدہ نصاب تعلیم مرتب کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ثقافتی میدان میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ (ایضاً، ص ۱۳۶)

مولانا مرحوم کے چند عربی مضامین کے ترجمہ پر مشتمل جس کتاب کا جائزہ راقم نے سطورِ بالا میں لیا ہے، اس سے مولانا مرحوم کی ملی حمیت، غیرت اسلامی، تعلیم کے تئیں فکرمندی، ملت اسلامیہ کی تعمیر و ترقی کے مثبت ارادے، مغربی سازشوں سے باخبری اور نئی نسل کو ان سے واقف کرانا جیسی بہت سی جہات کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا کی سیاسی، سماجی، ادبی، تہذیبی و مذہبی تحریروں میں بھی اس بات کی جھلک صاف طور سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ مولانا کے اندر ایک تڑپ تھی کہ کسی طرح ملت اسلامیہ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانے اور اپنی ثقافتی و علمی سرگرمیوں سے ظلمت کدۂ جہاں کے اندھیاروں کو دور کر کے حقیقی علم کے نور سے منور کرے تاکہ دنیا جان لے کہ مغرب نے جس ''شمع علم'' کا غلغلہ بلند کیا ہوا ہے وہ فی الحقیقت بے نور ہے اگر اس کی پیروی کی گئی تو انسانیت کو تباہی سے روکنے کی کوئی سبیل نہیں ہے، اس کا مظاہرہ ماضی میں بھی ہوا ہے، حال میں بھی ہو رہا ہے اور مستقبل میں بھی ہوتا رہے گا۔

مولانا مرحوم کے اچانک داغ مفارقت سے علمی و فکری دنیا میں جو خلا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کرے اور مولانا کی آرزوؤں و امیدوں کو پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ آج مولانا واضح رشید صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تحریروں کا بیش قیمت سرمایہ ہمارے سامنے ہے جو ہمیں دعوتِ عمل دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جزائے جزیل سے نوازے۔ آمین۔ شاعر نے ایسے ہی افراد کے لئے کہا ہے کہ ؎

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں جن کے دہر سے نشاں کبھی

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی تحریروں میں قرآنی فکر

ڈاکٹر محمد مبین سلیم ندوی ازہری
اسسٹنٹ پروفیسر، خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تمہید:

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی برصغیر ہندو پاک کے معروف ادیب، مشہور دانشور، اسلامی مفکر، عالم دین اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے مؤقر استاذ کی شخصیت قرآنی تعلیمات کا نمونہ تھی۔ آپ کی تحریریں قرآنی فکر کی عکاسی کرتی ہیں۔ مولانا کی تمام تحریروں میں قرآنی فکر پائی جاتی ہے۔ تاحیات مولانا قرآنی فکر کے داعی، معلم اور حامی رہے۔ تربیت وتعلیم کے میدان سے لے کر ذرائع ابلاغ اور عالمی فکری وسیاسی دنیا تک ہر خانہ میں قرآنی فکر کی آبیاری کرتے رہے یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحات قرآن اور اس کی خدمت پر پورے ہوئے۔ اللہ تعالی مولانا کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ رضا کا پروانہ عطا فرمائے۔ آمین۔ مولانا کی قرآنی فکر کو خود آپ کی منتخب تحریروں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ پوری شخصیت قرآنی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آسکے اور قرآنی تصویر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پڑھنے والا خود معترف ہو جائے۔

۱۔ اسلام مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں۔ ترجمہ وتشریح: محمد سالم سولنکی۔ صفحات ۴۸۔ ناشر: دار الرشید لکھنؤ۔ سن طباعت ۲۰۱۶ء۔

قرآنی فکر اور کتاب: یہ کتاب اگر چہ احادیث نبوی کی روشنی میں تصنیف کی گئی ہے مگر اس کے پیچھے قرآنی فکر کارفرما ہے بلکہ پورا خاکہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے جیسا کہ خود مصنف کتاب حضرت مولانا واضح رشید صاحب ندویؒ نے پیش لفظ میں تصریحا تحریر فرمایا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدۃ:۳)۔ سورہ مائدہ کی اس آیت پر غور کر کے میرے ذہن میں ایک نقشہ آیا جو خود قرآن کریم کی آیت سے ماخوذ ہے: الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء، تؤتی اکلها کل حین باذن ربها (سورہ ابراہیم: 24-25) میں نے اسلام کو ایک شجر (درخت) تصور کیا پھر اس کی تعلیمات کو جو زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ہیں شاخیں تصور کیا اور اس کا نقشہ بنایا اور اس کے مطابق حدیثوں کو جمع کیا، جو زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق ہیں، اب اگر ان سارے شعبوں کو جمع کیا جائے اور اسلام کامل وجود میں آجائے تو اس کی مثال شجر کی طرح ہوگی۔ جو ہر دور میں خدا کی مدد اور حکم سے پھل دے گا اور تؤتی اکلها کل حین باذن ربها کا مصداق ہوگا۔ اس دور میں ہماری کوششوں اور اسلامی تحریکات کی ناکامی کا سبب اسلام کامل کا نمونہ پیش کرنے میں تقصیر ہے۔ ہم نے چالیس احادیث کا انتخاب اسی تصور کی بنیاد پر کیا'' (۱)۔

۲۔ مسئلہ فلسطین سامراج اور عالم اسلام۔ صفحات ۴۰۔ ناشر: دار الرشید لکھنؤ۔ سن اشاعت ۲۰۱۱ء۔

قرآنی فکر اور کتاب: یہ کتاب اگر چہ تاریخی اور فکری حقائق کی روشنی میں لکھی گئی ہے لیکن استعماری اور اسلام دشمن طاقتوں کا ایک ساتھ متحد ہونا اور فلسطین کو آزاد نہ ہونے دینے کو مولانا نے بہت ہی

خوش اسلوبی کے ساتھ قرآن کریم کی اس آیت کی روشنی میں پیش کیا اور اس جیسے مسئلہ کو بھی قرآنی فکر میں رنگ دیا، مولانا تحریر فرماتے ہیں:"یہودی مکروفریب ایک حقیقت ہے،لیکن اس مکروفریب،عیاری ومکاری سے یہودی کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھا سکے، نہ وہ کبھی غالب قوم رہے، ہمیشہ مارے مارے پھرے،دنیا میں کہیں انہیں عزت اور سربلندی حاصل نہیں ہوئی، اگر مکر سے کسی کو فائدہ پہنچتا تو مکار آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا، بلکہ ایسا نہیں،قرآن مجید کہتا ہے:وقد مکروا مکرهم وعند الله مكرهم وان كان مكرهم لتزول منه الجبال (سورہ ابراہیم:46) تو مکر سے کچھ نہیں ہوتا''(۲)۔

۳۔محسن انسانیت۔صفحات۲۱۶۔ ناشر: دار الرشید لکھنؤ۔سن طباعت۲۰۱۲ء۔

قرآنی فکراور کتاب: یہ کتاب حقیقت میں فکری اعتبار سے عکس قرآنی ہے،اول تا آخر تمام مضامین قرآنی فکر سے ماخوذ ہیں چونکہ اس کا عکس قرآنی ہونا بیت واضح ہے، اس لیے مثالوں کو قلم زد کرتا ہوں(۳)۔

۴۔نظام تعلیم وتربیت اندیشے،تقاضے اور حل۔صفحات۱۳۶۔ ناشر: دارالرشید لکھنؤ۔سن طباعت۲۰۱۳ء(۴)۔

قرآنی فکراور کتاب: یہ کتاب اگرچہ ایسے موضوع پر ہے جہاں قرآن سے استدلال مشکل سے کیا جاتا ہے مگر مولاناؒ مغربی استعمار اور فکری یلغار پر تجزیہ کرتے ہوئے اس طرح قرآنی فکر کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ''مغربی ممالک کی سرکاری مشنریاں عیسائیت کی اشاعت کے سلسلہ میں فعال ہیں۔اکثر ملکوں میں دعوت اسلامی کا کام کرنے والے پابندیوں کا شکار ہیں،اخلاقی ودینی تربیت کرنے والوں کو آزادی حاصل نہیں،سرکاری حلقوں کی طرف سے ان کی سرگرمیوں کو علیحدگی پسندی، بنیاد پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ فساد پھیلانے والے مغرب زدہ لوگ اصلاح پسند کہلاتے ہیں۔قرآن انہی جیسے لوگوں کے لیے کہتا ہے:انهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون (البقرۃ) فتنہ پرور تو خود یہی ہیں لیکن ان کو علم وشعور نہیں''(۵)۔

دوسری جگہ مولانا تباہ کن رجحانات کا حل پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:''دین واخلاق انسان کے باہمی ربط اور انسانی بھائی چارہ کا سب سے پائیدار ذریعہ اور انسانیت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہیں۔دنیا میں دین ہی وسیع اتحاد اتفاق کا سبب رہا ہے اور دین کے میدان سے ہٹنے کے بعد ہی یہ تنگ اور چھوٹے چھوٹے دائرے وجود میں آئے ہیں۔آج یورپ اسلام اور مسلمانوں اور غیر ملکوں میں مقیم عربوں سے خوف وخطرہ محسوس کررہا ہے،اور اسلامی پیش قدمی کو روکنے کے لیے فکرمند ہے۔اس لیے کہ وہ محض سیاسی یا قومی نقطۂ نظر سے دیکھتا اور سوچتا ہے۔اس نے اسلام کی حقیقت اور تعمیر اخلاق میں اس کے کردار کو نہیں سمجھا ہے۔حقیقتا اسلام اور مسلمان انسانیت یا تہذیب کے لیے خطرہ نہیں ؛ بلکہ انسانی وحدت کی صلاحیت رکھتے ہیں جس میں انسانیت احترام وشرف قائم رہتا ہے، اس کے برابر کوئی دوسری وحدت نہیں اور اسلام کی طرف واپسی ہی ان بحرانوں(۶) کا واحد حل ہے جو آج انسانیت کے لیے خطرہ ہیں،اسی لیے مختلف جماعتوں اور گروپوں میں دینی واخلاقی روابط کو مستحکم کرنا ضروری اور دینی بیداری پیدا کرنا لازمی ہے جو انسان کو اس کی ذمہ داری اور زندگی میں اس کے کردار ومقام کی تعلیم دیتے ہیں''(۷)۔

۵۔الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھا فی العصر الحدیث۔صفحات۹۶۔ ناشر: دارالرشید لکھنؤ۔سن طباعت۲۰۱۶ء۔

قرآنی فکراور کتاب: حجاز کے سفرناموں جیسی کتاب بھی قرآنی فکر واستدلال سے خالی نہیں، چونکہ مولانا کی تحریر وفکر پر قرآنی فکر کا غلبہ اس طرح تھا کہ وہ ہر موضوع کو قرآنی فکر سے معطر کردیتے تھے،مولانا لکھتے ہیں:

وقد أشار القرآن الكريم إلى هذه الرحلة فى سورة مستقلة:"لايلف قريش، الفهم رحلة الشتاء والصيف، فليعبدوا رب هذا البيت الذى اطعمهم من جوع وآمنهم من خوف(القريش: 1—4) وذكر القرآن الكريم رحلات كثيرة ووصف مشاهدها كرحلة موسى عليه

السلام للقاء خضر عليه السلام، وهى رحلة علمية،ورحلته لدى خروجه من مصر خائفا يترقب ، ورحلة إخوة يوسف إلى مصر فى طلب الرزق، ورحلة سليمان عليه السلام، ورحلة ذى القرنين، وتشتمل جميع هذه الرحلات على صور بيانية مؤثرة"(۸).

دوسری جگہ حجاز کے رحلات پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن کریم کے اسلوب کو یوں پیش فرماتے ہیں:

"وقد وصف القرآن الكريم هذه الرحلة بأسلوبه المعجز فقال: وأذن فى الناس بالحج يأتوك رجالا وعلى كل ضامر يأتين من كل فج عميق ليشهدوا منافع لهم ويذكروا اسم الله فى ايام معلومات على ما رزقهم من بهيمة الانعام، فكلوا منها واطعموا البائس الفقير، ثم ليقضوا تفثهم وليوفوا نذورهم اليطوفوا بالبيت العتيق، ذلك ومن يعظم حرمت الله فهو خير له عند ربه (الحج:۲۷، ۳۰) (۹)۔

۶۔تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ۔صفحات ۱۵۱۔ناشر:دارالرشید لکھنؤ۔سن طباعت ۲۰۰۹ء۔

قرآنی فکر اور کتاب:عصر حاضر میں مغربی تہذیب وثقافت نے مسلمانوں خاص طور سے مسلم نوجوانوں کے ذہن ودماغ کو متاثر کیا یہاں تک وہ اس احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے کہ یہی تہذیب ہے جو ترقی وفلاح بہبود کی ضامن ہے۔اسلامی تہذیب وثقافت تو از کار رفتہ ہے۔اپنی تہذیب سے غفلت اور مغربی افکار کے غلبہ نے خود اپنی تہذیب سے اعتماد کو ختم یا کمزور کردیا۔لہذا مولانا کی غیرت ایمانی نے اس کتاب پر آمادہ کیا۔مولانا نے اس میں ربانی درد،قرآنی فکر،کتاب وسنت سے پیدا شدہ اسلامی تہذیب کو اس اسلوب سے پیش کیا کہ یہ کتاب اسلامی تہذیب وثقافت پر اعتماد کو بحال کرنے ، اس کے امتیازات کو بیان کرنے، اسلامی تاریخ کے مختلف مراحل، ازمنہ، اماکن،اوقات اور پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔یہ قرآنی فکر سے ماخوذ اسلامی فکر کے اعادہ کی کامیاب کوشش ہے۔اسی کے ساتھ یہ کتاب مغربی تہذیب کی کمزوری، خیرہ کردینے والی فکری و ثقافتی حملہ کی حقیقت کا پردہ فاش کرتی ہے اور اس سے دنیا پر منڈلاتے خطرات سے آگاہ کرتی ہے۔یہ وہ فکری جہاد ہے جو مولانا نے بہت حسن اسلوبی سے ادا کیا اور امت اسلامی کو فکری انحراف اور ثقافتی ردت سے حفاظت کا وسیلہ مہیا فرمایا۔یہی مولانا کا مقصد عظیم تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے،آپ نے تحریر فرمایا:

"وطالعت هذا الموضوع فى الكتب المقررة لهذا الموضوع، فوجدت فى عرض هذا الموضوع إجحافا بالنسبة لدور الإسلام فى تكوين الثقافة العربية، ودور غير العرب فى تنمية وتطوير وإثراء الثقافة العربية، فقد امتد الحكم الإسلامى فى القرن الأول إلى مناطق واسعة فى إفريقيا، وآسيا، وأوربا وكان للحاكم والعلماء والدعاة فيها إسهام كبير فى توسيع هذه الثقافة، وجعلها جزءا من الحضارة العالمية الكبرى، فقمت بإبراز إسهامات الأمم الأخرى فى إثراء الحضارة العربيةِ مع الاعتراف بفضل العرب واللغة العربية، وهذه هى محاضرات كنت ألقيتها على الطلاب فى المرحلة العالمية، فقمت فيها بالتعريف بحضارة الإسلام وعرض تاريخ موجز لنشأتها ودورها فى توجيه الإنسانية، وما كان للمسلمين من دور فى نشر العلم، والابداع فى الفن، وإنشاء نظام سياسى واجتماعى متسامح عادل، والتزمت الاختصار والعرض السريع بغرض أن يعرف طلاب المدارس الإسلامية تاريخهم المجيد الذى دام أكثر من ألف سنة، ودورهم فى إنقاذ الأمم وقيادتهم. فإن غلبة الحضارة الغربية المادية اليوم قد طغت وسحرت أعين النفوس، ويجهل الشباب المسلم روائع حضارة

الإسلام ودورها فی بناء الحضارة الغربية. وقد أضيف إلى المذكرات بعض الفصول ليستفيد بها عامة القراء، وخاصة ما يتعلق بالهند ودور حكامها المسلمين وعلمائها فی نشر الثقافة الإسلامية" (١٠).

دوسری جگہ اسلامی ثقافت کے عناصر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "فتتكون الثقافة الإسلامية من العناصر الرئيسية الآتية: العنصر الأول: هو عنصر التعاليم الإسلامية من العقيدة إلى المعاملات والسلوك" (١١)

تیسری جگہ قرآنی عالمی فکر کی اس طرح نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں: "نشأت الثقافة الإسلامية كثقافة عالمية تحمل خيرات أمم أخرى، وارتفعت عن الاقليمية والطائفية والجمود الفكرى" (١٢)

مولاناؒ نے اسلامی ثقافت کی جو خصوصیات ذکر فرمائی ہیں وہ قرآنی فکر کی مکمل عکاس ہیں۔ قرآن کی آیات پیش کرنے سے تفصیل ہوگی۔ ہماری کتاب حسن اخلاق میں مماثل عناوین کے تحت مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل فقرہ میں صرف امتیازات کو مولانا کی عبارت ہی میں پیش کیا جاتا ہے:

"تتميز الثقافة الإسلامية التی تستمد أصولها من التعاليم الإسلامية المقتبسة من القرآن الكريم والسنة النبوية وحياة الجيل الأول من المسلمين الذی نشأ فی التربية النبوية وما أضافه المسلمون من الأمم الأخرى بالخصائص الآتية:

١۔ الثقافة الإسلامية: تتميز بالأخوة بين المسلمين باختلاف ألوانهم وديارهم وألسنهم.

٢۔ الثقافة الإسلامية: تسعى إلى تحقيق صالح البدن، وتغذية الروح، وتجمع بين خير الدنيا والآخرة.

٣۔ الثقافة الإسلامية: ترعى حقوق الفرد والجماعة، ولا تطغى حقوق الفرد فيها على حقوق الجماعة ولا العكس.

٤۔ الثقافة الإسلامية: ثقافة إنسانية لا تتعصب، وتحترم الأديان والعقائد الأخرى، وتكفل حقوق اتباعها فيعيش فی ظل المجتمع متيعوا الثقافات الأخرى باحترام.

٥۔ الثقافة الإسلامية كالإسلام ثقافة الاعتدال والتوسط، وتؤكد على التمسك بالفضائل، والابتعاد عن الدنايا، والمحافظة على العرض والشرف وكرامة الفرد، وتسد منافذ التصرفات الشهوانية، وتعتبر الأصول الأخلاقية ثابتة دائمة باختلاف البيئات والأزمنة.

٦۔ الثقافة الإسلامية: تدعو إلى وحدة الجنس البشرى وتنبذ الانفصام والتفرق على أساس اللون أو الجنس، وهی ثقافة تتوسع وتمتد، والا تضيق ولا تنكمش ولا تؤمن يتفرق جنس أو عنصر على الآخر.

٧۔ الثقافة الإسلامية: تدعو إلى التوسع فی المعرفة والعلم، والتفكير والتدبر فی خلق الله وآياته، وتعتبر الثقافة الإسلامية السعی إلى تحصيل العلم، وتعمير الأرض، وخدمة الإنسان عبادة من أفضل العبادات، وتجعل الراعی والحاكم مسئولاً عن رعيته، وتعين حقوقا للرعية للطاعة والانقياد وعدم النشرذم والافتئات، وبفضل هذا الموقف الحر إزاء العلم والتعميم فيه، نشأت حركة علمية فی العصر الأول تركت تراثا غنيا فی جميع مجالات العلم، وشاركت فی هذه الحركة العلمية عناصر مختلفة بمساواة، وأقام المسلمون نظام حكم عظيم امتد من الشرق إلى الغرب، واشترك فيه عناصر عالمية مختلفة فنشأت حضارة عالمية دامت قرونا، وغطت أرجاء واسعة من العالم،

فكانت هذه الحضارة منطلقا للحضارة الأوربية المعاصرة، التى اقتبست من المسلمين فى العلم والسياسة والاجتماع. (١٣)۔

٨۔ أدب الصحوة الإسلامية۔ صفحات ١١٦۔ ناشر: دار الرشید، لکھنؤ۔ سن طباعت ۲۰۰۹ء

قرآنی فکر اور کتاب: مولانا اس کتاب میں قرآنی فکر کو پیش کرتے ہوئے استعماری قوتوں کے سوچنے کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں (۱۴):

إن أخوف ما كان يخافه المستعمرون هو قوة الشعور الدينى الإسلامى، لأن الإسلام دين يدعو إلى العزة والكرامة، ويأبى على المسلم أن يخضع لسواه، وأن يذل، وفى يقظة الشعور الدينى استرجاع لماضى هذه الأمة المجيد، وكان هذا الشعور مرتبطا باللغة، والتاريخ، والثقافة، وقد جرب المستعمرون أن الحروب التى شنوها إضعاف الشعور الدينى والارتباط بالماضى، واستهواء المشعب المسلم بالمغريات المادية، والخلقية، وفى الوقت نفسه تلقينهم بأن ضعفهم وانحطاطهم يرجع إلى ارتباطهم باللغة. والدين، والثقافة الشرقية، فوجهوا سائر طاقاتهم إلى الطعن فى اللغة العربية الفصحى، والثقافة الإسلامية، وتشوية سمعة رجال الدين، والحط من شأنهم.

اسی طرح مولانا جمال الدین افغانی کی اصلاحی کوششوں کو بیان کرنے کے بعد ان کے شاگردوں کے فکری انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (۱۵):

فقد وفق السيد جمال الدين إلى حد كبير فى إحداث ثورة فكرية، واستفز القلوب، وكل من اتصل به أخذ قبساً من اللهيب الذى كان يتلظى فى قلبه للإسلام والمسلمين والتلهف على التردى والانحطاط الذى وصل إليه المسلمون، ولكن الظروف التى عاناها من المطاردة، والشرود من بلد إلى بلد وعدم استقراره فى بلد لم تمكنه من تربية أتباعه فاقتبس أتباعه من حرارة قلبه لكنهم سلكوا مسالك متعددة وأحيانا متناقضة ومعكوسة لتحقيق ذلك الهدف وكان من المفارقات الغريبة أن أقرب أتباعه وهو المفتى محمد عبده انحرف إلى ولاء بريطانيا، ولجأ إلى تأويل النصوص عقليا وفتح الأبواب على مصراعيها للاختلاط بعلماء الغرب، والاستفادة منهم علميا وفكريا، وجاء بعده رجال لم يكونوا مثقفين بالثقافة الإسلامية، ولم يتربوا تربية دينية فظنوا أن التقدم لا يتحقق إلا باتباع طريق أوربا، فمالوا إلى محاكاة الغرب بما فيه من محاسن السياسى، أما على المسرح الثقافى والفكرى فأخذوا ببريق الحضارة الغربية، وصبت سائر هذه الطاقات التى ولدها الأفغانى فى مصهر سياسى ذابت فيه مكونات الشخصية الإسلامية، إلا الجهود المنعزلة الفردية للعلامة السيد رشيد رضا، وشكيب أرسلان، محب الدين الخطيب، وقد بعث انحراف أتباع الأفغانى إلى تقليد الغرب لتقدم العالم الإسلامى ولو بالانسلاخ من الحضارة الشرقية الشكوك فى نفوس عدد من المفكرين فى حركة الأفغانى ونوايا الحقيقية، فإن صلة أقرب تلامذته المفتى محمد عبده بالانجليز وجهوده لتوطيد أركانهم ونشر أفكارهم وتأويل النصوص إلى حد التحريف وثقة الإنجليز فيه، كل ذلك علامات سؤال يجار الفكر الإسلامى الحديث فى الرد عليها.

٩۔ إلى نظام عالمى جديد۔ صفحات ٣٢٧۔ ناشر: المجمع الاسلامی العلمی، لکھنؤ، سن طباعت ۲۰۱۲ء۔

قرآنی فکراور کتاب: یہ اہم کتاب اصلا فکری کتاب ہے جس میں مولانا نے مغربی تہذیب کے عناصر، اسلام مخالف پروپیگنڈے، مغربی منصوبہ بندی پر عمل کا انجام بیان کرنے کے بعد تمام پریشانیوں سے نجات کا راستہ بتایا ہے اور وہ ہے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع۔ اصلی اسلامی سوسائٹی کی تشکیل اور معتدل اسلامی شریعت کی روشنی میں جدید علمی عناصر سے استفادہ (۱۶) اور یہ وہ فکری بنیاد ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔

نتیجہ بحث:

مولاناؒ کی مذکورہ تحریروں سے پیش کیے گئے نمونے واضح طور پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ کی فکر قرآنی فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہر تحریر قرآنی تعلیمات کی غماز ہے۔ ہر ادبی شہ پارہ قرآن سے مربوط ہے۔ ہر فکری پیش کش قرآنی احکامات کا نچوڑ ہے۔ مغربی تہذیب پر نظر اور اس پر تنقید قرآن کریم کے اسلوب عرض مخالف سے مستعار ہے۔ عصر حاضر کے سیاسی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی، فکری، قومی، ملی، اقلیتی اور اکثریتی مسائل کا حل مولانا کی کتابوں میں فکر قرآنی سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالی مولانا کو دونوں جہاں میں جزائے خیر دے۔ آمین

وصلی اللہ تعالی علی حبیبہ محمد وآلہ واصحابہ۔

حواشی ومراجع:

(۱)۔ندوی، واضح رشید، مولانا، اسلام مکمل نظام زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۶ء، ص:۱۰۔

(۲)۔ندوی، واضح رشید، مولانا، مسئلہ فلسطین سامراج اور عالم اسلام، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۱ء، ص:۷۔

(۳)۔ ندوی، واضح رشید، مولانا، محسن انسانیت، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۲ء، ص:۳۹-۴۱۔

(۴)۔اس کے مثل مولانا کی عربی کتاب حرکۃ التعلیم الاسلامی وتطورالمنہج بھی ہے۔

(۵)۔ندوی، واضح رشید، مولانا، نظام تعلیم وتربیت اندیشے، تقاضے اور حل، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۳ء، ص:۵۸۔

(۶)۔جیسے خودغرضی، خودپرستی، انانیت، عصبیت، خاندانی، نسلی یا قومی تفریق، بغض ونفرت، قتل و غارت گری، قومیت، فرقہ واریت، علاقائیت، علیحدگی پسند یا دہشت پسند تحریکات وتباہ کن رجحانات وغیرہ۔ ملاحظہ ہو: ندوی، واضح رشید، مولانا، نظام تعلیم وتربیت اندیشے، تقاضے اور حل، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۳ء، ص:۵۹-۶۱۔

(۷)۔ندوی، واضح رشید، مولانا، نظام تعلیم وتربیت اندیشے، تقاضے اور حل، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۳ء، ص:۶۱-۶۲۔

(۸)۔ندوی، واضح رشید، الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھا فی العصر الحدیث، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۶ء، ص:۱۷۔

(۹)۔ندوی، واضح رشید، الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھا فی العصر الحدیث، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۶ء، ص:۱۹۔

(۱۰)۔ندوی، واضح رشید، الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھا فی العصر الحدیث، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۶ء، ص:۹-۱۰۔

(۱۱)۔ندوی، واضح رشید، الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھا فی العصر الحدیث، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۶ء، ص:۲۵۔

(۱۲)۔ندوی، واضح رشید، الرحلات الحجازیۃ ومناھج کتابھا فی العصر الحدیث، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۱۶ء، ص:31۔ مزید نظائر کو دیکھنیکے لیے ملاحظہ ہو: ص:۳۲، ۳۳۔

(۱۳)۔ندوی، واضح رشید، تاریخ الثقافۃ الإسلامیۃ، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۰۹ء، ص:۳۴-۳۵۔

(۱۴)۔ندوی، واضح رشید أدب الصحوۃ الإسلامیۃ، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۰۹ء، ص:۳۹-۴۰۔

(۱۵)۔ندوی، واضح رشید أدب الصحوۃ الإسلامیۃ، لکھنؤ: دارالرشید، ۲۰۰۹ء، ص:۴۲-۴۱۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: ص:۹۴-۹۵

(۱۶)۔ ندوی، واضح رشید إلی نظام عالمی جدید، لکھنؤ: المجمع الاسلامی العلمی، ۲۰۱۲ء، ص:۱۰۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: فصل ثانی۔

☆☆☆

نظام تعلیم وتربیت-ایک مطالعہ

کمال اختر قاسمی
ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

دنیا کی تمام قوموں اور تمام افکار ونظریات کا اتفاق ہے کہ تعلیم انسانی زندگی کا وہ لازمہ ہے جس کے بغیر صالح اور بامقصد زندگی گذارنے والے ذمہ دار شہری کو تیار نہیں کیا جاسکتا ہے، تعلیم صرف پڑھنے لکھنے تک محدود نہیں ہے، بلکہ نسلوں کی تعمیر وترقی اور بامقصد تشکیل کیلئے کی جانے والی انفرادی واجتماعی جدوجہد کو تعلیم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اللہ کے آخری رسول ﷺ نے عرب کے گھٹاٹوپ تاریک ماحول میں جب علم کی شمع روشن فرمائی تو عربوں کو نہ صرف ان معلومات سے واقف کرایا جن سے وہ بے بہرہ تھے، بلکہ انہیں تہذیب وتمدن کے بلند ترین منصب پر فائز کیا۔

چنانچہ مسلمان ابتدا سے ہی تعلیم کو زندگی کا لازمی جز سمجھنے لگے، پہلی وحی میں ہی انہیں تعلیم کی طرف ابھارا گیا اور متعدد آیات و احادیث کے ذریعہ تعلیم کی اہمیت وضرورت مسلمانوں کے قلب ودماغ میں نقش کی گئی، جس کا اثر مسلمانوں پر یہ ہوا کہ حصول علم کے لئے انہوں نے ہر ممکن جدوجہد کی یہاں تک کہ وہ علوم وفنون کے خالق بن گئے، ہر طرف مسلمانوں کے علوم ومعارف، اور ایجادات واکتشافات کا لوہا مانا جاتا تھا، سیاسیات واقتصادیات سے لے کر فلکیات اور طبی و سائنسی دنیا کے امام بن گئے۔

آگے چل کر مسلمانوں میں عہدہ ومناصب کے لئے خانہ جنگیاں شروع ہوئیں، پھر مذہب وسیاست کی تقسیم، مذہبی گروہ بندیاں، مسالک ومشارب کی شدت پسندی، ان سب فتنوں نے مسلمانوں کو تحقیقات و اکتشافات کے میدان سے ہٹا کر جمود وتعطل کا شکار بنا دیا، اور غور وفکر کی صلاحیتوں کو پابند سلاسل کر دیا، ان کا دائرہ غور وفکر مسلک ومشرب کو پروان چڑھانے اور ایک دوسرے کی تردید وابطال میں محدود ہوگیا، ادھر مغرب کی محنت ولگن، تلاش وجستجو جاری رہی، انسانی زندگی سے متعلق تمام شعبے کسی طرح کے مد مقابل سے خالی تھے، چنانچہ جدید تحقیقات و اکتشافات کے ذریعہ مغرب کو سیاسی، عسکری، اقتصادی ہر طرح کی برتری حاصل ہوگئی، یہاں تک کہ بلاد اسلامیہ بھی مغرب کے پنجہ استبداد میں چلے گئے، مغرب نے اپنی نو آبادیات میں بہت سی تبدیلیاں کیں، ان میں بھیانک بدلاؤ یہ تھا کہ مسلمانوں کے تعلیمی وتہذیبی اداروں کو جدید ترقیات اور معاشی دھاروں سے الگ کر کے ان کی جگہ مغرب کے ترجمان ادارے قائم کئے گئے، ملک کے معاشی وانتظامی دھاروں میں شامل ہونے کے لئے ان اداروں سے استفادہ کرنا لازمی قرار دیا گیا، دیکھتے ہی دیکھتے دنیا مغربی نظام تعلیم کو قبول کرنے پر مجبور ہوگئی، اور مغربی نظام تعلیم زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوگیا۔

دوسری طرف مسلمانوں کا قدیم نظام تعلیم ہے جس کا دائرہ مذہبی احکام وفرائض اور اخلاقیات تک محدود ہے، مادی ضروریات اور دنیاوی تقاضوں کی تکمیل کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے ان سے اس نظام تعلیم کو کوئی سروکار نہیں۔

ان دونوں انتہا پسند تعلیمی نظریات نے ثنویت کی جڑ کو بہت زیادہ مضبوط کر دیا، جس کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا ذی شعور طبقہ مذہبی اور غیر مذہبی، دین دار اور دنیا دار دو متضاد حصوں میں منقسم ہوگیا۔ اس تفریق سے اسلام کے اس بنیادی تصور کو سخت نقصان پہنچا جس میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلام دین ودنیا کا جامع ہے، ساتھ ہی اس افترا اور الزام کو تقویت ملی کہ اسلام انسانی زندگی کے تمام ضروری شعبوں میں روہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔ کیوں کہ دینی عناصر سیاست ومعیشت، طب، سائنسی تحقیقات واکتشافات کو دنیاوی اور غیر دینی قرار دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ان تمام علوم وفنون کا نہ یہ کہ طرف دار ہے بلکہ کائنات اور کائنات میں موجود تمام اشیاء کے مطالعے، غور فکر

اور بحث وتحقیق کا سختی سے مطالبہ کرتا ہے۔

رائج نظام تعلیم خواہ مغربی نظام تعلیم ہو یا قدیم نظام تعلیم مسلمانوں کی زبوں حالی کا مداوا نہیں کر سکتا، بلکہ ثنویت اور دوئیت کے جڑ پکڑنے اور اس کی جامد تقلید میں اضافہ ہوتے رہنے کی وجہ سے مسلمانوں کی زبوں حالی کے پردے مزید ثقیل ہوتے چلے جائیں گے، لہذا ایسے تعلیمی ماڈل کے لئے سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے، جس میں دونوں نظام تعلیم کی خوبیاں تو ہوں لیکن ان کے نقائص اور خامیوں کو چن چن کر نکالا جائے، تاکہ دینی ضرورت اور فکری شعور واحساسات کی تکمیل بھی ہو اور ایسے افراد تیار ہو سکیں جن میں اسلامی تعلیمات سے گہری واقفیت کے ساتھ جدید سیاسی وسماجی، معاشی واقتصادی اور سائنسی علوم کا ملکہ بھی ہو۔

بہت سے مسلمان ارباب دانش اور اصحاب قرطاس وقلم نے اس درد اور ضرورت کو سمجھا اور اس کے مداوا کے لیے اپنے افکار وشعور اور قلم کو جنبش میں لا کر نمایاں کردار انجام دیا۔

ان میں اہم نام حضرت مولانا واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ کا ہے، جن کے مقالات میں ان امور کا گہرا احساس کیا گیا ہے، مغربی نظام تعلیم سے انسانی معاشرہ میں پیدا ہونے والے بگاڑ کی طرف توجہ دلائی گئی، اور قدیم نظام تعلیم کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے نظام تعلیم سے دوئیت اور ثنویت کو ختم کرنے اور نئے نظام تعلیم کے لئے سرگرم ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

مغربی نظام تعلیم سے مسلمانوں کے ذہن ودماغ میں کس طرح فساد وبگاڑ پیدا ہوا، اس کے اسباب وعوامل کیا تھے؟ مولانا مرحوم نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، مغربی رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر ایمانی جڑوں کو کھوکھلا کرنے، انھیں روشن تاریخ اور شاندار ماضی کی طرف سے بدگمان کرنے کے لئے مخصوص تعلیم وتربیت کا طریقہ ایجاد کیا۔ ادھر مسلمانوں کے پاس جو نظام تعلیم تھا وہ ایمانیات، طہارت وغسل اور نماز وروزہ وحج کے علاوہ کسی بھی مادی شعبوں اور دنیاوی تقاضوں کی تکمیل کے لئے راہنمائی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے مسلمانوں نے مغرب کی طرف سے پھیلائے گئے تشکیکی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی طرز تعلیم کو اپنا لیا، جس نے مسلمانوں کے ذہن ودماغ میں فساد وبگاڑ پیدا کر کے تمام تر بداخلاقیوں کا عادی بنا دیا۔

مغربی نظام تعلیم کے سامنے مسلمانوں کا اس طرح گھٹنے ٹیکتے ہوئے استقبال کرنا مغرب کی طرف سے مسلمانوں پر فکری وثقافتی یلغار کا نتیجہ تھا۔

مولانا محترم نے سامراجی ممالک کی طرف سے مسلمانوں پر فکری وثقافتی یلغار کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا، مذکورہ کتاب میں مغربی سیاسی مفکرین کی آراء ونظریات کی روشنی میں سامراجیوں کی طرف سے مسلمانوں کے اوپر کئے جانے والے ثقافتی وتہذیبی حملوں اور اغراض ومقاصد کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مغربی قائدین پوری طرح یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ان کے سامراجی اغراض ومقاصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک مسلمانوں کا قرآن وحدیث سے تعلق نہ ختم کر دیا جائے''۔ (ص:۴۰)۔

مغرب کی طرف سے نظام تعلیم وتربیت کے راستے سے مسلمانوں پر کئے گئے ثقافتی وتہذیبی حملوں کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں نے نہ صرف مغربی نظام تعلیم وتربیت کو قبول کر لیا اور ان کی تحقیقات وانکشافات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے بلکہ یہی مسلمان مغربی تہذیب وثقافت کے داعی بن گئے، ساتھ ہی مغرب کی جامد تقلید کے اس قدر خوگر ہو گئے کہ وہ مغرب کی تحقیقات کو بدیات سے بھی زیادہ یقینی سمجھنے لگے، علم وتحقیق اور سائنسی ایجادات واختراعات میں مغرب کے تقدس پر ایمان لے آئے، اور خود کو پوری طرح مغرب کے حوالہ کر کے اس کی مشین بن گئے، مولانا محترم اس کوری تقلید کی تردید کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مغرب سے آنے والے علوم وافکار کی عظمت اور ان کے ساتھ عقیدت ونیاز مندی کا یہ مزاج عالم اسلام کے دورِ انحطاط میں سامراجی سایہ میں پیدا ہوا، سامراجی حکومت میں قائم ہونے والی تعلیم گاہوں اور تربیتی اداروں نے مغربی سیلاب میں آنے والے ہر خس وخاشاک کو لائق صد احترام بنانے میں نمایاں کردار انجام دیا، اور ذہنوں پر مغربی برتری کا ایسا گہرا اثر ڈالا جو حالات بدلنے کے بعد بھی ذہنوں سے نہیں نکل سکا۔ (ص:۴۵)۔

مولانا مرحوم نے مسلمان مقلدوں کو اس شعور کا احساس دلایا کہ مسلمان مغرب کی کتنی بھی تقلید کر لے وہ اس راستے سے اپنے مقتدیٰ کے برابر نہیں ہو سکتے، چنانچہ مغرب کی تقلید میں تہذیب وتمدن، کلچر وثقافت یہاں تک کہ ضمیر وایمان سب کچھ مغرب کے حوالہ کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کو مغرب کی پچھلی صف میں ہی جگہ ملی۔

جبکہ مغرب نے علوم وفنون مسلمانوں سے سیکھے، لیکن علوم وفنون

حاصل کرتے وقت کبھی بھی خود کو مسلمانوں کا ممنون کرم نہ سمجھا، اور نہ ہی مسلمانوں کی تقلید واتباع کیلئے تیار ہوا۔ بلکہ مغرب کی دماغی صلاحیتیں مسلمانوں کے خلاف ہی مصروف کار رہیں، اور بدلتی ہوئی انسانی زندگی اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے افکار ونظریات قائم کرنے، نئی ایجادات اور تحقیقات واکتشافات کے ذریعہ مسلمانوں کو زیر کرنے میں سرگرم عمل رہیں، یہاں تک کہ مغرب بہت ہی کم مدت میں مسلمانوں کی شاگردی کے دور کو پھاند کر استادی کے مقام پر فائز ہوگیا، جبکہ مسلمان ان کی شاگردی میں طویل مدت تک رہنے کے باوجود تقلید کا طوق گلے سے نہ اتار سکے، بلکہ تقلید کا پٹہ اور زیادہ ثقیل ہی ہوتا جارہا ہے۔

مولانا مرحوم اس تقلیدی طوق کو اتار پھینکنے کے لئے متعدد لائحہ عمل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقوام مشرق بالخصوص مسلمانوں کے اندر سے مغرب کے بارے میں تفوق و برتری کا احساس ختم ہونا چاہیے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خود پیش قدمی نہ کرے، مسلمانوں کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جس کو مغرب سے پوری واقفیت حاصل ہے اور مغربی علوم پر دسترس رکھتا ہے موجودہ اجتماعی حالات کی روشنی میں جائزہ لینے اور تمام علوم میں بحث وتمحیص کے لئے آمادہ ہوجائے، خصوصا نفسیات، اقتصادیات، اجتماعیات، سیاسیات، طبیعات اور زبان وادب میں پھر ان علوم کو غیر مفید اور غیر ضروری حصوں سے علحدہ کر کے ان کو صحت منداور مفید بنا کر ترقی دے''۔(ص:۵۳)

کتاب میں شامل ایک مقالہ ''تعلیم وتربیت کے قدیم وجدید عناصر'' ہے، جس میں قدیم وجدید عناصر تعلیم وتربیت پر گفتگو کی گئی ہے، فلسفہ اور مقصد تعلیم کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

عالم اسلام میں جو کشمکش اور ہنگامہ خیزی برپا ہے، اس کی بڑی وجہ مادہ پرستانہ نظام تعلیم کے پروردہ کی کثرت ہے، کیوں کہ عالم اسلام نے مغربی نظام تعلیم سے حاصل شدہ خود غرضانہ اور غیر اخلاقی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرلیا ہے، جبکہ ضرورت تھی کہ انہیں اسلامی تصور کے مطابق ڈھال کر غیر اخلاقی مواد کو ہٹایا جاتا، اور اخلاقیات کی روشنی سے منور کیا جاتا، نظام تعلیم کے ساتھ ذرائع ابلاغ کے تمام شعبوں کو جو طلبا اور نوجوانوں کی ذہنی وفکری تشکیل وتعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں، اخلاقی سانچے میں ڈھالا جاتا، مولانا مرحوم نے مغربی نظام تعلیم کے منفی اثرات کو اجاگر کرنے کے ساتھ اس ضرورت پر بار بار زور دیا ہے، ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''تعلیمی نظام کی طرح ذرائع ابلاغ کو بھی اسلامی تصور کے مطابق ڈھالنا اور ان کی اصلاح کرنا ضروری ہے، تاکہ اہل قلم اور فنکاروں کی ایسی نسل تیار ہوجائے جو اسلامی روح وفکر کی حامل ہو اور کائنات اور اسلام کے متعلق اسلام کے تصور سے ہم آہنگ ہو'' (ص:۷۶)۔

سامراجی استعماریت سے آزادی کے بعد عالم اسلام میں تعلیم و تربیت کا ایسا نظام رائج کرنا چاہیے تھا جو امت اسلامیہ کے احساسات کی ترجمانی کرتا اور اسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی علوم وفنون کے دائرے کو وسیع کرتا، لیکن آزادی کے بعد انہیں لوگوں کے لئے میدان خالی کردیا گیا جو سامراجی نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ تھے، انہوں نے تعلیم کے ذریعہ اعلیٰ مناصب کے حصول کے شوق کو پروان چڑھایا، جس نے ایسا ذہنی انقلاب برپا کیا کہ مغربی ذہنیت کا نفوذ اور گہرا ہوتا چلا گیا اور مذہبی طبقہ کا اثر ورسوخ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا، لوگ سائنس، اقتصادیات، سیاسیات، زراعت، ٹکنالوجی اور نظریاتی فلسفوں کی طرف تیزی سے متوجہ ہوئے، اس کے مقابلہ میں مذہبی علماء ان علوم ونظریات سے وابستہ ہوگئے جن میں زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات تقاضوں اور مسائل کی ترجمانی نہیں تھی، اس لئے مغربی نظام تعلیم کے اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد مذہبی مدرسہ میں پڑھنے والے طلبا کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے، نیز مغربی طرز تعلیم کے فارغین ہی زندگی کے مختلف شعبوں کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں، اور مذہبی اداروں کے پروردہ مذہبی مدرسہ اور مساجد تک محدود ہیں، ان حالات میں ارباب شعور کی کیا ذمہ داری ہے، مولانا مرحوم حالات وکوائف اور مستقبل کے نتائج پر توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان حالات کے پیش نظر مسلم علماء کے لئے معاشرہ پر اثر انداز ہونا اور مغربی طرز زندگی سے توجہ پھیر دینا اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک ان کا معاشرہ کے مختلف طبقوں سے رابطہ وسیع اور پوری زندگی پر محیط نہ ہو، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب وہ علمی، دینی، سیاسی اور فکری میدان میں آگے ہوں، زندگی کے معرکہ میں سرگرم ہوں، اور قوم کی عمومی رہنمائی کے اہل ہوں۔ لیکن اگر ان کا اثر صرف مدارس کی چہار دیواری یا کچھ مخصوص ذمہ داریوں کی ادائیگی تک محدود رہا تو عوام و معاشرہ سے مزید دوری پیدا ہوگی۔ اور یہ متعین ہوجائے گا کہ صرف مخصوص حالات میں معاشرہ کو ان کی ضرورت ہے''۔(ص۸۹)۔

مولانا محترم نے ان علماء سلف کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، جنہوں نے فلسفۂ یونان کے سیلاب کو روکنے میں اہم کردار انجام دیا ہے، انہوں نے ان علوم کو نہ یہ کہ صرف سیکھا بلکہ ان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے فلسفۂ یونان کے مناسب اور مفید حصوں کو اپنایا اور غلط افکار کو عقلی اور منطقی اصولوں پر رد کیا۔

آج ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم مغربی علوم کی اس حال میں برائی کرتے ہیں، جبکہ ہماری نہ تو ان سے واقفیت ہے اور نہ ہی ہم نے ان کو اسلامیانے کی کوشش کی، لہذا ہماری تردید سوائے تضحیک کے اور کچھ نتیجہ فراہم نہیں کرتی، مولانا محترم نے ایسے رجحانات کی تردید کرتے ہوئے امام ابو حامد غزالی کی کتاب ''المنقذ من الضلال'' سے ایک اقتباس نقل فرمایا ہے جس کا مطالعہ یہاں پر ضروری ہے، امام غزالی فرماتے ہیں:

''میرا یقین ہے کہ کسی بھی علم کی خرابی کا دعویٰ اس وقت تک کوئی نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ اس علم کے آخری درجہ پر نہ پہنچ جائے، یہاں تک کہ اس علم میں اس کے سب سے بڑے ماہر کے ہم پلہ ہو جائے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ جائے اور اس کو اپنے پیچھے چھوڑ دے اور وہاں تک رسائی حاصل کرے جہاں تک خود اس علم کے ماہرین نہ پہنچے ہوں، اس وقت کسی علم کے بارے میں خرابی کا دعویٰ کرنا صحیح ہو سکتا ہے، کسی مذہب وفکر کو سمجھنے اور اس کی حقیقت سے واقفیت حاصل کرنے سے پہلے اس کی تردید تیر بے ہدف ہے'' (ص ۹۱)۔

مغرب نے دنیا کے قلوب واذہان کو کس طرح اپنے علوم کا دیوانہ بنالیا، اور اپنے نظام تعلیم وتربیت کو اپنانے پر مجبور کر دیا، مولانا مرحوم نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مغرب نے اپنے علوم وفنون اور افکار ونظریات کی حفاظت وصیانت اور غلبہ کے لئے اسلامی علوم وفنون کا گہرا مطالعہ کیا، اسلامی ممالک کے حالات کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا، مسلمانوں کی ذہنی، نفسیاتی، انفرادی و اجتماعی تمام حرکات وسکنات کا تجزیاتی مطالعہ کیا، مختلف موضوعات پر انسائیکلوپیڈیاز تیار کیں، کسی نے قرآنی علوم میں کامل مہارت پیدا کی، کسی نے حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، زبان و ادب میں اس طرح مہارت حاصل کی کہ اسلامی موضوعات پر ان کی تصانیف کو مرجعیت حاصل ہوگئی، ان تحقیقات کے بعد انہوں نے ہر موضوع کو اپنے رنگ میں رنگ دیا، ان میں شبہات و اشکالات پیدا کئے، یہاں تک کہ مسلمان اسلامی علوم کے تئیں تشکیک اور سوء ظن کے شکار ہو کر مغربی نظام تعلیم کو گلے لگانے پر مجبور ہوئے۔

آخر میں مولانا محترم نے شعور وادراک کے حامل مسلمانوں سے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی ثقافت وتہذیب کی حفاظت اور ان کو پروان چڑھانے کے لئے سنجیدہ کوشش کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا کہ اسلامی علوم وفنون اور اس کی ثقافت وتہذیب کی حفاظت کے لئے علماء کو اپنے نظام تعلیم وتربیت پر نظر ثانی کرنی چاہیے، عصری علوم میں مہارت پیدا کرنے اور تعلیمی وتربیتی نظام کی از سر نو تنظیم کی ضرورت پر خاصا زور دیا۔

مذکورہ بالا چند صفحات میں حضرت مولانا واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ کی کتاب ''نظام تعلیم وتربیت'' کا مختصر تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مولانا مرحوم کا شمار ان نوابغ روزگار شخصیتوں میں ہے جنہوں نے اپنی تحقیقات اور اپنے افکار ونظریات سے علوم اسلامی کے لئے عظیم خدمات پیش کی ہیں، **مولانا مرحوم نے نظام تعلیم وتربیت کا گہرا مطالعہ کیا اور قدیم وجدید کے درمیان توازن قائم کرنے اور نظام تعلیم سے ثنویت ودوئیت جیسے سم قاتل کو ختم کرنے کی شدید ضرورت محسوس کی، مولانا مرحوم کو اس کا بھی شدید احساس رہا کہ مسلمانوں کا قدیم نظام تعلیم جس کا طویل مدت تک تجربہ کیا گیا اور اب تک کیا جا رہا ہے، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی واپسی کا سامان فراہم نہیں کر سکتا، بلکہ اس سے مسلمانوں کی افرادی قوتیں دینی ودنیاوی اور اسلامی وغیر اسلامی کی تفریق کا شکار ہو کر فنا ہو رہی ہیں، مولانا محترم مسلمانوں کے نہایت مؤقر ترجمان ادارہ ندوۃ العلماء کے نظام تعلیم کے سرخیل رہے، ندوۃ العلماء جس کا دعویٰ بلکہ جس کے وجود کا اصل محرک قدیم وجدید کے درمیان مناسب توازن قائم کرنا ہے، نیز ندوۃ العلماء میں اس نظریہ کے حاملین اور ترقی یافتہ افکار ونظریات کے قدر دانوں کی بڑی خاصی تعداد رہی، اور خود مولانا مرحوم یہاں کے نظام تعلیم کے سربراہ بھی رہے، آخر کیا وجہ ہے، اور کیا رکاوٹیں ہیں کہ قدیم وجدید کے درمیان توازن برقرار رکھنے اور نظام تعلیم سے ثنویت کو ختم کرنے کی ضرورت پر مکمل شرح صدر کے باوجود نیز عصری علوم میں کامل مہارت کی ضرورت کے شدید احساس کے باوجود ندوۃ العلماء میں اس کی طرف عملی کوشش نہیں کی گئی، اور نہ آئندہ اس کی طرف اقدام کرنے کی ہمت کے آثار نظر آتے ہیں۔**

☆☆☆

مولانا واضح رشید ندویؒ کی فکر

''البعث الاسلامی'' کے مستقل کالم ''صور واوضاع'' کے آئینہ میں

ڈاکٹر محمد ریحان ندوی

نئی دہلی

تمہید:

فن صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور عصر جدید کا ایک مؤثر آلہ ہے جس سے علم و آگہی، خبر ونظر، فکر وفن، سیاست و ثقافت، معیشت ومعاشرت اور حالات حاضرہ سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے، میڈیا کی دو بڑی قسمیں ہیں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا، شیخ واضح رشیدؒ صاحب دونوں کے تجربات سے فیض یاب ہوئے اور دونوں کے ذریعہ لوگوں تک رسائی کی سعی وکوشش کی، مگر آج میری گفتگو اور بحث کا محور صرف ان کی پرنٹ میڈیا سے متعلق ہے جو البعث الاسلامی (عربی ماہانہ میگزین) میں ''صور و اوضاع'' یعنی ''حالات حاضرہ'' کے عنوان سے آپؒ کے مقالات شائع کرتا تھا۔

حیات وخدمات:

صحافت کا نکتہ داں، عظیم تجزیہ نگار، سیاسی وفکری وعلمی تنقید نگار، باکمال ادیب، مقبول استاد، مربی بے مثال، صوفی با صفا، اخلاص و للّٰہیت کا پیکر اور درجنوں کتابوں کا مصنف، خانوادۂ علم اللہی کا چشم و چراغ اپنی آفتابی کرنوں سے ضوفشانی کرتا ہوا، دنیا کی ۸۰ سے زائد بہاریں دیکھ کر اس دار فانی سے دار بقا کی طرف ۱۶ جنوری ۲۰۱۹ء کو ہم سب کے درمیان سے رخصت ہوگیا، آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

آپؒ نے ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد علی گڑھ سے استفادہ کیا، اور بی اے انگلش فاصلاتی کورس کیا، ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کے عہدے پر تقرر ہوا، ۲۰ برس کے بعد جب آپ کے برادر مکرم حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب عازم سفر حج ہوئے تو آپ کو تدریس کے فرائض کی انجام دہی کے لئے لکھنؤ ندوۃ العلماء آنا پڑا، یہاں کی علمی وادبی فضا ایسی دل کو لگی کہ آپ نے آل انڈیا ریڈیو کی نوکری سے استعفی دے دیا، اور پھر شیخ زکریاؒ کے مشورہ کے بعد کسی سے کچھ نہ پوچھا استعفی نامہ آل انڈیا ریڈیو پہنچادیا، وہاں جب اس کی خبر ملی سب کو بڑا تردد ہوا کہ اچانک نوکری کیوں چھوڑ دی، بالآخر جب ایک ماہ بعد آپ نے تحریری طور پر یہ بات عرض کی کہ میری کسی سے ان بن نہیں ہوئی ہے بلکہ میں نے ایثار وقربانی کا راستہ خود اختیار کیا ہے، اس صراحت کے بعد آپ کا استعفی منظور ہوا اور بالآخر ۱۹۷۳ء سے تا دم حیات ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد اور شریک ایڈیٹر البعث الاسلامی کام کرتے رہے، اور عربی زبان وادب وفن صحافت کی وہ خدمات انجام دیں جو اپنی مثال آپ ہے۔

البعث الاسلامی کا پہلا شمارہ ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آیا اور محمد الحسنیؒ پہلے ''العالم الإسلامی'' کے نام سے حالات حاضرہ پر تجزیے وتبصرے کیا کرتے تھے۔ آپ اس میگزین سے ۱۹۷۳ء سے ہی وابستہ ہوگئے اور تادم حیات اپنی فکر ونظر سے دنیائے علم وادب کو آگہی بخشتے رہے، یہاں یہ بات عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ریڈیو کی نوکری کے بعد آپ الکٹرانک میڈیا کی طرف کبھی بھی متوجہ نہ ہوئے۔ میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ساری فائلیں دیکھیں مگر صرف ایک انٹرویو کی ہی فائل ہاتھ لگی

جس میں آپ اپنے عرب دوست کے ساتھ انٹرویو لے رہے تھے، اور ایک فائل میں کسی ڈرامہ کا تجزیہ بھی پیش کر رہے تھے، ان دو فائلوں کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے نشریات کے خزانے میں کوئی محفوظ چیز مجھے نہیں ملی۔

آپ کی صحافت سے ماخوذ یا بالفاظ دیگر آپ کے صحافتی مقالات کا مجموعہ ایک بہترین کتاب کی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے، جس میں آپ کے البعث الاسلامی کے کالم ''حالات حاضرہ'' اور الرائد کے اداریے شامل کئے گئے ہیں، یہ کتاب آپ کے ۳۰ برس کے صحافتی مقالات پر محیط ہے۔ اس مقبولِ خاص وعام کتاب کا نام ہے ''اِلی نظام عالمی جدید'' یعنی ''ایک نئے عالمی نظام کی طرف'' یہ مقالات ورسائل کا مجموعہ ہے جو کہ پیش تر مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان علمی وتقابلی تجزیہ پیش کرتی ہے۔ پہلے باب میں مغربی تہذیب اور اس کے حقائق یعنی استعماری فلسفہ اور اقتصادی نظریات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جبکہ دوسرے باب میں نئی دنیا میں اسلام کا تجربہ کیوں نہیں پر بحث کی ہے۔ اس میں آپ نے اسلام کو دنیا کے سامنے ایک بہتر متبادل کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو کہ انسانیت کی ہر شعبۂ زندگی میں رہبری کرتا ہے، اس میں آپ نے اسلام کے تربیتی، تعلیمی، سیاسی، سماجی، اقتصادی پہلوؤں پر علمی انداز میں روشنی ڈالی ہے اور یہ بات اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کو عالم جہل وسفاہت، ظلم وعصیان سے اسلام کی روشنی اور عدل وانصاف ہی نجات دلاسکتا ہے۔ اسی طرح آپ کا ایک عمدہ مقالہ بھی ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا جاچکا ہے جس کا عنوان ہے ''من صناعۃ الموت الی صناعۃ القرارات'' جس کا سہل ترجمہ ''جہاد و جانفشانی کو ترک کر کے بنے گفتار کے غازی'' یہ ایک سولہ صفحات پر مشتمل مقالہ ہے، اس میں آپ نے عالم عربی کو جھنجھوڑا ہے اور ان کو عمل کی دعوت دی ہے۔ ان کے علاوہ آپ کی بیش تر تصانیف آپکی صحافتی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ آپ کی مفید کتابوں من ''ادب الصحوۃ الاسلامیۃ، حرکۃ التعلیم الاسلامی فی الھند، تاریخ الأدب العربی (العصر الجاھلی)، اِلی نظام عالمی جدید، الإمام احمد بن عرفان الشھید، مصادر الأدب العربی، الشیخ ابوالحسن قائدا حکیما، تاریخ الثقافۃ الإسلامیۃ، من قضایا الفکر الإسلامی، أعلام الأدب العربی فی العصر الحدیث، اس کے علاوہ چند اہم اردو تصانیف درج ذیل ہیں محسن انسانیت ﷺ، سلطان ٹیپو شہید ایک تاریخ ساز قائد شخصیت، اسلام مکمل نظام زندگی، نظام تعلیم اندیشے تقاضے اور حل، ندوۃ العلماء ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریک اصلاح ودعوت، مسئلہ فلسطین سامراج اور عالم اسلام۔ آپؒ کی عربی ادب کی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت ہند نے آپ کو صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

آپؒ کی فکر ''صور واوضاع'' کے آئینہ میں:

شیخ واضح صاحبؒ نے اپنے کالم کو عالم اسلام کے لئے عموماً اور عالم عرب کے لئے خصوصاً توجہ کا مرکز بنا رکھا تھا۔ ہر وہ فکر اور موضوع جو مسلمانوں سے متعلق ہوتا آپ اس سے متعلق عربی وانگریزی پر مشتمل کتابیں، مجلّات، اخبارات ورسائل پڑھتے پھر اس کے بعد معروضی انداز میں اپنا تجزیہ پیش کرتے تھے، آپ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں ''میں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ میں علامہ ابو الحسن علی ندوی کی فکر اسلامی کی اشاعت کروں اور اسی کو پیش کروں، میں نے اس کالم کے لئے عربی انگریزی زبان کے اخبارات ومجلّات کا مطالعہ ضروری سمجھا ان کو بغور مطالعہ کر کے تحلیل وتنقید کے بعد قاری کے سامنے پیش کرتا ہوں، میرا اسلوب صحافتی اسلوب ہے اور اپنے اسلوب میں صحافتی تجزیہ نگاری کو مدنظر رکھتا ہوں کسی کی بیجا طرفداری یا غیر علمی اسلوب اختیار نہیں کرتا، میں نے محمد اسد اور مریم جمیلہ کی فکر انگیز انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا ہے''۔

شیخ سعید الاعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی'' آپ کے کالم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''صور واوضاع'' حالات حاضرہ پر مبنی آپ کی تحریریں ہیں جو کہ آپ کی فکری بالیدگی، عمدہ تجزیہ نگاری، فکر اسلامی سے گہری واقفیت، سیاسی، واقتصادی حالات کا جائزہ پیش کرتی ہیں۔ آپ مغرب پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں اور اہل مشرق کو مفید مشوروں سے نوازتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ مغرب اور اس کے فلسفے

کے پس پردہ حقائق کو بیان کرتے ہیں، جو کہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی شبیہ کو خراب کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ شیخ واضح صاحب نے مسلمانوں کی آپسی نااتفاقی، علمی پسماندگی اور مغرب کی اندھی تقلید پر بھی تنقید کی ہے اور صحیح اسلامی نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔

درج ذیل میں ہم نے صور واوضاع کے مضامین کو دو خانوں میں بانٹا ہے۔ اولاً آپکی اہل مغرب پر تنقید ثانیاً اہلِ مشرق پر تنقید ومشورے۔

اہل مغرب پر تنقید:

(۱) کیا جمہوریت کے دو پیمانے ہیں۔ البعث شمارہ جون، جولائی، ۲۰۱۴ء

(۲) جہالت یا ہٹ دھرمی (اہل مغرب کے حوالہ سے) البعث شمارہ، جون ۲۰۱۵ء

(۳) مغرب کی اسلام دشمنی ہی عالم اسلام کی نزاع کا سبب ہے۔ الربیع العربی کے حوالہ سے، البعث، جنوری ۲۰۱۴ء

(۴) مسائل کے حل کے لئے دو معیار دنیا کے اضطراب کے اسباب ہیں، البعث، اکتوبر، نومبر، ۲۰۱۲ء

(۵) تجربہ پر تجزیے (علمی، ادبی، سائنسی سماجی سیاسی) البعث، جنوری ۱۹۷۹ء

یہاں پر راقم نے ''صور واوضاع'' کے دو کالم جو کہ اہل مغرب کی تنقید پر مشتمل ہیں ان پر تبصرہ وخلاصہ پیش کیا ہے۔

تجربے پر تجربے:

اہل مغرب تجربے کی بنیاد پر ترقی کے روز بروز نئے نئے مدارج طے کرتے جارہے ہیں، اور علمی، صنعتی، طبی، سماجی میدانوں کی حصولیابیوں میں انھیں کی تحقیقات کا دور دورہ ہے، اور یہ ساری ترقی تجربے کی بنیاد پر ہی ہوئی ہے، مغربی مفکرین کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب کی بالا دستی سے پہلے انسان کی بدنصیبی کی وجہ صرف دو تھیں، ایک جہالت دوسرے فقیری۔ تو جب دولت اور علم آجائے گا تو یہ ساری مصیبتیں اور دقتیں ختم ہو جائیں گی، تو علم کا حصول اور اسباب کے حصول کی سعی مغرب کی رگ وپے میں سرایت کرگئی مگر یورپ وامریکا کے ان ترقی یافتہ ملکوں میں اگر آپ دیکھیں گے تو جرم اور اخلاقی گراوٹ تو دیگر ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ قتل وغارت گری، لوٹ مار، بے حیائی، اخلاقی انارکی، ناجائز بچوں کی کثرت ان ممالک میں اب عام بات ہوگئی ہے، یہاں تک کہ اب بڑے بڑے لیڈران کو اغوا کرلیا جاتا ہے، اور اس طرح کے واقعات کثرت سے بڑھ رہے ہیں، یہ تہذیب اب تجربے کی بنیاد پر چل رہی ہے اور تحقیق کے دم پر کھڑی ہے، تو کیا یہ اپنے تجربات سے کچھ سبق لیگی اور اپنے ہی نتائج سے کچھ عبرت حاصل کرے گی اور خاندانی نظام درست کرے گی، اور صحیح سیاسی نظام بروئے کار لائے گی!

مغرب کی اسلامی دشمنی ہی عالم سلام کے نزاع کا سبب ہے:

ایک دوسرے مضمون ''مغرب کی اسلامی دشمنی ہی عالم سلام کے نزاع کا سبب ہے۔'' میں آپ تحریر فرماتے ہیں جس کا خلاصہ ہے کہ آج سارے عالم عرب کے حالات جہاں پر کہ بغاوتیں پنپ رہی ہیں، لیبیا سے لے کر شام تک اور اس میں مصر بھی شامل ہے، یہ انقلاب آفریں نعرے اس لئے لگائے گئے تھے کہ موجودہ نظام کو بدل کر دوسرا ہم متبادل نظام لایا جائے گا، یا جو نظام چل رہا ہے، اس سے افضل نظام حکومت لایا جائے گا، جس کو ربیع عربی کا نام دیا گیا تھا، مگر یہ ربیع کی تعبیر غلط ثابت ہوئی اور بہت جلد یہ ربیع خریف میں بدل گئی اور اب بدامنی کے حالات بنے ہوئے ہیں، اور نئی حکومت کی تشکیل کا کام شروع ہو چکا ہے جو کہ صعوبتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس نتیجے تک ابھی بھی پہنچنا مشکل ہے کہ زمام کار کس کے ہاتھ آنے والی ہے۔

اہل مشرق پر تنقید یا عالم اسلام کو نصیحت ومشورے:

(۱) تصادم سے تبلیغ ودعوت کی طرف

(۲) اسلامی قائدین اور ان کی صلاحیتوں کے امتحان کا وقت کہ وہ کیسے موجودہ صورتحال کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس کو حل کرتے ہیں، البعث، نومبر، دسمبر، ۲۰۱۳ء

(۳) عالم اسلامی میں بحران، البعث، فروری ۲۰۱۴ء

(۴) وہ معاشرہ اور سوسائٹی جو دنیا کی قیادت کرتی تھی آج اپنی

مشکلیں حل کرنے سے قاصر ہے، البعث، اگست ۲۰۱۳ء

(۵) جہاد و جانفشانی کو ترک کر کے بنے گفتار کے غازی

یہاں پر راقم نے ''صور و اوضاع'' کے دو کالم جو کہ اہل مشرق کی تنقید پر مشتمل ہیں ان پر تبصرہ و خلاصہ پیش کیا ہے

جہاد و جانفشانی کو ترک کرکے بنے گفتار کے غازی:

عالم اسلام کو عموما اور عرب کو خصوصا مخاطب کر کے شیخ واضح صاحبؒ لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ کہ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے تو انکی یہ اب سوچ بنتی جا رہی ہے کہ جہد مسلسل اخلاص کے ساتھ کام یہ سارے قدامت پرست کے تھے، سو وہ لوگ اب ہمارے درمیان نہ رہے، انہوں نے تو ہمارے حصہ کی بھی کاوش کر ڈالی، وہ جیالے تھے، موت سے کھیل جاتے تھے! پہاڑوں سے ٹکرا تے تھے! کارنامے انجام دیتے تھے! کیوں کہ ان کو دنیا سے رسم و راہ نہ تھی۔ جہاں تک ہماری بات ہے تو اب ہم نے تاریخ کے سب سے متمدن زمانے میں آنکھیں کھولی ہیں اور سب سے زیادہ پرکشش و دیدہ زیب تہذیب آج کی تہذیب ہے۔اس برق رفتار زندگی میں ہمارے اوپر کمانے کا بوجھ بہت زیادہ ہے، زندگی کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں تبھی ہم اس تہذیب کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل بن سکیں گے؟ ہم کیوں تھکیں ؟ جانے کیوں جوکھم میں ڈالیں؟ چھوڑو ان فرسودہ باتوں کو! کون جائے جہاد میں؟ اور کیوں پسینہ بہائے!! کیوں دیں اپنی جان!! ہم تو اب کانفرنس کانفرنس کھیلیں گے، اور قرادات پاس کر دیں گے بس!؟ جی ہاں یہ ہے حال آج ہمارے عرب جیالوں کا جو سپاہی تھے، سپہ سالار تھے، مردان کار تھے، آج وہ پٹاخے سے ڈرتے ہیں۔

عالم اسلام میں بحران:

اس عنوان سے شیخ واضح صاحب لکھتے ہیں کہ ماضی میں مسلمانوں کے پاس شان و شوکت تھی عظمت و ہیبت تھی، شرافت و کرامت تھی، مگر جب سے استعماری طاقتیں عالم عربی میں داخل ہوئیں خاص طور پر مصر میں کیوں کہ مصر اسلام کا قلعہ ہے، علم کا مرکز ہے، تو استعماری طاقتوں نے یہاں کا نصاب تعلیم بدلا اور اس پر سارا زور صرف کر ڈالا۔ پھر اس نصاب تعلیم سے جو لوگ تیار ہو کر نکلے وہ اسلامی ثقافت و تہذیب سے برگشتہ ہونے لگے اور شک و شبہات میں پڑ گئے، یہی حال تونس لبنان سعودی ہر استعماری کالونی کا ہے، آج کے مسلم سماج کا بحران تبھی ختم ہو سکتا ہے جبکہ ہم اپنا نصاب اسلامی بنیادوں پر تشکیل دیں، نئی نسل کو اسلامی روح سے آشنا کرائیں، ان میں اخلاص، صدق و صفا، تقوی طہارت، علم و حکمت، جفاکشی و جواں مردی کے بیج بو دیں، تبھی ہم اس بحران سے نکلا جا سکتا ہے۔

بالاختصار یہ کہ ان مقالات میں مغرب اور اس کے فلسفے کا علمی، تحقیقی، تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، عالم عرب پر مغرب کی ریشہ دوانیوں کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ مقالات مغربی مفکرین اور ان کی خامہ فرسائیوں کا علمی جواب ہیں، اسلام اور مسلمانوں کو درپیش مسائل اور ان کا حل ہیں، مختلف تحریکوں تنظیموں انجمنوں کا تجزیاتی مطالعہ اور صحیح رہنمائی کرتے ہیں، اور ان میں آپ کا اسلوب علمی تجزیاتی اور معروضاتی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) الرائد، کلمۃ الرائد، سعید الاعظمی الندوی، انا لفراقک لمحزونون یا ابا جعفر، شارہ نمبر ۶۰، ۱۵ فروری، ۲۰۱۹ء، لکھنؤ

(۲) مجلۃ الجیل الجدید، جولائی، دسمبر کا شمار، محبوب عالم، حوار مع الاستاذ الشیخ واضح الرشید الندوی، ۲۰۱۸ء جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

(۳) الرائد، السیرۃ الذاتیۃ للشیخ محمد واضح رشید الندوی، شمارہ نمبر ۶۰، ۱۵ فروری ۲۰۱۹ء لکھنؤ

(۴) الصحافۃ الاسلامیۃ فی الھند؛ تاریخھا وتطورھا، د.سلیم الرحمٰن خان الندوی، المجمع الاسلامی العلمی لکھنؤ طبع اول ۲۰۰۱ء

(۵) الی نظام عالمی جدید، محمد واضح رشید الندوی، المجمع الاسلامی العلمی، لکھنؤ طبع اول سنہ ۲۰۱۲ء

(۶) من صناعۃ الموت الی صناعۃ القرارات، للشیخ محمد واضح رشید الندوی، المجمع الاسلامی العلمی لکھنؤ طبع اول، ۱۹۸۰ء

☆☆☆

مصادر الأدب العربی-ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی
نئی دہلی

کسی بھی زبان وادب کی حقیقی معرفت، اس کے اسرار ورموز سے واقفیت اور اس کی اصل چاشنی کا ادراک اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے اصل سرچشموں سے سیرابی حاصل نہ کی جائے، اور اس کے بنیادی مصادر کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل مصادر سے یا تو لوگ واقف نہیں ہوتے یا ان تک لوگوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ زبان وادب کی حقیقت شناخت شخصیتیں بمشکل دیکھنے کو ملتی ہیں، ایسی صورت میں ایک ایسی کتاب کی موجودگی جو ہمیں اصل سرچشموں کی طرف رہنمائی کرے بہت ہی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مرحوم استاد مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کی کتاب مصادر الأدب العربی ایک ایسی ہی رہنما کتاب ہے، جو ہمیں عربی زبان و ادب کے بنیادی مصادر سے متعارف کراتی ہے، اور ہمارے اندر ان سے استفادہ کرنے کی رغبت پیدا کرتی ہے۔

عربی زبان کی چار اہم کتابیں:

استاد مرحوم نے عربی زبان و ادب کے عظیم ذخیرے سے چار کتابوں کو بطور مصادر کے ذکر کیا ہے، اور ابن خلدون کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ہم نے اپنے شیوخ کی مجلسوں میں فن ادب کے اصول میں چار کتابوں کا تذکرہ سنا ہے اور وہ ہیں مبرد کی کتاب الکامل، ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور ابو علی القالی کی کتاب الأمالی۔ یہ چاروں کتابیں پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لکھی گئیں، اور ان نادر روزگار شخصیات کے ذریعہ لکھی گئیں جنہیں عربی زبان وادب کا امام سمجھا جاتا ہے۔

دور جدید کے علماء ومحققین نے اس لسٹ میں تین اور کتابوں کا اضافہ کیا ہے، جو تقریباً اسی زمانے میں لکھی گئیں اور اسی پائے کے جلیل القدر ادباء کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہیں اصفہانی کی کتاب الأغانی، ''ابن عبد ربہ'' کی العقد الفرید'' اور ابن خلقان کی ''وفیات الأعیان''۔

مصادر الأدب العربی کا جائزہ:

مرحوم استاد جناب واضح رشید ندویؒ نے اپنی کتاب مصادر الأدب العربی میں انہیں مذکورہ بالا کتب کا جائزہ لیا ہے اور ان کی خصوصیات وامتیازات پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مصنفین کی زندگی پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس طرح تقریباً پونے دوسو صفحات پر مشتمل یہ کتاب عربی زبان وادب کے مصادر کو جاننے کے لئے ایک گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس طور پر اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ کسی پیشہ ور مصنف کا اثر خامہ نہیں بلکہ ایک ایسے استاد کی کاوش ہے جس نے ان مصادر کی درس وتدریس اور تعلیم وتعلم میں زندگی کا ایک بڑا عرصہ گزارا ہے اور ان کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ ادب ان کا اختصاص اور اوڑھنا بچھونا تھا، اور ندوہ العلماء میں کلیۃ اللغۃ کے ڈین اور پھر ندوہ کے معتمد تعلیمات متعین ہوئے اور عربی زبان وادب میں بڑی خدمات انجام دیں۔

یہ کتاب دراصل آپ کے دروس ومحاضرات کا مجموعہ ہے، اور اس میں آپ نے بحث وتحقیق اور نقد وتبصرہ کے بجائے عربی زبان وادب سے شغف رکھنے والے طلباء کی اصل مصادر کی طرف رہنمائی کرنے کی

کوشش کی ہے تا کہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں اور زبان کی حقیقی جاشی سے آشنا ہو سکیں۔

آپ نے اس کتاب میں جو منہج اختیار کیا ہے اس میں سب سے پہلے آپ مصنف کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے احوال و کوائف کے جائزے کے ساتھ اس کی علمی فضیلت و برتری اور خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں اور صاحب کتاب کی زبان میں اس کتاب کے لکھنے کا پس منظر یا سبب تالیف بیان کرتے ہیں، پھر اگر کسی نے اس کتاب کا رد کیا ہے یا اس کی کوئی شرح لکھی یا اس کتاب کے نام پر کوئی دوسری کتاب لکھی ہے تو اسے بھی بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد کتاب کے نص کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر استاد مرحوم نے مذکورہ بالا کتابوں کے اصل نص کے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انکا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا ہوتا تو اس کتاب کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مصادر کے مصنفین کا تذکرہ:

استاد مرحوم نے سب سے پہلے جاحظ کی ''البیان والتبیین'' پر گفتگو کی ہے، اور اس کے مضمون کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، کتاب البیان والتبیین پر بات شروع کرنے سے قبل آپ نے جاحظ کی زندگی اور اس کے فضل وکمال اور عادات واطوار کے بارے میں لکھا ہے۔ آپ جاحظ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں، ''جاحظ کا ہر خاص و عام سے تعلق تھا چاہے وہ بازاری ہو یا پیشہ ور، علماء ہوں یا ادباء، امراء ہو ں یا خلفاء، وہ جس سے بھی ملے اس سے کچھ نہ کچھ سیکھا، انہوں نے مختلف طبقوں کی زندگی کا مطالعہ کیا اور اسے اپنی تحریروں میں برتا۔''

آپ جاحظ کے بارے میں آگے تحریر فرماتے ہیں، ''جاحظ نے ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی، اساتذہ، چوراچکے، جانور، طوائفین، فرقے، قاضی، مائیں وغیرہ ان کے موضوع تھے اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی کتابیں ان کے زمانے کی انسائیکلوپیڈیا ہیں، ص ۸۔

اسی طرح ادب الکاتب پر گفتگو کرنے سے قبل آپ ابن قتیبہ کے بارے میں لکھتے ہیں، ''ابن قتیبہ بغداد کے نحوی مدرسے کے امام تھے، اور ان کی کتابیں جاحظ اور ابوحنیفہ دینوری کی تصنیفات کی طرح اپنے زمانے کے تمام علوم ومعارف کا احاطہ کرتی ہیں۔ ابن قتیبہ کی ایک اہم خصوصیت کتاب کے مضامین کی ترتیب ہے، اور اس میں وہ جاحظ اور مبرد پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔''

آپ کتاب الکامل، پر تبصرہ سے قبل مبرد کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''مبرد بغداد میں عربی زبان وادب کے امام سمجھے جاتے تھے اور بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ ان کے اور ثعلب کے درمیان معاصرانہ چشمک رہتی تھی کیوں کہ مبرد بصری مدرسے کے پیروکار تھے اور ثعلب کوفی۔ آپ نے مصنفین کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد یہ کوشش کی ہے کہ کتاب کے بارے میں اور اس کی سبب تالیف کے بارے میں خود صاحب کتاب کی زبان میں اگر کچھ مہیا ہوا تو پیش کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ادب الکاتب کی سبب تالیف کے بارے میں خود ابن قتیبہ کا قول نقل کیا ہے، ابن قتیبہ وجہ تالیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں ''میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگ ادب سے بیزار ہیں، اور اس کے نام سے پیچھے بھاگتے ہیں، ادیبوں سے نفرت کرتے ہیں، نوخیز لڑکے تعلیم میں رغبت نہیں رکھتے، اور جو لوگ نوجوانی کے عالم میں ادب کے طلبگار ہیں وہ صرف چند اور گنے چنے لوگ ہیں''۔ بہرحال اسی طرح استاد مرحوم نے دیگر کتابوں کے مصنفین کا ایک ایک کر کے تذکرہ کیا ہے اور ان کی خصوصیات پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

مصادر پر تبصرہ:

اب جہاں تک مصادر کی کتابوں پر تبصرے کا تعلق ہے تو آپ نے اس جانب کچھ خاص توجہ نہیں کی بلکہ عام طور سے کتابوں کے اصل مواد سے نمائندہ اقتباسات پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے البتہ کہیں کہیں اشارۃً یا مختصراً کسی کتاب کے بارے میں کچھ لکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر ''البیان والتبیین'' کی تمہید کا انتخاب پیش کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں ''قاری کو لگتا ہے کہ جاحظ نے اپنی تمہید میں جن موضوعات پر گفتگو کی ہے وہ جاحظ کی مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ کیوں کہ جاحظ پہلے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد اس پہلو کی طرف آتے ہیں جسکو پیش کرنا ان کا اصل مقصد ہوتا ہے، (**بقیہ** ص (۴۰ پر)

''محسن انسانیت''-ایک مطالعہ

ڈاکٹر ندیم اشرف
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اور اس کی عزت وشرافت کا مدار اپنی بندگی، فرمانبرداری اور احکام خداوندی کے سامنے مکمل سپردگی پر رکھا۔ پھر اسی طریقۂ بندگی کو سکھانے، انکار وجحود سے نکال کر فرمانبرداری کی دعوت دینے اور احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے طریقوں کو سمجھانے کے لئے ہر دور میں اپنے نیک بندوں کو انبیاء ورسل علیہم السلام کی شکل میں مبعوث فرمایا۔ بعثت انبیاء کے اسی سلسلہ کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ آخری نبی ہیں جن کو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو دیگر اقوام وملل کے بالمقابل یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی زندگی کے ہر لمحہ کو قلم بند کر کے ''سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے اہل دنیا کے سامنے پیش کیا تا کہ جو شخص ظلمت وگمراہی کے قعر سے نکل کر عزت وشرافت کی زندگی بسر کرنا چاہے وہ اسوۂ محمدی کو معمول بہا بنا کر خود کو اشرف المخلوقات کے زمرہ میں داخل کر سکے۔

سیرت نبوی کے میدان میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور اپنے پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی نہیں بلکہ اس کے متعلقات کو بھی جس شرح وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور ایک ایک لمحہ پر جن زاویوں اور پیرایوں سے روشنی ڈالی ہے اس کی معمولی سی مثال پیش کرنے سے بھی دیگر انبیاء کرام کے تابعین قاصر ہیں۔

کتب سیرت کے ذخیرہ کو دیکھ کر یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ اس روئے زمین پر مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس کے پاس اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت وجلوت، معاشی واقتصادی، عائلی ومعاشرتی، نجی وسماجی الغرض ہر ہر لمحہ کی خبر موجود ہے۔

سیرت کی اسی اہمیت ومعنویت اور ہر زمانہ میں اس کی افادیت وضرورت کے پیش نظر مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں نے بھی اپنے قلم کے جوہر اس میدان میں دکھائے۔ اور دنیا میں رائج کوئی زبان ایسی نہ بچی جس میں کتب سیرت کا ایک قابل اعتبار ذخیرہ موجود نہ ہو۔

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چوں کہ مکہ کی سرزمین پر ہوئی تھی جہاں کی مادری زبان عربی تھی، اس لئے سیرت نگاری کی ابتداء عربی میں ہوئی۔ لیکن جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک قدم سرزمین عرب سے نکل کر بلاد عجم کی جانب بڑھے اور داعیانِ اسلام نے عجمی عوام وخواص کو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے روشناس کرایا تو عربی کی طرح عجمی زبانوں کا دامن بھی سیرت نگاری جیسی بیش قیمت دولت سے خالی نہ رہ سکا۔

عجمی زبانوں میں سے ایک مشہور ومعروف زبان ''اردو'' ہے۔ یہ ایک ترقی یافتہ زبان ہے جس میں دوسرے علوم کی طرح سیرت پر بھی بے شمار کتابیں، تراجم اور رسائل موجود ہیں۔ اردو میں اولا مولود نامے اور نور نامے تصنیف کیے گیے جن میں موضوع روایات کی بھرمار ہوتی تھی۔ پھر ان کے بعد باقاعدہ طور پر بے شمار مستند اور محقق کتابیں منظر عام پر آئیں تاہم جو شہرت اور ناموری علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ''سیرت النبی'' کے حصہ میں آئی اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ سیرت النبی کے علاوہ بھی دیگر حضرات نے سیرت پہ ایسی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں جن کے حصہ میں عالمی پیمانہ کی شہرت

آئی جیسا کہ ابوالحسن علی ندویؒ کی ''نبی رحمت'' اور رابع حسنی ندوی کی ''رہبر انسانیت''۔ انہی کتابوں میں سے ایک موجودہ دور کے ادیب وصحافی اور مفکر وداعی حضرت مولانا سید واضح حسنی ندوی کی ''محسن انسانیت'' ہے۔

محسن انسانیت:

واضح رشید ندویؒ کی یہ کتاب دراصل مختلف مواقع پر لکھے گئے عربی اور اردو مقالات کا مجموعہ ہے جیسا کہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

''محسن انسانیت'' سیرت کے موضوع پہ کوئی تحقیقی کتاب نہیں ہے، بلکہ مختلف موقعوں خاص طور سے بارہ ربیع الاول کے موقع پر لکھے گئے چند متفرق مضامین ہیں، جو بعض رسالوں میں شائع ہوئے''[۱]

اکثر مقالات عربی میں تھے۔ ان کا ترجمہ'' مولانا محمد وثیق ندوی'' نے کیا ہے اور کتاب کی مکمل ترتیب کے فرائض کو بھی بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ جیسا کہ مصنف خود پیش لفظ کے تحت لکھے ہیں:

''اکثر مضامین عربی میں تھے ان کو اردو میں عزیز مولوی محمد وثیق ندوی نے منتقل کیا، اور انھوں نے ہی اس مجموعہ کو مرتب کیا۔''[۲]

یہ کتاب ۱۲۶ رصفحات پہ مشتمل ہے، اگر کتاب کی ترتیب پر نظر ڈالی جائے تو فہرست کے بعد'' پیش گفتار'' کے نام سے مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کا ایک انتہائی مختصر لیکن بہت ہی جامع مضمون ہے جس میں موصوف نے اس بات کی کہ'' اسلام اپنی تعلیمات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک پر پھیلا ہے'' عقلی اور نقلی شواہد سے مکمل تردید کی ہے۔

پیش گفتار کے بعد مصنف کتاب کا پیش لفظ ہے اور پھر مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب کا ایک مقدمہ ہے جس میں آپ نے بہت ہی اختصار کے ساتھ بعثت انبیاء کا مقصد، سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت و دوام اور پھر آخر میں کتب سیرت کی ضرورت واہمیت سے بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''سیرت طیبہ پر جو کام کیا گیا اور کیا جارہا ہے، سب قابل قدر ہی نہیں بلکہ پوری طرح قابل استفادہ ہے۔''[۳]

مولانا واضح رشید ندویؒ چوں کہ ادب عربی کے ماہرین میں سے تھے اور آپ نے کئی سالوں تک معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ اس لیے آپ فطری طور پر ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ادب سے ایک خاص لگاؤ رکھتے تھے، انہی وجوہات کی بنا پر آپ نے اس کتاب میں علمی وادبی اعتبار سے امتیاز کے حامل سید سلیمان ندویؒ اور سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اقتباسات اور نعتیہ نمونے بھی بغرض افادیت شامل کیے ہیں، اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس مجموعہ میں علامہ سید سلیمان ندوی اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا ایک ایک اقتباس اور بعض نعت گو شعرا کی نعت کے نمونے بھی افادیت کے خیال سے شامل کیے گئے ہیں''[۴]

یہ مجموعہ مقالات پیش گفتار، پیش لفظ اور مقدمہ کے علاوہ دس مقالات ایک نظم اور ایک سلام پر مشتمل ہے۔ جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ پیش گفتار از مولانا جعفر مسعود، پیش لفظ از مولانا سید محمد واضح رشید اور مقدمہ از مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے بعد، ماہر القادری کی مشہور ومعروف نظم ''صبح سعادت'' سے کتاب کی ابتداء ہوتی ہے اس کے بعد سید سلیمان ندویؒ کی کتاب خطبات مدراس سے ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع، کامل اور عالمگیر نمونہ'' کے عنوان سے ۲ رصفحات پر مشتمل ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ بعد ازاں اصل مصنف سید محمد واضح رشید ندویؒ کے یکے بعد دیگرے ۶ رانتہائی جامع، سیرت نبوی سے حاصل ہونے والی عبرتوں اور موعظتوں پر غیر معمولی معیار تحقیق پر فائز مقالات ہیں، ان میں سے پہلا مقالہ ''کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا ''رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم'' ۲۰ صفحات پر، تیسرا مقالہ ''تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت وضرورت'' ۴ رصفحات پر، پانچواں ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر علم وہدایت'' ۱۶ صفحات پر اور چھٹا جو کہ آخری مقالہ ہے وہ ۲۶ رصفحات پر مشتمل ہے اور اس کا عنوان ہے ''نعت گوئی''۔

ان مقالات کے بعد مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب'' تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات'' سے ۲ ر صفحات کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس کا عنوان ہے ''رحمۃ اللعالمین پیغمبر اور رحمت عالم دین ودعوت'' اس کے بعد سید محمد ثانی ندویؒ کا تحریر کردہ سلام ہے اور پھر اردو وعربی میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی کتابوں کی فہرست ہے۔ اردو کتابوں کی فہرست میں ۲۷

کتابوں اور مصنفین کے نام، ۱۱ مقالات وخطبات اوران کے مرتبین و مقررین کے نام، ۴/ان کتابوں کے نام جو عربی سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں اور ۴/ایسی کتابوں اوران کے مصنفین کے نام موجود ہیں جو حکمت نبوی اور فلسفۂ نبوت پر لکھی گئی ہیں۔

آخر میں جو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض اہم عربی مصادر کی فہرست دی گئی ہے اس میں کتب ستہ، مسند احمد، شمائل ترمذی، سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد جیسی ۱۵۰/ایسی کتابوں کو ذکر کیا گیا ہے جو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بحث وتحقیق کرنے والے محققین ومصنفین اور اساتذہ وطلبہ سب کے لیے انتہائی اہم اور ضروری ہیں، ان کتابوں کے نام کے ساتھ ساتھ مرتب نے مصنفین کے اسماء کو بھی تحریر کردیا ہے تاکہ مصادر اصلیہ کی جانب رجوع کرنے والوں کو کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

انداز تحریر:

مذکورہ کتاب کے تناظر میں اگر مصنفؒ کے انداز تحریر پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ مقالات نہ صرف اپنے پیرایۂ بیان، ادائیگی زبان، ادبیت اور واقعات سے نتائج کو مستنبط کرنے میں دیگر کتب سیرت پہ من حیث الوجوہ فوقیت و برتری رکھتا ہے بلکہ اس میں موجود ہر مقالہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے انتہائی اختصار کے باوجود اپنی مثال آپ ہے۔

مصنف کا ایک بہت بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ دیگر مقالہ نگاروں کی طرح صرف واقعات کے نقل پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان واقعات سے اخذ ہونے والے نتائج کا بھی ذکر کرتے ہیں، پھر چوں کہ آپ کو ادب سے ایک خصوصی تعلق رہا ہے اس لئے اس کتاب میں دیگر مصنفین کی طرح واقعات سیرت کو سرسری اور خشک انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ ادب ولذت اور چاشنی سے بھرپور انداز میں قاری کو سیرت نبوی کے مختلف گوشوں سے روشناس کرایا ہے۔

اس مجموعہ سے مصنفؒ کا مقصد چوں کہ سیرت کی مستقل کتابوں کی طرح واقعات وحوادث کو تاریخی اعتبار سے تسلسل کے ساتھ بیان کرنا نہیں تھا بلکہ تبلیغ اسلام کے خلاف کیے جانے والے بے جا اعتراضات کا جواب دینا تھا، اس لئے آپ نے تاریخی، زمانی اور مکانی کسی بھی تسلسل کا اعتبار کیے بغیر الگ الگ مضامین کی شکل میں سیرت کے پہلوؤں کو پیش کیا ہے جس کا تعلق عفو و درگزر اور تعلیم و تربیت سے ہے۔ جیسا کہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

''اس مجموعہ مضامین میں سیرت پاک کے ان پہلوؤں یا واقعات کو نمایاں کیا گیا ہے جن میں رحمت، عفو و درگزر کرنے، دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک، اور تعلیم وتربیت اور دعوت میں انسانی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے نرمی ورعایت کا اہتمام پایا جاتا ہے''۵؎

مصنف نے چوں کہ دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے اور وہاں موجود دیگر اقوام وملل کے افراد سے ملاقات کی ان کے خیالات کا بغور مطالعہ کیا اور اسلام کے تئیں ان کے صدیوں سے چلے آرہے بغض و عناد سے بخوبی واقفیت حاصل کی ہے۔ اسی لیے انھوں نے ''رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان سے جو مضمون سپرد قلم کیا ہے اس میں انتہائی شرح وتفصیل کے ساتھ نقلی وعقلی دلائل کے ذریعہ اس بات کی مکمل تردید کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشدد کے داعی تھے اور اسلام تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ اللعالمینی پہ طویل بحث کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ''لیکن یہ عجیب تضاد ہے کہ مغربی مصنفین خصوصا مستشرقین نے سیرت نبوی کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کردیا ہے اور بعض تاریخی اور تادیبی کارروائیوں سے استدلال کرکے بڑی دیدہ دلیری اور دیدہ ودانستہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) تشدد اور طاقت کے استعمال کے داعی تھے اور اسلام تشدد اور جبر کی تعلیم دیتا ہے۔''۶؎

مولانا موصوف کا تعلق چوں کہ ایک ایسے گھرانے سے تھا جو اسلام ومسلمانوں کی خیرخواہی کے لیے چہاردانگ عالم میں مشہور ہے پھر آپ نے اس عظیم شخصیت کے زیر سایہ تربیت پائی تھی جو مفکر اسلام کے غیر معمولی لقب سے عجم میں ہی نہیں عرب میں بھی معروف ہیں۔ اس تعلیم وتربیت اور تعلق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ آپ کی تحریر وتقریر میں بھی اسلام کے تئیں تڑپ وفکر پائی جائے۔ اور اسی تفکر کی بے شمار مثالیں اس کے مطالعہ کے وقت سامنے آتی ہیں۔ آپ ''وقت کی اہم ضرورت'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ''مسلم اہل قلم اور مفکرین کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یورپ کی اس علمی وفکری یلغار کا مقابلہ کرتے، لیکن افسوس کہ

وہ اپنی تمام تر توجہات یورپ کے عسکری حملہ کے دفاع پر صرف کرنے کی وجہ سے اس بھیانک فکری وعلمی یورش پر توجہ نہ دے سکے۔''[۷]

اس مجموعہ مضامین کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے سامنے صرف سیرت کی کتابیں ہی نہیں رہی بلکہ وہ سیرت نبوی کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور ان کے ماخذ ومنبع مستشرقین کے لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہیں، آپ جگہ جگہ اس لٹریچر کا حوالہ دیتے اور اس پر نقد وتنقید کرتے ہیں۔ ایک جگہ بدنیت مغربی مؤرخین اور مستشرقین کی اجمالی فہرست بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ان خطرناک مستشرقین میں ولیم میور، واشنگٹن آرونگ، آربری، الفرڈ گیوم، گولڈزہیر، زویمیر، گرون بام، فلیپ ہٹی ، وینسنک ، لوی ماسنیون، مارگولیوتھ شامل ہیں۔[۸]

خصوصیات:

(۱) اس مجموعہ مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے قاری کے اندر فکری پہلو کو ابھارنے پہ زیادہ زور دیتا ہے۔

(۲) دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف سیرت سے متعلق واقعات کا ہی بیان نہیں بلکہ سیرت کے خلاف تیار کیے گیے مستشرقین کے لٹریچر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو کہ استشراق پہ تحقیق کرنے والوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

(۳) اس مجموعہ مقالات میں سیرت نبوی کے نثری مصادر کے علاوہ، سیرت سے متعلق اشعار کو بھی بحسن وخوبی بیان کر دیا گیا ہے۔

(۴) اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شروع اور آخر میں حسن افتتاح اور اتمام بالخیر کی غرض سے سید سلیمان ندویؒ اور مفکر اسلام ابوالحسن ندویؒ کے دو مضامین داخل کر دیے گیے ہیں۔

(۵) اس کی ایک خاصیت اس کا ادبی پہلو ہے۔ اسی غرض سے ایک انتہائی جامع مضمون ''کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' کے نام سے ابتدا میں ہی داخل کر دیا گیا ہے۔ جو کہ ادبی ذوق کے حامل طالبین کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

(۶) اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ موجودہ دور میں کیا جانے والا ایک بڑا اعتراض کہ ''اسلام اور علم'' کا کوئی واسطہ نہیں۔ دو مضامین میں اس کی مکمل تردید اور اس پر تشفی بخش بحث کی گئی ہے۔

(۷) ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس مجموعہ میں یورپین مؤرخین کے اسلام موافق اعترافات کو بھی ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ غیروں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ اللعالمینی کا اعتراف کیا ہے۔

(۸) اس مجموعہ کی ایک خصوصیت اس کا ایک مضمون ''نعت گوئی'' ہے۔ جس میں بہت ہی اختصار کے ساتھ عربی اور اردو میں نعت گوئی کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔

(۹) اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی بعض اہم اردو کتابوں'' کی فہرست کو شامل کر دیا گیا ہے جو کہ خصوصا اردو طلبہ واساتذہ کے لیے بہت ہی قیمتی چیز ہے۔

(۱۰) اس مجموعہ کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بھی گوشہ پر تحقیقی مقالہ، رسالہ یا کتاب لکھنے والوں کے لیے ''سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض اہم عربی مصادر'' کے عنوان سے ایک فہرست لگا دی گئی ہے۔ جو کہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''محسن انسانیت'' سیرت رسول ﷺ پر ایک جامع اور منفرد کتاب ہے، جس میں الگ انداز تحریر اختیار کر کے سنت رسول پر عمل پیرا ہونے اور اپنی عاقبت سنوارنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

حوالے وحواشی

۱۔ سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، محسن انسانیت ﷺ، دار الرشید لکھنؤ، ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰۱۲ء، باردوم، ص۹

۲۔ ایضا، ص:۱۲

۳۔ ایضا، ص:۱۵

۴۔ ایضا، ص:۱۳

۵۔ ایضا، ص:۱۰

۶۔ ایضا، ص:۵۱

۷۔ ایضا، ص:۵۶

۸۔ ایضا، ص:۵۲

☆☆☆

منہج تربیت اور مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کا نظریہ

محمد شعیب ندوی
اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انسان کے وجود، اس کو مہذب و مثقف بنانے اور اس کے اغراض و مقاصد کی تعین کرنے کے لیے مختلف افکار و نظریات دنیا میں وجود آتے رہے ہیں اور خدائی تعلیمات و مناہج کو پس پشت ڈال کر ذاتی رجحانات سے انسان کے تمام مقاصد و دستور حیات کو متعین کیا جارہا ہے۔خصوصا عصر حاضر میں جسمانی تقاضوں اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے تئیں بے راہ روی اور مطلق العنانی کا دورہ ہے، انسان کی صحیح پرورش و پرداخت وتزکیہ نفس سے متعلق نظام تربیت سپرد قرطاس ہے، چنانچہ منہج تربیت اور مولانا واضح رشید ندوی کا نظریہ موضوع بحث ہے۔

تربیت کا مفہوم :

علم تربیت کے ماہرین نے مختلف انداز میں مختلف قسم کی تعریفیں کی ہیں لیکن تربیت کے اصول و اہداف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہئے کہ تربیت کسی چیز کے وجود میں لانے کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر موجود اوصاف وخصوصیات کی پرورش کی جاتی ہے یعنی کسی چیز کے اندر مخفی صلاحیتوں اور استعداد کو واقعی اور حقیقی صورت اختیار کرنا اور انہیں پروان چڑھانے کا نام تربیت ہے، تربیت کرنا کسی کو تدریجا نشو ونما دے کر کے حد کمال تک پہنچانا ہے۔

مغربی نظام تربیت :

مغربی ماہرین کی نظر میں انسان صرف جسم اور عقل کے مجموعہ کا نام ہے ان سب کے نزدیک انسان اپنی خواہشات کی تکمیل میں حیوان کی طرح بالکل آزاد ہے اس اعتبار سے دونوں میں صرف عقل وشعور کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ بنیادی مقاصد اور جنسی خواہشات کی تکمیل آزادی کے ساتھ انجام دینے کا حقدار ہے اسی نظریہ پر یورپ کے تقریبا تمام اصحاب فکر متفق ہیں اور اسی کو مستحکم کرنے کے لیے مواقع اور وسائل کی فراہمی پر توجہ دیتے ہیں۔

انسان کے متعلق اسلام کا تصور:

انسان کے متعلق اسلام کا نظریہ مغربی اور مادی نظریہ سے مختلف ہے مغرب کے نزدیک انسان حیوانی فطرت کا ترقی پذیر امتداد ہے جو عقل وشعور سے ممتاز ہے جب کہ اسلام کی نگاہ میں وہ اشرف المخلوقت ،خلیفۃ اللہ اور مسجود ملائکہ ہے۔ اسلام دیگر مذاہب کی طرح انسان پر بے جا و نامناسب حدود و قیود عائد نہیں کرتا بلکہ جائز حدود کے اندر رہ کر انسان کو حیات بخش سرگرمیوں کی اجازت دیتا ہے۔انسان کو غور وفکر، وسائل زینت، اظہار رائے کا حق آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر ابھارتا ہے اور اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنی طاقت وقوت اور عقلی و روحانی صلاحیتوں کو اعلی مقاصد کے حصول میں صرف کریں نہ کہ محدود مقصد حیات اور بشری تقاضوں کے پورا کرنے پر خرچ کریں۔

اسلام کا متوازن نظام تربیت :

اسلام آزادی کا مذہب ہے اس میں عقیدہ اور زندگی دونوں کی آزادی جس سے اللہ نے اس کو نوازا ہے اس طور پر ہے کہ انسان کی عام عزت وشرافت سے کسی قسم کا ٹکراؤ ومتصادم نہیں ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کی صحیح تربیت کی جائے، فکر انسانی کی صحیح خطوط پر تشکیل کی جائے، انسان کے اندر اپنے مقام ومرتبہ، عزت وشرافت کا شعور، اپنے خالق و مالک کی معرفت اور اس کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس پیدا کیا جائے اسی لیے اسلامی نظام تربیت اول دن یعنی بچہ کی ولادت کے وقت سے ہی کلمہ توحید کی صدا اس کی قوت سماعت سے ٹکرانے کا حکم صادر فرماتا ہے۔اس کے بعد ماں کی گود میں بچہ کی تربیت ہوتی ہے اور پھر اسلام لحہ بہ لحہ ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتا ہے اور جب انسان ہوش سنبھالتا ہے تو کچھ پابندیاں و بندشیں اس

طور پر لگائی جاتی ہیں کہ اس کی فطری سرگرمیوں اور طبعی میلانات کو مقید نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے رجحانات اور فطری تقاضوں میں اعتدال و تناسب و توازن پیدا کرتا ہے، تاکہ فطری میلانات اس کی روحانی صلاحیتوں پر حاوی نہ ہو۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا۔فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۔قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا۔وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا۔(سورشمس:۷۔۱۰)

''اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا، پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کو اس کو القاء کیا، یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس جان کو پاک کرلیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو فجور میں دبادیا۔''

اسلامی تربیت کی جامعیت:

اسلامی تربیت ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھتی ہے تاکہ انسانی سرگرمیوں کا کوئی پہلو مغلوب نہ ہو، جسم، عقل اور روح کے درمیان توازن برقرار رکھتی ہے، انسان کو دوسروں کے لیے نمونہ بناتی ہے، اس اعتبار سے اسلامی تربیت جسمانی، عقلی، شعوری، سماجی، ذوقی اور روحانی تمام پہلوؤں کو محیط ہے اسلام ایسے فرد و سماج کی تشکیل کرتا ہے جس میں خدائے وحدہ کی پرستش ہو اور پھر اس کے بذریعہ سے اس میں اجتماعی زندگی کی خوبیاں باہمی تعاون، یکجہتی، الفت و محبت، سکون و اطمینان، رواداری و ہمدردی کو پیدا کرتا ہے، لیکن ان تمام صفات کے ساتھ انسان کی ذاتی صلاحیتوں اور شخصی خصوصیات کو مجروح نہیں کرتا ہے۔

اسلامی تربیت کی خصوصیات:

اسلامی تربیت انسان کو نہ تو بالکل مقید و محدود کرتی ہے کہ اس کی زندگی اجیرن بن جائے اور نہ اس کو مکمل آزادی دیتی ہے کہ وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے اپنی من مانی کرے بلکہ انسان کے اندر اعتدال و توازن پیدا کرتی ہے۔

۱۔انسان کو فضائل و محاسن کی تلقین کرتی ہے اور تمام انسانوں کو فلاح انسانی کی دعوت دیتی ہے۔ رذائل و اخلاق سئیہ سے منع کرتی ہے۔سورہ حجرات آیت نمبر ۹ سے ۱۳ تک اس بات کی واضح علامت ہے۔ارشاد باری تعالی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاء مِّن نِّسَاء عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ ۔(سورۂ حجرات:۱۱)

''اے مومنو: کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں۔''

۲۔اسلامی تربیت متوازن و معتدل جامعی اور ہمہ گیر ہے زندگی کا کوئی پہلو و گوشہ اس سے الگ نہیں ہے۔

۳۔اسلامی نظام تربیت عالمی و آفاقی ہے۔ یہ انسان کو اس کے مقام و مرتبہ و عزت و شرافت کا تحفظ فراہم کرتا ہے اس کو مکمل انسان بناتا ہے، زندگی کے کسی بھی پہلو و حالت میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا ہے۔

۴۔ اسلامی تربیت انسانی تقاضوں اور فطری خواہشات و جذبات کی تربیت کرتی ہے۔اعلی اقدار کی آبیاری اور قوت بہیمی و قوت ملکوتی میں تناسب برقرار رکھتی ہے۔

۵۔اسلامی تربیت چیزوں کے درمیان تناسب و توازن و توافق، عدل اور مساوات قائم کرنے کا نام ہے اور یہ فطرت انسانی کے باہمی فروق کی رعایت اور احترام و اکرام کرتی ہے، ارشاد باری ہے۔

فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُواْ عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ۔(سورۂ بقرہ:۱۹۴)

''تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الأُمُورِ۔ (سورۂ ال عمران:۱۸۶)

''اور اگر تم صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے''

اسلامی تربیت کے نتائج و ثمرات قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے ہی کی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کیوں کہ قرآن و سنت ہی تمام بھلائی اور انسانیت کی رشد و ہدایت، فلاح و بہبودی کا منبع و سرچشمہ ہے، اطاعت الٰہی اور اتباع سنت ہی مقصود و مطلوب ہے ان دونوں کے ذریعہ ہی انسان کے اندر اعلی اقدار پیدا ہو سکتی ہے، اور وہ فضائل و محاسن سے آراستہ ہو سکتا ہے، رذائل و بری صفات سے اجتناب کر سکتا ہے۔

قرآن کریم نے تربیت کو تعلیم سے مربوط کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (سورۂ جمعہ:۲)

قرآن کریم نے پوری زندگی میں حکمت اختیار کرنے، احسان کرنے اورانسان کے اکرام واحترام، جدوجہداور عمل کی دعوت دی ہے۔

قرآن کریم نے لفظ حکمت کو اخلاق، آداب، اور گفتگو میں نرمی اور بردباری کے لیے استعمال کیا ہے۔

ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن۔ (سورۂ نحل:۱۲۵)

''آپ اپنے رب کی راہ کی طرف بلایئے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اوران کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقہ سے''

قرآن کا نظام تربیت:

کسب مال و زر اور جنسی خواہشات کی تکمیل انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔انسان کی طبیعت بغیر کسی ترغیب وتحریض کے اس کی جانب خود مائل ہوجائے گی لیکن قرآن کریم نے اس سلسلہ میں بھی سب سے الگ اورمنفرد انداز وطرز اختیار کیا ہے۔قرآن کریم نے حلال کمانے کی جگہیں وطریقے اس طور پر متعین کئے ہیں کہ کسب معاش اطاعت الٰہی میں مانع نہ ہو، کیوں کہ انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (سورۂ ذاریات:۵۶)

جن لوگوں نے عبادت واطاعت اور تجارت میں اعتدال وتوازن پیدا کررکھا ہے ان کا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ۔(سورۂ نور:۳۷)

کسب مال انسانی فطرت ہے، مال و دولت کی حرص و ہوس انسان کا خاصہ ہے لیکن مال کی بے جا محبت سے بچنے کے لیے قرآن کریم نے کسب سے زیادہ انفاق پر زور دیا ہے، جگہ جگہ انفاق کے مواقع اور افراد ومعاشرہ کو مال کی محبت، استحصال اور خودغرضی و مفاد پرستی سے پاک کرنے پر ابھارا ہے کیوں کہ یہی فساد کی جڑ ہے اور مال کی محبت سماج کے بگاڑ اور طبقاتی استحصال کا بنیادی سبب ہے۔

قرآن کریم نے جس طرح انفاق پر زور دیا ہے اسی طرح جنسی خواہشات میں اسراف اور انتہاء پسندی کے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔سورہ اسرا کی اکثر آیات میں اخلاقیات اور تربیت کے اعلامیہ کا بیان ہے۔ ان آیات سے(جنہوں نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کوسمولیا ہے) قرآنی تربیت کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے۔

ان آیات ۲۳ تا ۳۹ کی روشنی میں قرآنی نظام تربیت کا چارٹر یہ ہے۔

۱۔خدائے واحد کی عبادت کی جائے۔

۲۔والدین کے ساتھ حسن سلوک اوران کا پورا خیال رکھا جائے۔

۳۔ ہروقت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالی دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اس ذاتی تصور سے تنہائی اور پردۂ خفا میں بھی شر اور برائی کے دروازے بند ہوجائیں گے۔

۴۔ قرابت داروں ، رشتہ داروں، مسکینوں، غریبوں اور ناداروں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اس طرح اسلام نے استحصال کے تمام راستے بند کرئیے ہیں۔

۵۔زندگی میں اعتدال ومیانہ روی اختیار کی جائے،فضول خرچی اوراسراف نہ کیا جائے اور نہ ہی بخل سے کام لیا جائے بلکہ کسب معاش سے متعلق وقت یہ خیال رہے کہ یہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اس لیے حلال طریقوں سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہوں پر خرچ کیا جائے۔

۶۔اسلامی قدروں کا حامل سماج تشکیل دینے کے لیے اولاد کی صحیح تربیت کی جائے۔

۷۔خواہشات کی تکمیل میں انتہاء پسندی، بے راہ روی اور انارکی سے بچا جائے۔

۸۔قتل ناحق سے اجتناب کیا جائے تاکہ اجتماعی امن وامان قائم رہے،انسان اور معاشرہ محفوظ اور پرامن رہے۔

۹۔یتیم کے مال میں حتی الامکان تصرف کرنے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔

۱۰۔عہد وپیمان کو پورا کیا جائے۔

۱۱۔ ناپ تول پورا پورا کیا جائے ، دوسروں کی پوشیدہ باتوں و رازوں کی معرفت میں نہ پڑا جائے، اور افواہیں نہ پھیلائی جائیں، تکبر، گھمنڈ، غرور سے بچا جائے۔

اسلامی نظام تربیت کے اس عالمی وآفاقی اور انسانی اعلامیہ کی ہمسری و برابری متمدن دنیا کا کوئی بھی نظام تعلیم وتربیت نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ نظام انسان کو ذاتی مفاد کے تنگ دائرہ سے نکال کر اعلی مقصد کے راستہ پر گامزن کرتا ہے اور زندگی کے اعلی ترین تصور،تصور حیات سے روشناس کراتا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں جن میں اخلاقیات اورآداب زندگی بیان کیا گیا ہے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلامی نظام تربیت ہی انسانی معاشروں میں پائے جائے والے کرپشن وفساد اور دیگر جرائم کا واحد علاج ہے۔

☆☆☆

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ ایک مفکر و دانشور

ڈاکٹر ریحان اختر
اسسٹنٹ پروفیسر، فیکلٹی آف تھیولوجی، اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ

آپ ۲۱ ویں صدی کے موثر ترین اسلامی مفکرین میں سے تھے آپ کی فکر اور سوچ، تحریر و تصانیف نے پورے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے آپ کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں رائے بریلی کے ایک گاؤں تکیہ کلاں میں ہوئی ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی، اعلی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا اور ۱۹۵۱ء میں وہیں سے سند فضیلت حاصل کی بعد ازاں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انگریزی زبان وادب میں ماسٹر (ایم۔اے) کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد مولانا نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۳ء تک آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر کی حیثیت سے ملازمت کے فرائض انجام دئے ملازمت سے استعفے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شعبہ زبان و ادب عربی میں استاد کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا اور تادم حیات آپ نے ندوے میں بطور استاد اپنی خدمات انجام دیں۔ ۲۰۰۶ء میں ندوۃ کے ناظم تعلیمات کا عہدہ آپ کے سپرد ہوا ساتھ ہی مولانا کئی رسالوں کے مدیر اور تعلیمی اداروں کے سرپرست رہے جن کے فرائض آپ نے بحسن وخوبی انجام دئے۔

ویسے تو مولانا اردو، عربی اور انگلش تینوں زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے لیکن عربی زبان آپ کا خاص میدان تھا جس کی آپ نے مختلف زاویوں سے نمایاں خدمات انجام دیں اور میدان صحافت کو اپنے قلم کی طاقت سے خوبرو کیا۔ رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین جہاں اس بات کا بین ثبوت ہیں وہیں ان کی فکری بلندی کے بھی غماز ہیں۔ مولانا کے مضامین ہر سطح پر اپنا ایک معیار رکھتے تھے آپ کا اسلوب تحریر بھی ادبی معیار کا تھا علمی سطح پر بھی تقریبا ہر تحریر پر مغز ہوتی تھی آپ کی تحریروں سے مدبرانہ و مفکرانہ عنصر جھلکتا تھا آپ کی تحریروں کا اصل جوہر نقد تھا مغربی تہذیب اور اخلاقیات پر جس انداز سے اور جس قدر ٹھوس اور واضح دلائل کے ساتھ نقد کیا ہے یہ سعادت کم ہی افراد کے حصے میں آتی ہے ساتھ ہی آپ نیا پنی تحریرات میں عالم اسلام کے مسائل اور ان کے اسباب کو بخوبی پیش کیا مغرب کی اسلام دشمنی کے اسباب پر روشنی ڈالی اور مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو عیاں کیا۔

مولانا نے خود کو صحافت تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ مسند تدریس پر جلوہ افروز ہو کر ایک مثالی استاد کے طور پر خود کو متعارف کرایا اور ایک کامیاب مدرس ثابت ہوئے مولانا طلبہ کے تئیں بے حد مشفق اور مہربان تھے طلبہ کو قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے نوازتے اور ان کتابوں کی نشاندہی فرماتے جو طالبعلمانہ زندگی کے مختلف مراحل میں مفید ہوتیں اور حالات حاضرہ کو سامنے رکھ کر ان کی تربیت فرماتے جس کی مثال دنیا میں آپ کے شاگردوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو مولانا کے فیوض کو عام کر رہے ہیں۔

مولانا کو ایک مفکر و مدبر اور دانشور کے طور پر دنیا کے سامنے لانے میں ظاہر سی بات ہے آپ کے مخلص اساتذہ کرام کی صحبت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے لیکن کہیں نہ کہیں اس میں آل انڈیا ریڈیو کی بھی

حصہ داری ہے جہاں ملازمت کے دوران مولانا کو اس دنیا کو گہرائی اور گیرائی سے دیکھنے کا موقع ملا اور عالم اسلام پر مغربی یلغار کا مشاہدہ کیا جس کے تدارک کی خاطر آپ نے ملازمت کو خیر آباد کہا اور تا حیات آپ نے اپنی تحریرات وتصنیفات سے ان کا ڈٹ کر سامنا کیا۔

مفکر کا مفہوم:

قرآن کریم قاری کو بار بار غور وفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے اس لئے تدبر وتفکر کا بہت اونچا مقام ہے حاملین علم کی مختلف قسمیں کی جاسکتی ہیں ایک تو وہ علماء جن کا میدان کسی مسئلے کی حقیقت کو جاننا اور پرکھنا ہوتا ہے وہ مسئلے کی اصلیت کو معلوم کرتے ہیں اور کتابوں میں ان کے حوالے تلاش کرتے ہیں روایت کا فرق معلوم کرتے ہیں جن کو محقق کہا جاتا ہے دوسرے وہ عالم ہیں

جن کی تحریر وتقریر اصلاحی ہوتی ہے اور عوام کی اصلاح کے لئے لکھی جاتی ہے تیسرے وہ علماء ہیں جو اپنی تحریرات میں فصاحت

و بلاغت کے جوہر بکھیرتے ہیں جن کو ادیب کہا جاتا ہے چوتھے وہ علماء ہوتے ہیں جنکی ذہانت، اور عمیق مطالعہ سے غور وفکر کے

چشمے پھوٹتے ہیں ایسے عالم اپنی تحریرات میں مشکل حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی نظریہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کا حل بھی پیش کرتے ہیں ان کے نظریات میں تاریخ کا پس منظر بھی ہوتا ہے اور عصر حاضر سے آگہی کا عکس بھی عالمی حالات کی کش مکش پر ان کی نظر ہوتی ہے ان کی فکر میں نوع انسانی کی رہنمائی ہوتی ہے جس سے پوری نسل مستفیض ہوتی ہے۔

مولانا واضح رشید حسنیؒ بھی انہیں مفکرانہ اوصاف کے حامل شخص تھے آپ کی تحریرات وتصنیفات کے مطالعہ سے قاری اس نتیجے پر پہونچتا ہے کہ آپ نے کوئی نظریہ پیش کیا اور پھر حالات حاضرہ اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا حل بھی تلاش کیا ہے۔

مولانا کے چند افکار :

(۱) عالم اسلام کے لئے مسجد اقصی کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ کعبہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے مسلمانوں کا قبلہ یہی تھا اور معراج کی رات آپ ﷺ یہاں تشریف لائے اور تمام انبیاء کرام کی امامت فرمائی اور پھر یہیں سے آسمانوں پر تشریف لے گئے، مولانا کو مسئلہ فلسطین سے خاصی دلچسپی تھی آپ اس کو پوری امت مسلمہ کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں ''مسجد اقصی کا مسئلہ صرف عربوں کا مسئلہ نہیں ہے یہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے فلسطین کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ عربوں کا مسئلہ ہے اور اس میں عربوں کی کوتاہی کو بہت دخل ہے کیوں کہ اسرائیل کا قیام یوں ہی عمل میں نہیں آگیا یہودی مکر وفریب ایک حقیقت ہے لیکن اس مکر وفریب، عیاری و مکاری سے یہودی کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھا سکے نہ کبھی وہ غالب قوم رہے ہمیشہ مارے مارے پھرے۔ دنیا میں کہیں انہیں عزت وسربلندی نہیں ہوئی اگر مکر سے کسی کو فائدہ پہونچتا تو مکار آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا بلکہ ایسا نہیں ہے''(۱)

قرآن کریم میں ہے وقد مکرو مکرهم و عند الله مکرهم وان کان مکرهم لتزول منه الجبال (الابراهیم :٤٦)

(اور انہوں نے اپنے چالیں چلی اور ان کی سب چالیں اللہ کے یہاں میں اور وہ چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ہل جاتے)لہذا مکر سے کچھ نہیں ہوتا۔

(۲) مذہب ایک ایسی چیز ہے جو کسی بھی شخص کو ایک مقصد بتا دیتا ہے کیوں کہ جو لوگ زندگی میں کچھ مقصد رکھتے ہیں وہ ضرور کسی نہ کسی مذہب کے تابع ہوتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی میں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں درحقیقت وہ مذہب کے مفہوم کو سمجھ نہیں پائے۔ مولانا مذہب کے تعلق سے رقمطراز ہے۔

''مذہب ایک انسانی ضرورت ہے اور کوئی بھی انسان اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا مذہب ہی انسان کے لئے کام یابی اور کامرانی اور روحانی سکون کا سرچشمہ ہے اور روحانی سعادت سے محروم کوئی

بھی معاشرہ حقیقی سعادت حاصل نہیں کرسکتا مذہب ہی انسان کو اعلی مقام عطا کرتا ہے اور مادی استحصال کو ختم کرتا ہے اور برائی سے بچنے کا مشورہ دیتا ہے''۔(۲)

(۳) سامراجی نظام تعلیم وتربیت اور اس کے معاشرہ پر واقع ہونے والے مضر اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں''اس غیر دینی اور غیر اخلاقی تربیت کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جو بظاہر ترقی وپیش قدمی کرتا نظر آتا ہے مگر در حقیقت وہ خود غرضی میں مبتلا ہے اور اپنی ذات تک محدود ہے جس میں اگر آدمی خود غرضی وخود پرستی سے نکلتا بھی ہے تو خاندان اور ماحول کے اسی دائرہ تک جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس سے مزید انانیت اور اپنی برادری اور اپنی سرزمین کے لئے مزید عصبیت پیدا ہوتی ہے پھر بھی انسان اس غلط فہمی میں ہے کہ وہ ایک عالمگیر معاشرہ میں زندگی بسر کر رہا ہے''۔(۳)

(۴) مولانا مسلم ممالک کی حالت زار اور اسلامی تحریکوں اور اسلامی جماعتوں کی ناکامی کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' اسلامی تحریکات کی ناکامی کا سبب اسلامِ کامل کا نمونہ پیش کرنے میں تقصیر (کوتاہی) ہے''۔

(۵) نظام تعلیم میں استاد کے بعد دوسرا اہم عنصر ذرائع ابلاغ اور اس میدان میں امتیاز رکھنے والے اہل فن ہیں ذرائع ابلاغ کے تینوں شعبوں صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن طلباء اور نوجوانوں کی ذہنی اور فکری تشکیل وتعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں یہ تعلیم وتربیت کے معاون کی حیثیت رکھتے ہیں مولانا ذرائع ابلاغ کو اسلامی تصور کے مطابق استعمال کرنے اور اس کے ذریعے نوجوان نسل کو اسلام کی خدمت کے لئے تیار کرنے پر زور دیتے ہیں آپ فرماتے ہیں'' تعلیمی نظام کی طرح ذرائع ابلاغ کو بھی اسلامی تصور کے مطابق ڈھالنا اور ان کی اصلاح کرنا ضروری ہے، تاکہ اہل قلم اور فنکاروں کی ایک ایسی نسل تیار ہو جائے جو اسلامی روح اور فکر کی حامل ہو، اور کائنات اور انسان کے متعلق اسلام کے تصور سے ہم آہنگ ہو''۔

(۶) آج کے اس ترقی یافتہ دور میں صحافت کی اہمیت وافادیت سے کسی بھی صورت میں انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، صحافت انسانی اقدار کے تحفظ کی ضامن اور مظلوم ومجبور عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمان ہوتی ہے لیکن ضروری یہ ہے کہ صحافت کس قسم کی اور کس خیالات کی ہو مغربی صحافت کی طرح آزاد ہو یا اشتراکی صحافت کی طرح مقید ہو؟ اس بابت مولانا کا نظریہ یہ ہے کہ صحافت ایسی ہو''جو نہ تو مغربی صحافت کی طرح مطلقا آزاد ہو کہ جس کا ہر نامہ نگار جب اور جس طریقے سے چاہے اپنے ہر اچھے اور برے خیال کو لوگوں کے سامنے پیش کرے اور نہ اشتراکی صحافت کی طرح مقید ہو جو عوام کو بیرونی دنیا سے بالکل بے خبر رکھتی ہے، بلکہ ایک مثبت، تعمیری، با مقصد اور اقدار و روایات کی پابند صحافت ہو جسے اپنے اصول ومبادی پر پورا یقین ہو اور اپنی ذمہ داریوں کا خوب احساس ہو تعمیری تنقید کا پورا فریضہ بھی انجام دیتی ہو اور قارئین کی نیک خواہشات کی تکمیل بھی کرتی ہو''(۶)۔

(۷) موجودہ دور میں معاشرہ کے انحطاط کے جہاں دیگر اسباب ہیں وہیں مرکزی سبب اہل علم اور عوام الناس کے مابین وہ خلیج اور فاصلہ ہے جسے پر کرنے کے لئے دونوں طبقوں کی جانب سے کوئی خاطر خواہ توجہ اور اہمیت نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روحانی امراض میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور عوام اور علماء کے درمیان دوری پیدا ہوگئی کیوں کہ عوام اور خاص کر نوجوان طبقہ مغربی طرز تعلیم سے متاثر ہوتا ہے، اس لیے وہ علماء سے اسی نہج اور طریقے سے جواب کا متمنی رہتا ہے اور جب اس کو اس طرز پر جواب نہیں ملتا تو وہ دوری بنانا شروع کر دیتا ہے کیوں کہ انسان کی فطرت ہے کہ جس کنویں پر اس کی تشنگی بجھتی ہے وہ اسی کا رخ کرتا ہے، مولانا ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے اسباب اور حل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''معاشرہ اور علماء کے درمیان اس دوری یا محدود تعلق کا سبب نئے علوم سے عدم واقفیت ہے اور زندگی کے مسائل سے بے تعلقی ہے، ایک مخصوص طرز زندگی کے نتیجے میں ان میں آگے بڑھنے اور عوام سے ملنے اور اثر انداز ہونے کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے''۔ مولانا اسلاف کی مثال دے کر جدید افکار ونظریات کے مطالعہ، ان میں مہارت پیدا کرنے اور ان علوم وفنون پر تنقید کر کے کھرے اور کھوٹے کو الگ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ''تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی بیرونی افکار کا حملہ ہوا اور اسلامی معاشرہ کو فکری، عقلی اور ثقافتی خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہمارے سلف نے ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کیا انہوں نے بند باندھنے یا قلعہ بند ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے صحیح وقت پر اس خطرہ کا احساس کیا اور اس میدان میں گھس کر اسی ہتھیار سے مقابلہ کیا، انہوں نے علم وفن کے بارے میں عصبیت کا معاملہ نہیں کیا بلکہ جدید افکار ونظریات کا مطالعہ کیا اور ان میں مہارت پیدا کی''۔(۷)

(۸) عربی زبان وادب کے نصاب میں تبدیلی کے تعلق سے مولانا کا نظریہ یہ ہے ''کہ اگر ہمارے نصاب کا مقصد یہ ہے کہ قدیم درسی کتابوں کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو یہ نصاب کافی ہے اور اگر مقصد یہ ہے کہ کہ عالم عرب میں دعوتی کام کیا جائے، وہاں کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا جائے اور عربوں سے روابط قائم کئے جائیں، یا نئے لٹریچر کو چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے تو اس نصاب اور نظام میں تبدیلی ضروری ہے''(۸)۔

(۹) مغرب نے عوام کو خواہ جوان ہوں یا بچے ان پر اپنا پنجہ جمانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپنائے خصوصا عالم اسلام پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے خواہ وہ اپنا تیار کردہ نصاب تعلیم ہو یا ٹی وی پر نشر ہونے والے کارٹون وغیرہ مقصد صرف یہی ہے کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کے قلوب کو اسلام سے منحرف کیا جائے۔

مولانا کے نزدیک مغرب کا کارٹون والا حربہ دیگر تمام حربوں سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں'' حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ کہ نوخیز بچوں کی عمدہ تعلیم وتربیت کے لئے نہایت موثر ودل آویز اور دلچسپ ادبی کتابیں تصنیف کی جائیں''۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تحریرات وتصنیفات سے عالم اسلام کو باخبر کیا ہے کہ دشمنان اسلام ایسے ایسے طریقے اختیار کر رہے جو بظاہر ہمیں مفید وبھلے نظر آتے ہیں لیکن ان کے نتائج ایسے ہوں گے جو نسلوں کو اسلام سے بہت دور تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیں گے لہذا ہمیں دشمنان اسلام کی یلغار سے خود کو اور اپنی نسلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے مولانا کے بیان کردہ تمام اسباب پر غور وفکر کرنا ہوگا اور تدارک کے تمام طریقوں کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔

مراجع

(۱) ندوی، مولانا واضح رشید حسنی، مسئلہ فلسطین، سامراج اور عالم اسلام، دارالرشید لکھنوء، ۲۰۱۱ء، ص ۷

(۲) ندوی، مولانا واضح رشید حسنی، نظام تعلیم وتربیت، اندیشی، تقاضے اور حل، دارالرشید لکھنوء، ۲۰۱۳ء، ص ۵۸

(۳) مذکورہ بالا، ص ۵۹

(۴) ندوی، مولانا واضح رشید حسنی، اسلام مکمل نظام حیات، دارالرشید لکھنوء، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰

(۵) نظام تعلیم وتربیت، اندیشی، تقاضے اور حل، ص ۶۷

(۶) مذکورہ بالا، ص ۵۷، ۶۷

(۷) مذکورہ بالا، ص ۹۰

(۸) مذکورہ بالا، ص ۱۰۶، ۱۰۷

(۹) مذکورہ بالا، ص ۱۳۶

☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے تحریر کردہ پیش لفظ اور مقدمے-ایک جائزہ

عبدالہادی اعظمی ندوی
شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ (1933ء 2019ء) جید عالم دین وصاحب بصیرت مفکر، عربی ادیب وصحافی اور صاحب قلم تھے۔ متعدد اردو اور عربی کتابیں تالیف کرنے کے علاوہ آپ نے دوسرے مؤلفین کی اردو وعربی کتابوں پر پیش لفظ، مقدمہ وعرض ناشر وغیرہ کے عنوان سے کلمات بھی تحریر کیے۔ یہ تحریریں مختصر بھی ہیں اور مفصل بھی۔ پیش نظر مقالہ میں دوسرے مؤلفین کی کتابوں پر پیش لفظ، تقریظ یا عرض ناشر وغیرہ کے عنوان سے مولانا نے جو تحریریں لکھی ہیں، ان کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے، نیز آخر میں ان کتابوں کی وضاحتی فہرست بھی درج کردی گئی ہے۔

مولانا کے تحریر کردہ پیش لفظ ومقدمے وغیرہ کی تصحیح تعداد تو معلوم نہ ہوسکی، البتہ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تعداد سو سے متجاوز ہی ہوگی۔ مجھے جو فہرست دستیاب ہوسکی ہے اس میں کل 51 / کتابوں- 37 / اردو اور 14 /عربی کتابوں- کی تفصیلات موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقدمے اور پیش لفظ وغیرہ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی 15 / کتابوں اور مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کی مرتب کردہ 8 /کتابوں پر ہیں۔

مولانا کے تحریر کردہ مقدمے اور پیش لفظ وغیرہ مختصر بھی ہیں اور مفصل بھی۔ اردو میں لکھے مفصل اور قابل ذکر مقدموں میں "تاریخ اصلاح وتربیت (جلد اول)" (مؤلفہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، مقدمہ دوم 40-56)، "رہبر انسانیت" (مؤلفہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، عرض ناشر 15-27)، "اسلامی معاشرہ سورۂ حجرات کی روشنی میں" (مؤلفہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مقدمہ 10-23)، "حیات عبدالباری (ندوی)" (مؤلفہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، تقریظ: 21-31)، "تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی" (مرتبہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، تقریظ 16-23)، "قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل" (مؤلفہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مقدمہ: 19-27)، اور مولانا رئیس الشاکری کے نعتیہ شعری مجموعہ " کوثر" (تقریظ:29-36) پر لکھے گئے کلمات قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح عربی میں "فی ظلال السیرۃ" (مؤلفہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، کلم؟ الناشر: 2-9)، "الإعلام الغربی وتأثیرہ علی المجتمع" (مؤلفہ مولانا نذر الحفیظ الندوی، تعریب: حسیب الرحمٰن مجیب الندوی، مقدمۃ: 5-13) اور "المفسر عبدالماجد الدریابادی وتفسیر" (مؤلفہ عبدالحیط الخطیب الندوی، المقدمۃ: 13-18) پر تحریر کردہ مقدمے قابل ذکر ہیں۔

موضوع کے حساب سے اگر دیکھیں تو سب سے زیادہ تذکرہ و سوانح کی 12 / کتابوں پر پیش لفظ وغیرہ تحریر کیے ہیں۔ سیرت نبوی کی تین کتابوں، رد قادیانیت کے موضوع پر دو کتابوں کے علاوہ فکر اسلامی، اسلامیات، فقہ، ادب اور مقالات کے موضوع سے متعلق کتابوں پر مقدمے تحریر کیے ہیں۔

مولانا نے اپنے مفصل مقدموں میں موضوع کی ضرورت واہمیت کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اس کتاب کے امتیازات وخصائص اور اس کے پس منظر کو بخوبی اجاگر کیا ہے تاکہ قاری موضوع کی اہمیت سے واقف ہوتے ہوئے کتاب سے حتی الامکان خوب استفادہ کر سکے۔ مثلاً سیرت کی کتابوں میں "رہبر انسانیت" (مؤلفہ مولانا سید محمد

رابع حسنی ندوی) کے مقدمہ میں آپ نے آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ ذکر کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ "رحمت و مودت، شفقت و ملاطفت، دلداری، خیر پسندی ودلنوازی اورعفوودرگزر اسلام کی بنیادی او رنمایاں صفات ہیں"، اسی طرح نبی کریم ﷺ "مکارم اخلاق، نوازش وکرم گستری اورتواضع میں ساری انسانیت کے امام ومقتداوپیشوا تھے"، نیز یہ کہ "بنی نوع انسان میں محاسن اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلی و افضل ہستی رسول کی ہے"، بعض انصاف پسند مغربی مصنفین نے سیرت نبوی کے اس پہلو کو اپنی تصنیفات میں نمایاں کیا ہے، لیکن اس کے برعکس دوسرے غیر مسلم مغربی مصنفین نے "سیرت نبوی کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کیا اور پوری زندگی کو چھوڑ کر آخری عہد کے چند واقعات کو جو انتظامی یا تادیبی یا سماج کی اصلاح وتربیت کے تھے، سیرت کا بنیادی حصہ قرار دیا اور ان تادیبی، دفاعی اور انتظامی کارروائیوں سے استدلال کر کے بڑی دیدہ دلیری سے اور دیدہ ودانستہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی آپ (نعوذ باللہ) تشدد اور طاقت کے استعمال کے داعی تھے، اور اسلام تشدد اور جبر کی تعلیم دیتا ہے"۔ (رہبر انسانیت، ص 19-20) مستشرقین کے سیرت نبوی پر زہریلے مواد کا نقد کرتے ہوئے نیز ایک ایسی سیرت کی کتاب کی ضرورت بیان کرتے ہوئے جو سیرت نبوی کے تقریبا ہر پہلو کو بیان کرتی ہو، نیز اس میں صرف غزوات نبوی پر ہی اکتفا نہ ہو، کتاب "رہبر انسانیت" کی خصوصیات اوراس جیسی دوسری کتابوں کی تالیف کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔

"قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل" کے مقدمہ میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم اپنی زبان و بیان اور مضامین کے اعتبار سے ہر زمانہ میں بحث وتحقیق کا موضوع رہا ہے، نیز قرآن کریم اعجاز بیانی کے ساتھ رشد وہدایت، علم وفکر، اخبار بالغیب، امم سابقہ کا تذکرہ، غلط تصورات اور معتقدات کی تصحیح کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔ قرآن کریم پر ہر دور میں کسی نہ کسی ناحیہ سے کام ہوا ہے، اور حسب ضرورت دعوتی نقطہ نظر سے بھی کام ہوا ہے اور بہت سے لوگ اس کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے، اس کی مثالیں بیان کرنے کے بعد مولانا نے ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم سے متعلق جو غلط فہمیاں غیر مسلموں میں ہیں، ان کو دور کرنے کی ضرورت ہے، اور قرآن کریم کے "ھدی للناس" ہونے کے خلاف جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس کے رد میں بھی لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد "قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل" کی ضرورت اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے کتاب کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

"تاریخ اصلاح وتربیت (جلد اول)" (مؤلفہ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی) پر اپنے مفصل مقدمہ میں عہد نبوی، خلاف راشدہ اور صحابہ کرام کی چند اہم خصوصیات کو ذکر کرتے ہوئے اسلام کی روشن تاریخ کی چند جھلکیاں پیش کر کے "تاریخ اصلاح وتربیت" کی تالیف کی ضرورت واہمیت بیان کی ہے۔ کتاب "جزیرۃ العرب" کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں انھوں نے کلمۃ الناشر کے عنوان سے جزیرۃ العرب کی تاریخی وجغرافیائی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ادبی و دینی اہمت کو بھی اجاگر کیا ہے اور متعدد قدیم عربی شعراء کے کلام کو بھی بطور استشہاد پیش کیا ہے۔ اسی طرح "متاع دین ودانش" کے مقدمہ میں انھوں نے ہندوستان وعالم اسلام کے تناظر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی آراء ونقطۂ نظر کی صداقت کا ذکر کر کے حضرت مولاناؒ کی بصیرت اور عالم اسلام کے حالات کے رخ پر گہری نظر کا اعتراف کیا ہے۔

یہ مولانا کے تحریر کردہ پیش لفظ ومقدموں کی چند مثالیں تھیں۔ بہر حال، اس مختصر سے مضمون میں اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کے مقدموں کی چند خصوصیات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں:

(۱) مولانا کے تحریر کردہ پیش لفظ ومقدمے وغیرہ کی تصحیح تعداد تو معلوم نہ ہوسکی، البتہ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تعداد سو سے متجاوز ہی ہوگی۔

(۲) مولانا نے مختصر اور طویل دونوں طرح کے پیش لفظ اور مقدمے وغیرہ تحریر کیے۔

(۳) مختصر مقدموں میں بہت اختصار سے متعلقہ کتاب کا تعارف کرایا ہے۔

(۴) مفصل اور طویل مقدموں میں انھوں نے تفصیل سے موضوع پر

روشنی ڈالی اور پس منظر بیان کرتے ہوئے کتاب کی تالیف کی ضرورت واہمیت بیان کی ہے۔

(۵) ان کی دیگر تحریروں کی طرح ان کے تحریر کردہ مقدمے اور پیش لفظ وغیرہ بھی اسلوب کی سادگی اور تصنع ولفاظی سے پرہیز کی عمدہ مثالیں ہیں۔

(۶) مولانا کے تحریر کردہ پیش لفظ وغیرہ سے موضوع پر آپ کی گہری نظر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

فہرست عربی پیش لفظ و مقدمے وغیرہ

(۱) أضواء علی الطریق، محمد الحسنی، مجمع الإمام أحمد بن عرفان الشهید-رائے بریلی، الطبعة الأولی: 1424/2003م، 232ص، المقدمة:3-8

(۲) الإعلام الغربي وتأثیره علی المجتمع، نذر الحفیظ الندوی الأزهری، تعریب: حسیب الرحمٰن مجیب الندوی، مرتبة الصفاء-أبوظبی، الطبعة الأولی:1430/2009م، 348ص، مقدمة:5-13

(۲) إلی الحیاة من جدید، الجزء الأول، الأستاذ عبدالعزیز البدوی، أخراج وتقدیم: محمد کلیم الدین الکاشفی الندوی، جمعیة الإمام أبي الحسن الندوی للتعلیم والثقافة العربیة-أورنک آباد، 1426/2005م، 124ص، تقدیم الکتاب:5-8

(۴) تحفة الأدب من نوادر الخطب، السید جاوید أحمد الندوی، مؤسسة الثقافة واللغة-لکناؤ، الطبعة الأولی 1429/2008م، 200ص، مقدمة الکتاب:5-8

(۵) جزیرة العرب – تاریخیا، ثقافیا وجغرافیا، محمد الرابع الحسنی الندوی، تعریب: محمد فرمان الندوی، المجمع العلمی الإسلامی-لکناؤ، الطبعة الأولی 1439/2017م، 224ص، کلمة الناشر:3-5

(۶) الشیخ عبدالباری الندوی – العالم الفلسفی الکبیر والدعیة المعلم الحکیم – حیاته وآثاره، محمود حسن الحسنی الندوی، تعریب: عطاء الرحمٰن حفظ الرحمٰن الندوی، المجمع العلمی الإسلامی-لکناؤ، الطبعة الأولی 2015م، 308ص، تصدیر الطبعة العربیة 12-20

(۷) العالم الإسلامی الیوم- قضایا وحلول، محمد الرابع الحسنی الندوی، المجمع الإسلامی العلمی-لکناؤ، الطبعة الثانیة: ??1432/2011م، 236ص، کلمة تقدیم:6-9

(۸) فی ظلال السیرة (علی صاحبها ألف ألف تحیة وسلام)، محمد الرابع الحسنی الندوی، المجمع العلمی الإسلامی-لکناؤ، الطبعة الثانیة 2011م، 188ص، کلمة الناشر:2-9

(۹) کشاف مجلة البعث الإسلامی، إعداد وتقدیم: السید أزهر حسین الندوی، مؤسسة إحیاء العلم والدعوة-لکناؤ، الطبعة الأولی: ذو الحجہ1430/دسمبر2009م، 438ص، تقدیم:9-10

(۱۰) کن خطیبا، الجزء الثانی، رحمة اللہ أصغر النیبالی، مکتبة الکتاب والسنة-رائے بریلی، الطبعة الأولی 1428/2007م، 184ص، تقدیم:13-18

(۱۱) المجتمع الإسلامی: حدوده وآدابه فی ضوء سورة الحجرات، محمد الرابع الحسنی الندوی، تعریب: محمد فرمان الندوی، المجمع العلمی الإسلامی-لکناؤ، الطبعة الأولی 2018م، 80ص، کلمة الناشر:5-6

(۱۲) مختصر القدوری فی ثوبه الجدید، للإمام أبوالحسین القدوری البغدادی، علق علیه: الشیخ نظام الدین الکیرانوی، المجمع الفقهی للعلامة عبدالحی الفرنکی محلی-لکناؤ، الطبعة الأولی 1430/2009م، 324ص، تقدیم الکتاب:17-18

(۱۳) المفسر عبدالماجد الدریابادی وتفسیره، عبدالحیط الخطیب الندوی، مؤسسة الصدق-لکناؤ، الطبعة الأولی 1430/2009م، 144ص، المقدمة:13-18

(۱۴) نفحات من الأدب الإسلامی، محمد طارق الأیوبی الندوی، مؤسسة العلامة أبي الحسن الندوی التعلیمیة والخیریة-علی کرہ، الطبعة الأولی: دیسمبر 2009م، 164ص، نفحات من الأدب الإسلامی للدارس محمد طارق الأیوبی الندوی:6-8

فہرست اردو پیش لفظ و مقدمے وغیرہ:

(۱۵) اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء، سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مکتبۃ الشباب العلمیہ-لکھنؤ، طبع دوم: 2014ء، 264ص، تقریظ18-21

(۱۶) اسلامی معاشرہ سورہ حجرات کی روشنی میں، سید محمد رابع حسنی ندوی، مرتب: محمد ارمغان بدایونی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی، طبع اول: 1438ھ/2018ء، مقدمہ 10-23

(۱۷) بین الاقوامی معلومات (جنرل نالج)- 2010ء مطابق 1431ھ، حصہ دوم، سید عنایت اللہ ندوی، مکتبہ دارین-لکھنؤ، 2010ء، 254ص، مقدمہ: 9-10

(۱۸) تاریخ اصلاح وتربیت (جلد اول)، سید محمود حسن حسنی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی، طبع اول رمضان 1436ھ/ جولائی 2015ء، 656ص، مقدمہ دوم 40-56

(۱۹) تجدید معاشرت (یعنی تجدید دین کامل)، حصہ اول، عبدالباری ندوی، ترتیب جدید: محمود حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، طبع اول 1431ھ/ 2010ء، 302ص، عرض ناشر: 11-18 (یہی عرض ناشر بعنوان: مقدمہ (برائے طبع جدید) کے عنوان سے اس کتاب کے دوسرے حصہ – مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ اشاعت 2010ء میں صفحہ 18-25 موجود ہے۔)

(۲۰) تحریک آزادی میں علماء کا کردار (1857ء سے پہلے)، فیصل احمد بھٹکلی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، طبع اول: ربیع الاول 1424ھ/ جون 2003ء، 582ص، ابتدائیہ: 11-14

(۲۱) تحفہ جنوب، سید محمد رابع حسنی ندوی، ترتیب: سید محمد امین حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، طبع اول 1436ھ/ 2015ء، 104ص، پیش لفظ 10-12

(۲۲) تحفہ رمضان، سید محمد رابع حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، طبع اول 1429ھ/2008ء، 48ص، عرض ناشر: 4-6

(۲۳) تحفہ گجرات، سید محمد رابع حسنی ندوی، ترتیب: سید سبحان ثاقب ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، طبع اول 1433ھ/ 2012ء، 78ص، عرض ناشر: 4-6

(۲۴) تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، سید ابو الحسن علی ندوی، ترتیب: سید محمود حسن حسنی ندوی، ناشر: سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی، طبع اول: رمضان 1437ھ/ جون 2016ء، 160ص، تقریظ 16-23

(۲۵) تذکرہ مفکر اسلام (مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے افراد خاندان کا ایک دل آویز مرقع)، سید عبد اللہ حسنی ندوی، ترتیب وپیشکش: محمد ارمغان بدایونی ندوی، ناشر: سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی، طبع اول: ربیع الثانی 1436ھ/فروری 2015ء، 136ص، مقدمہ: 11-13

(۲۶) تذکرہ مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی؛ سد ومحمود حسن حسنی ندوی؛ مکتبۃ الشباب العلمیہ-لکھنؤ؛ 2016ء/1436ھ، 200ص، مقدمہ 17-19

(۲۷) حیات عبد الباری (ندوی)، سید محمود حسن حسنی ندوی، مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء-لکھنؤ، 1430ھ/ 2009ء، 384ص، تقریظ: 21-31

(۲۸) خطبات رابع (عہد حاضر اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں)، (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے خطبات کا مجموعہ)، جمع و ترتیب: محمد کاظم ندوی، علی میاں اکادمی-لکھنؤ، طبع اول جنوری 2011ء، 504ص، مقدمہ: 19-24

(۲۹) دعوت فکر ونظر، جعفر مسعود حسنی ندوی، ترتیب: محمد امین حسنی ندوی، دار الرشید-لکھنؤ، طبع اول ستمبر 2015ء، 200ص، تقریظ 12-13

(۳۰) رہبر انسانیت، سید محمد رابع حسنی ندوی، دار الرشید-لکھنؤ، طبع چہارم: 2012ء، عرض ناشر 15-27

(۳۱) سوانح حضرت مولانا ابرار الحق حقی، محمود حسن حسنی ندوی، صدق فاؤنڈیشن-لکھنؤ، طبع اول: مئی 2007ء، 248ص، مقدمہ: 20-25

(۳۲) سیرت امہات المؤمنین، محمد حمزہ حسنی ندوی، مکتبہ امامہ حسنی-رائے بریلی، طبع ول: 1434ھ/ 2012ء، 168ص، مقدمہ: 7-13

(۳۳) سیرت صحابہ کے چند نقوش، عبد اللہ عباس ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، 1427ھ/ 2006ء، 144ص، عرض ناشر: 4-6

(۳۴) سیرت فاروق اعظم، محمد معاذ حسینی ندوی، مکتبہ امامہ حسنی-رائے بریلی، طبع اول: 1434ھ/ 2012ء، 256ص،تقریظ:18-23

(۳۵) سیرت محمدی انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ،محمد رابع حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، بار اول: ربیع الاول 1424ھ/مئی2003ء،44ص،مقدمہ4-9

(۳۶) صحاح ستہ اوران کے مصنفین-امتیازات وخصوصیات، بلال عبدالحی حسنی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی،طبع اول: ذی القعدہ 1436ھ/اگست 2015ء، 144ص، مقدمہ:9-11

(۳۷) عالم اسلام اور سامراجی نظام-امکانات اندیشے اور مشورے، سید محمد رابع حسنی ندوی،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، جدید ایڈیشن2010ء،256ص،عرض ناشر:5-6

(۳۸) عائشہ بی،محمود حسن حسنی ندوی، مکتبہ سیدہ امامہ حسنی-رائے بریلی،باراول1434ھ-2012ء،328ص،تقریظ16-22

(۳۹) عیسائیت یورپ اور امریکہ تاریخ کے آئینے میں،سید عنایت اللہ ندوی، ادارہ احیائے علم و دعوت- لکھنؤ،طبع اول: 1430ھ/2009ء،112ص،مقدمہ:14-20

(۴۰) فرشتہ صفت انسان،عبدالباری ندوی،ترتیب وحواشی: سید محمود حسن حسنی ندوی،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، ربیع الاول 1430ھ/ مارچ 2009ء، 144ص، مقدمہ طبع جدید:15-19

(۴۱) قادیانیت ایک حقیقت پسندانہ جائزہ،تالیف: طلب؟ جموں و کشمیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،مکتبہ ندوہ احیاء السنۃ ونصرہ الدین- سرینگر،طبع اول: جنوری 2010ء، 208ص؛ ابتدائیہ:22-29

(۴۲) قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل،سید محمد رابع حسنی ندوی، دارالرشید-لکھنؤ،طبع اول: 1433ھ/ 2012ء، 368ص،مقدمہ:19-27

(۴۳) کوثر (نعتیہ شعری مجموعہ)،رئیس الشاکری، ناشر:محمد فیضان نگرامی ندوی،طبع اول:2009ء،168ص،تقریظ:29-36

(۴۴) مالیات کا اسلامی نظام، ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی، بار اول، 1425ھ/ 2004ء، 68ص،مقدمہ5-8

(۴۵) متاع دین ودانش (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے لیے گئے انٹرویوز کا مجموعہ)،مرتبہ عبدالہادی اعظمی ندوی،سید احمد شہید اکیڈمی-رائے بریلی،طبع اول 1435ھ/ 2014ء ،351ص،مقدمہ14-16

(۴۶) مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی باطل عقائد ناپاک سازشیں، شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی،مکتب؟ الشباب-لکھنؤ، غیر مورخہ،120ص،مقدمہ:9-14

(۴۷) مصائب کی یورش،آفات کا تسلسل اس کے اسباب اور علاج، شمس الحق ندوی، ناشر: فضل الرحمٰن ندوی-لکھنؤ،طبع اول: 1426ھ/2005ء،40ص،مقدمہ:3-10

(۴۸) مقالات و مشاہدات،محمد مسعود عزیزی ندوی، دار الجوث والنشر ،سہارنپور،1429ھ/2008ء ،200ص،پیش لفظ:22-23

(۴۹) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عہد ساز شخصیت مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں،سید محمد رابع حسنی ندوی،مجلس تحقیقات و نشریات اسلام-لکھنؤ،طبع دوم ذی الحجہ 1427/ جنوری 2007ء،360ص،عرض ناشر:5-8

(۵۰) میزان عمل- صحیح بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس،سید محمد رابع حسنی ندوی، مرتب: شیخ احتشام الدین ندوی، مکتبہ امامہ حسنی-رائے بریلی،طبع اول: تاریخ ندارد، 32ص، مقدمہ5-6

(۵۱) یورپ امریکہ اور اسرائیل- ایک اظہار حقیقت،انکشاف اور تنبیہ،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ، بار اول: محرم 1418ھ/مئی1997ء،28ص،تعارف وتقدیم3-4

☆☆☆

ادب نبوی اور استاذ محترم مولانا واضح صاحب کا نقطۂ نظر

غیاث الاسلام صدیقی ندوی
شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی

استاذ گرامی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی وفات ہم سب کے لیے بڑا ہی افسوسناک حادثہ ہے جس نے قلب وضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور جس کی وجہ سے دل ودماغ ایک عجیب وغریب صدمہ سے دوچار ہے۔ مولانا ایک مشفق مربی، مخلص استاذ، عالمی حالات پر گہری نظر رکھنے والے ممتاز تجزیہ نگار، کہنہ مشق صحافی، عظیم المثال معلم، عربی زبان وادب کے بلند پایہ ادیب اور سادہ وپر کار انشاء پرداز تھے نیز وہ درجنوں عربی اور اردو کتابوں کے مؤلف تھے جن سے اہل علم عرصہ دراز تک استفادہ کرتے رہیں گے۔ ان سب سے بڑھ کر وہ ایک عالم باعمل انسان تھے جن کی پوری زندگی دین اور علم کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ اللہ تعالے ان کو اپنی شان کریمی کے مطابق بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، آمین۔ اس مقالے میں راقم سطور نے ادب نبوی سے متعلق مولانا علیہ الرحمہ کے نقطہ نظر کو موضوع سخن بنایا ہے۔ مولانا کو اس موضوع سے بڑی دلچسپی تھی لہذا کتنے ہی عربی واردو مقالات انہوں نے اس حوالہ سے سپرد قلم کیے جن کو ''البعث الإسلامی''، ''الرائد'' اور ''تعمیرت حیات'' وغیرہ مجلّات وجرائد میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سیرت نبوی پر مولانا علیہ الرحمہ کے قلم سے شائع ہوکر تین کتابیں مقبول عام وخاص ہوچکی ہیں پہلی کتاب ''مختصر الشمائل النبویۃ'' عربی میں ہے جو المجمع الاسلامی العلمی لکھنؤ سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب ''لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی'' بھی عربی میں ہے جو پہلی کتاب کے مقابلے میں قدرے تفصیلی ہے۔ وہ دارالرشید لکھنؤ سے ۲۰۱۰ میں شائع ہوئی۔ تیسری کتاب ''محسن انسانیت'' اردو میں ہے جو دارالرشید لکھنؤ سے ۲۰۱۲ میں شائع ہوئی۔

''لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی'' ایک جائزہ:

اس مقالے میں ''لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی'' کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب مختلف اوقات میں لکھے گئے عربی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض مقالات سیمیناروں کے لیے سپرد قرطاس کیے گئے تھے اور عربی مجلّات میں نشر ہوئے تھے۔ مؤلف علیہ الرحمہ نے اس کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے ایک جائزے پر مشتمل ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ ایسے مقالات پر مشتمل ہے جن میں رسول مقبول ﷺ کی ولادت باسعادت سے بعثت نبوی تک کے زمانہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر بنی نوع انسانی پر آپ ﷺ کے عظیم احسانات کا ذکر کرتے ہوئے سیرت نبوی میں سے عفوودرگذر اور رحمت ومحبت کے دلکش نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی مؤلف نے بڑے دلائل کے ساتھ اعدائے اسلام کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ انہوں نے مغرب کے بعض غیر جانبدار اہل قلم کے اقوال کو اس تائید میں پیش کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنی اعلے تعلیمات اور عظیم رسول ﷺ کے اخلاقی نمونوں کی وجہ سے پھیلا ہے اور یہ کہ اسلام دراصل لطف وکرم، محبت ورحمت، عدل واحسان اور نیکی کا مذہب ہے۔ کتاب کے اس حصے میں آپ ﷺ کی نبوت کے نتیجہ میں بنی نوع انسانی پر پڑنے والے چند

بڑے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی بڑے مؤثر انداز میں اس حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے کہ سیرت نبوی میں تمام انسانیت کے لیے تایوم قیامت کامل اسوہ موجود ہے۔

کتاب کے تیسرے حصہ میں ادب نبوی کا جائزہ لیا گیا ہے اور چوتھے حصہ میں اعدائے اسلام کے ان منصوبوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کا مقصد مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کی ذات سے دور کرنا ہے۔اسی طرح سنت نبوی کے خلاف دشمنوں کی سازشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے نیز مؤلف علیہ الرحمہ نے مغرب کے کئی منصف اہل قلم کا ذکر کیا ہے جنہوں نے آپ ﷺ کے کارہائے نمایاں کا اعتراف اور بنی نوع انسانی پر آپ ﷺ کے احسان کو تسلیم کیا ہے۔کتاب کے پانچویں حصے میں آپ ﷺ کی حیات طیبہ اور اس میں پیش آنے والے دوررس اثرات کے حامل واقعات وحادثات کو مختصرا پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح اساطین عرب اور مشہور صحابہ کرامؓ اور ان کی اولادوں سے متعلق کئی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔کتاب کے آخر میں سیرت نبوی پر لکھی جانے والی کتابوں پر ایک مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جس میں اس موضوع سے متعلق اہم مصادر کو ذکر کرنے کے بعد مصنف نے مختلف زمانوں میں سیرت پر کی جانے والی تصانیف کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے(مختصر کتابیں، درمیانی کتابیں اور بڑی کتابیں) اس کے بعد بالترتیب ان پر روشنی ڈالی ہے، پھر موجودہ زمانے میں اس موضوع پر عربی میں لکھی جانے والی ستر اہم کتابوں کے تذکرے کے ساتھ استاذ گرامی علیہ الرحمہ نے اپنی اس قیمتی تصنیف کو مکمل کیا ہے۔

دوسو چوبیس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نہایت عمدہ زبان استعمال کی گئی ہے اور بڑے علمی اسلوب میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔نیز اس موضوع کے سلسلے میں اہل یورپ کے طرز عمل سے بھی خوب بحث کی گئی ہے۔اس کتاب میں بعض وہ معلومات موجود ہیں جو اس موضوع پر لکھی جانے والی دیگر کتابوں میں نہیں ملتیں۔بلاشبہ یہ کتاب سیرت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔

ادب نبوی اور اس کی ادبی حیثیت:

اس کتاب ''لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی'' میں ادب نبوی کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا نے بتایا ہے کہ عربی ادب میں فصاحت وبلاغت اور تمام خوبیوں کے اعتبار سے قرآن مجید کے بعد حدیث نبوی کا ادب سب سے اعلے درجہ کے ادب ہے۔اس کی تائید میں انہوں نے کئی حدیثیں پیش کی ہیں پھر ادب نبوی کے حوالہ سے کئی عرب ادباء کے زریں اقوال کے اقتباسات ان کی معرکۃ الآراء کتابوں سے پیش کیے ہیں۔ برسبیل مثال جاحظ نے اپنی کتاب ''البیان والتبیین'' میں ادب نبوی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''وہ ایسا کلام ہے جس میں حروف کم اور معانی زیادہ ہیں، تکلف وتصنع سے پاک ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آپ ﷺ کی زبانی کہلوایا گیا ہے" وما انا من المتکلفین" (ترجمہ: میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)۔ جہاں پر وضاحت کی ضرورت ہوتی وہاں آپ ﷺ شرح وتفصیل سے گفتگو فرماتے اور جہاں اختصار سے بات مکمل ہوجاتی وہاں مختصر گفتگو پر اکتفاء کرتے۔آپ ﷺ غیر معروف الفاظ کے استعمال سے کنارہ کشی فرماتے، بازارانہ طرز گفتگو سے پرہیز کرتے۔آپ ﷺ کی گفتگو حکمت سے بھرپور، پاکبازی، زور بیان اور آسان اسلوب سے عبارت ہوتی تھی''۔(لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی، صفحہ ۱۲۲)

اسی طرح دیگر ادباء کے اقوال ذکر کرنے کے بعد مؤلف علیہ الرحمہ نے یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ آپ ﷺ کا اسلوبِ گفتگو الہامی تھا جس کی نشوونما قرآن کے طرز پر ہوئی تھی۔اور جس طرح آپ قرآن کے عملی نمونہ تھے اسی طرح آپ کا کلام بھی قرآن کریم کا آئینہ دار ہے۔ کسی دوسرے انسان کا کلام آپ ﷺ کے اسلوب کلام کی برابری نہیں کرسکتا۔(لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی، صفحہ ۱۲۴)

بعدازاں ادب نبوی پر مؤلف علیہ الرحمہ نے یوں روشنی ڈالی ہے:''حدیث نبوی مختلف موضوعات پر مشتمل ہے اس میں احکامات کا بیان ہے تو کہیں اسلامی تعلیمات اور قرآنی نصوص کی تشریح ہے اور

کہیں اسلام اور اس کی دعوت کی وضاحت کے لیے قصوں اور تمثیلات کا بیان ہے۔ کہیں ہلاکت سے خبردار کیا گیا ہے تو کہیں کامیابی کی بشارت ہے۔ اس میں جابجا جنت وجہنم، جزاء وسزا کا بیان، گذشتہ قوموں کے حالات اور آئندہ آنے والی قوموں کی خبریں پائی جاتی ہیں نیز قیامت اور اس کی نشانیوں کا بیان، عبادات واخلاق اور معاملات کی وضاحت، انسانی طبیعت اور اس کے مختلف حالات کی نشان دہی اس میں موجود ہے''۔(لمحات من السیر ۃ النبویۃ والأدب النبوی،صفحہ۱۲۴) اب ادب نبوی سے متعلق جونمونے اس کتاب میں پیش کیے گئے ان میں سے چندمندرجہ ذیل سطور میں ملاحظہ ہوں۔

ادب نبوی میں جذبہ خود پسندی کی بیخ کنی:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشادفرماتے سنا: ''قیامت کے دن سب سے پہلے ایک شہید آدمی کا فیصلہ ہوگا اسے پیش کیا جائے گا۔اللہ تعالے اپنی نعمتیں شمار کرانے کے بعداس سے دریافت فرمائے گا: ''ان نعمتوں میں تم نے کیا عمل کیا؟'' وہ جواب دے گا: ''میں نے تیرے راستے میں قتال کیا یہاں تک کہ میں شہید کردیا گیا''۔اللہ تعالے فرمائے گا: ''تم نے جھوٹ کہا ۔تم نے تو یہ اس لیے کیا تھا تاکہ تم کو بہادر کہاجائے ۔تو یہ کہاجاچکا''۔پھراس کے متعلق حکم صادر ہوگا اوراسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔اس کے بعد ایسے آدمی کو پیش کیا جائے گا جس نے علم سیکھا اور سکھایا ہوگا اور قرآن کی تلاوت کی ہوگی اللہ تعالے اپنی نعمتیں شمار کرانے کے بعداس سے دریافت فرمائے گا: ''ان نعمتوں میں تم نے کیا عمل کیا؟'' وہ جواب دے گا: ''میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیری خوشنودی کے لیے قرآن کی تلاوت کی''۔اللہ تعالے فرمائے گا: ''تم نے جھوٹ کہا۔تم نے تو علم اس لیے حاصل کیا تھا تاکہ تم کو عالم کہاجائے اور قرآن کی تلاوت اس لیے کی تھی کہ تم کو قاری کہاجائے۔تو یہ کہاجاچکا''۔پھراس کے متعلق حکم صادر ہوگا اوراسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔اس کے بعد ایسے آدمی کو پیش کیا جائے گا جس کو اللہ نے خوب وسعت دی ہوگی اور مال ودولت سے خوب نوازا ہوگا۔اللہ تعالے اپنی نعمتیں شمار کرانے کے بعداس سے دریافت فرمائے گا: ''ان نعمتوں میں تم نے کیا عمل کیا؟'' وہ جواب دے گا: ''ہر وہ راستہ جس میں خرچ کرنا تجھے پسند تھا میں نے اس میں خوب خرچ کیا''۔اللہ تعالے فرمائے گا: ''تم نے جھوٹ کہا۔تم نے تو یہ اس لیے کیا تھا تاکہ تم کو سخی کہاجائے ۔تو یہ کہاجاچکا''۔پھراس کے متعلق حکم صادر ہوگا اوراسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیاجائے گا''۔(مسلم، حدیث نمبر:۴۹۲۳)(لمحات من السیر ۃ النبویۃ والأدب النبوی،صفحہ۱۲۶)

مذکورہ بالا حدیث کو مؤلف علیہ الرحمہ نے ادب نبوی کے نمونہ کے طور پیش کیا ہے۔اس میں جہاں ایک طرف ادب نبوی کا خوبصورت نمونہ موجود ہے وہیں دوسری طرف مؤلف علیہ الرحمہ کی زندگی پر اس حدیث کا اثر بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے کیونکہ علم وکمال کے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود تواضع اور بے نفسی میں وہ اپنی مثال آپ تھے گویا نام ونمود سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔اس بات کو ان سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ بخوبی جانتے ہیں اور راقم سطور خود بھی اس بات کا عینی شاہد ہے۔

ادب نبوی میں قصوں کی اہمیت:

ادب نبوی میں غار والے تین لوگوں کا قصہ ملتا ہے جو ایک پہاڑ کے ایسے غار میں قید ہوگئے تھے جس کا منہ ایک بڑی چٹان کے گرنے سے بند ہوگیا تھا۔ان لوگوں کو یقین ہوگیا تھا کہ اللہ کے علاوہ اب کہیں سے مدد نہیں مل سکتی۔لہذا ان میں سے ہر آدمی نے اپنے کیے ہوئے کسی اچھے کام کا ذکر کرکے اللہ سے یوں دعا مانگی کہ ''اے اللہ اگر یہ کام میں نے تیری خوشنودی کے لیے کیا ہے تو جس مصیبت میں ہم گرفتار ہیں اس سے نجات عطا فرما'' چنانچہ ہر آدمی کی دعا پر چٹان تھوڑی سی سرک جاتی اور غار کا منہ تھوڑا سا کھل جاتا یہاں تک کہ تیسرے شخص کی دعا پر راستہ پورے طور پر صاف ہوگیا اور ان لوگوں کو اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ان لوگوں کی اس سرگذشت میں جہاں ان کی نفسانی کیفیت کی عکاسی پائی جاتی ہے وہیں دوسری طرف موجودہ زمانے کی قصہ نگاری کی مثال بھی ادب نبوی میں ملتی ہے۔(لمحات من السیر ۃ النبویۃ والأدب النبوی،صفحہ۱۲۶)

غاروالوں کا قصہ ذکر کرنے کے بعد مؤلف علیہ الرحمہ نے ادب نبوی میں موجود ایک اور قصہ کو بیان کیا ہے جس میں کوڑھ پن کے مریض، گنجے پن کے مریض اور ایک اندھے آدمی کا ذکر ہے۔اس قصہ کو ذکر کرنے سے پہلے مولانا دونوں قصوں کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''گذشتہ حدیث میں تین شکرگذار لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے اپنے صالح اعمال کی بدولت مصیبت سے نجات حاصل کی تھی۔آئندہ آنے والی حدیث میں ایسے تین لوگوں کا ذکر ہے جن کی تکلیف کو دور کرنے کے ذریعہ ان کو آزمایا گیا اور اللہ نے ان پر انعام کیا۔لیکن ان میں سے دو شخصوں نے ناشکری کی اور تیسرا شخص شکرگزاری بجالایا۔لہذا ناشکروں سے نعمت واپس لے لی گئی اور شکرگزار کی نعمت باقی رہی۔''(لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی،صفحہ۱۲۸) حدیث نبوی میں مذکور یہ واقعات کے اپنے قاری کو اخلاص کے ساتھ اچھے عمل کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔اسی طرح مشکل لمحات میں اپنے نیک کاموں کا ذکر کرکے اللہ سے دعا کرنے کا عملی نمونہ ان میں موجود ہے۔نیز اپنی حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھتے ہوئے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر شکرگزاری کا جذبہ بھی ان جیسے واقعات کے ذریعہ پروان چڑھتا ہے۔

ادب نبوی میں خیروشر کا معیار:

حضرت اسماء بنت یزید انصاریہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:'' کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ تم میں اچھے لوگ کون ہیں؟''صحابہ کرامؓ نے عرض کیا:'' کیوں نہیں اے اللہ کے رسول''۔ آپ ﷺ نے فرمایا:''تم میں اچھے وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو اللہ یاد آجائے''۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا:''کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ تم میں برے لوگ کون ہیں؟''صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:''تم میں برے وہ لوگ ہیں جو غیبت کرتے ہیں، محبت کرنے والوں میں پھوٹ ڈالتے ہیں اور بے گناہوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔'' (مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر:۲۷۶۰۱)اس حدیث سے متعلق مولانا رقم طراز ہیں کہ آپ ﷺ نے ذہنی اور نفسانی حالات کی اس طرح تشخیص کی ہے کہ آپ ﷺ کے بیان کے ذریعہ سامعین کو ان حالات کا مشاہدہ ہونے لگا۔ (لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی،صفحہ۱۳۲)

حضرت ابوشریح عدویؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جوکوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا اکرام کرے۔جوکوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔جوکوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ بہتر بات کہے یا پھر خاموش رہے۔(البخاری، حدیث نمبر:۶۰۱۹،مسلم، حدیث نمبر:۱۷۳-۱۷۶) (لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی،صفحہ۱۳۴)

مؤلف علیہ الرحمہ نے اسی طرح ادب نبوی میں سے کئی قصوں اور منتخب حدیثوں کو بیان کیا ہے جن سے ریا، لالچ، خودپسندی اور قساوت قلب جیسی مختلف انسانی کمزوریوں اور اخلاقی بیماریوں کی واقفیت ہوتی ہے اور ان کے علاج کی طرف رہنمائی ملتی ہے نیز یہ واضح ہوتا ہے کے سیرت نبوی کا سب سے اہم عناصر رحم وکرم، محبت ومودت، عدل وانصاف اور فکرآخرت ہیں۔اس کی تائید میں مولانا نے قرآن مجید کی بہت سی آیات کا ذکر کیا ہے مثلا ملاحظہ ہو: سورہ آل عمران، آیت: ۱۵۹، سورہ فتح، آیت: ۲۹، سورہ فرقان، آیت: ۶۳، سورہ مؤمنون، آیت: ۱تا۱۱۔

ادب نبوی اور مغرب کے اہل فکر:

مولانا نے سیرت نبوی پر ہونے والے اعتراضات اور اس سلسلے میں مغربی روش کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا جس کو انہوں نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔انہوں نے کئی یورپی مؤلفین کا شمار کرایا ہے جن میں ولیم میور، واشنگٹن ایرفنج، جے آبری، الفرڈ جیوم، فلپ حتی اور مرغول یوتھ وغیرہ شامل ہیں۔مولانا نے ان لوگوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ سیرت نبوی پر ان لوگوں کی تالیفات کا اصل مقصد مسلمانوں کو رسول ﷺ کی ذات سے دور کرنا ہے اور دلوں سے ان کی عقیدت ومحبت کو ختم کرنا ہے۔اکثر یورپی سیرت نگاروں نے آپ ﷺ کی سیرت میں سختی، سزا اور مؤاخذہ جیسے پہلوؤں کو بہت زیادہ نمایاں کیا

ہے اور رحم ودرگذر اور اکرام واحسان جیسے گوشوں سے اعراض کیا ہے۔ مغرب کی طبعیت میں کمزوری ہے اور کمزور ہمیشہ بدزبانی پر اتر آتا ہے جبکہ ہمت والا عفو ودرگزر سے کام لیتا ہے۔ مغرب نے اسلام کے خلاف مکر وفریب افتراء پردازی اور ریشہ دوانیوں کا طریقہ اختیار کیا ہے اور خصوصا آپ ﷺ کی سیرت کو نشانہ بنایا ہے۔ علوم وفنون میں جہاں یورپ کا طریقہ ایک حد تک محققانہ اور غیر جانبدارانہ ہے وہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اندھی تقلید کا شکار ہے۔ اسلام کے خلاف پہلے کے متعصب یورپی اہل قلم نے جو کچھ لکھ دیا ہے آج یورپ اسی پر قائم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ نئے سرے سے اسلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرے اس طرف برطانیہ کے وزیر اعظم نے انڈونیشیا میں اپنی ایک تقریر کے دوران اشارہ کیا تھا کہ ''مغرب اور اسلامی دنیا کے تعلقات کی بنیاد گذشتہ تاریخ پر ہے ضرورت ہے کہ حال کو ان تعلقات کی بنیاد بنایا جائے''۔ یورپ میں بعض غیر جانبدار اور منصف اہل قلم بھی گزرے ہیں جن کی تحقیقات وہاں پھیلی ہوئی اسلام کے خلاف عام روش کے برعکس تھیں۔ کلامرٹین، ویک دورانٹ، ٹوماس کارلایل، جاک ریسلر، ہوبرٹ جارج ولز، ہنری دی فاسٹری وغیرہ وہ یورپی مؤلفین ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی قدر ومنزلت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن یورپ کی اسلام دشمنی کے مزاج کی وجہ سے ان لوگوں کی تحریریں عام نہیں ہوسکیں۔ (لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی، صفحہ ۱۱۵)

مسلم قلم کاروں نے سیرت نبوی پر بہت کام کیا ہے ان کی نگارشات نے لوگوں کے دلوں کو آپ ﷺ کی محبت وعقیدت سے گرما دیا ہے اور ان کو فدائیانہ جذبات سے معمور کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں نعتیہ قصائد نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن اسلام کے تعلق سے یورپ کے نظریے کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ مغربی زبانوں میں بڑے پیمانے پر سیرت پر کام ہو اور اس میں فکری وعلمی طور پر ان اعتراضات کا جواب دیا جائے جو آپ ﷺ کی حیات طیبہ پر کیے گئے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی، صفحہ ۱۱۷)

ادب نبوی قرآن کریم سے مستفاد ہے:

ادب نبوی پر مولانا اظہار خیال کرتے ہیں کہ یہ کلام الٰہی سے مستفاد ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور آپ ﷺ کی زندگی اس کلام کی عملی تصویر ہے جیسا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''کان خلقہ القرآن''۔ یعنی آپ ﷺ قرآنی اخلاق کا آئینہ تھے اسی طرح آپ ﷺ کا کلام بھی کلام الٰہی سے قریب تر ہے اور قرآنی ادب کے تمام رنگ حدیث نبوی میں نظر آتے ہیں، احکام کا بیان ہو یا گزشتہ قوموں کے احوال وآثار کا بیان ہو یا تبشیر وانذار ہو یا انسانی طبیعت کی وضاحت، فطرت کا بیان، زندگی اور اس کے مختلف طریقوں کا بیان، انسان کے نوع بنوع حالات کی وضاحت نیز مختلف فنی واسلوبی خصوصیات ان سب میں ہم نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں قرآن کا عکس پاتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: لمحات من السیرۃ النبویۃ والأدب النبوی، صفحہ ۱۲۰)

خلاصہ کلام:

ادب نبوی پر مولانا علیہ الرحمہ کی تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس ادب کی اصل روح آفاقی محبت ورحمت اور نرمی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں آپ ﷺ کو ''رحمۃ للعالمین'' کہا گیا ''رحمۃ للمسلمین'' نہیں کہا گیا۔ جو کوئی بھی قومی اور دینی عصبیت سے پاک ہو کر رسول کریم ﷺ کے ارشادات پر مشتمل ادب کا مطالعہ کرے گا اس پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ رسول ﷺ کی سیرت اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ ان کے معاملات نیز ان کی تعلیمات میں سب سے نمایاں عنصر رحمت اور نرمی ہے۔ آج بڑی ضرورت ہے کہ ادب نبوی میں موجود عفو ودرگزر اور محبت وشفقت کے پہلوؤں کو عصری اسلوب میں پیش کیا جائے کیونکہ اسلام کے تعلق سے شک وشبہات کے شکار لوگوں خصوصاً اہل یورپ کے نظریے کو اس وقت تک نہیں بدلا جاسکتا جب تک کہ مغربی زبانوں میں بڑے پیمانے پر سیرت کا کام نہ ہو اور علمی وفکری طور پر ان اعتراضات کا جواب دیا نہ دیا جائے جو سیرت نبوی اور اسلامی نظام زندگی پر کیے گئے ہیں اور مسلسل کیے جارہے ہیں۔

☆☆☆

أعلام الأدب العربی فی العصر الحدیث-ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر فخر عالم
ریسرچ ایسوسی ایٹ شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ہندوستان علم وادب کا گہوارہ ہمیشہ سے ہی رہا ہے، اس ملک نے بڑی بڑی ہمہ جہت شخصیتیں وہستیاں پیدا کیں، جن سے اس ملک کا نام پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اگر ہم اس ملک کی تاریخ، علمی وثقافتی، سیاسی، سماجی، ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک علم کا بحر ذخار دکھائی دیتا ہے، اگر ایک طرف علم وادب وتحقیق کے میدان میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر مسعود عالم، علامہ مرتضی حسینی بلگرامی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، علامہ عبدالعزیز میمنی کی ہمہ جہت شخصیتیں دکھائی دیتی ہیں، تو دوسری طرف تصوف واخلاق رشد وہدایت وانسانیت پروری کے میدان میں شیخ نظام الدین اولیاء خواجہ معین الدین اجمیری، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی شخصیات اور ان کے کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، انہیں نامور شخصیات میں علم و ادب کا بحر زخار، قد آور صحافی، معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء عربی میگزین ''الرائد'' کے چیف ایڈیٹر، رابطہ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری، درجنوں اردو وعربی کتابوں کے مصنف، عالم جلیل، عہد ساز شخصیت مولانا واضح رشید حسنی ندوی کا ہے، ان کی پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء بمقام تکیہ کلاں رائے بریلی یوپی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی اس کی بعد ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا پھر ۱۹۵۱ء میں عربی زبان وادب میں رسوخ وکمال پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ فضیلت کا امتحان پاس کیا، ۱۹۵۳ء میں انٹر پاس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی زبان وادب میں ایم۔اے کیا۔اس طرح مولانا عربی، اردو اور انگریزی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے، نیز عربی ادب وتاریخ ونقد پر بے پناہ مہارت رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۳ تک آل انڈیا ریڈیو دہلی میں شعبہ عربی میں بحیثیت اناؤنسر اور بحیثیت عربی وانگریزی مترجم خدمت انجام دیتے رہے، اور اسی درمیان انہوں نے مغربی سیاست وتہذیب کا بھی گہرا مطالعہ کیا، اس کے علاوہ بہت سارے علمی، سیاسی وادبی انگریزی مقالات کا عربی میں ترجمہ کیا، اس کے بعد پھر ندۃ العلماء واپس آ گئے اور بحیثیت استاد عربی ادب ان کا تقرر ہوا اور تاحیات ندوۃ العلماء کی مختلف سرگرمیوں اور ذمہ داریوں سے وابستہ رہے، اور درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے، وہ موجودہ دور کے فکر اسلامی کے ماہرین میں سے تھے، عربی زبان و ادب میں تقریبا ۲۱ اور اردو زبان میں دس سے زائد کتابیں تصنیف کی، وہ نہایت سلیس وسادہ زبان لکھتے تھے، ان کی تحریروں میں ادب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے، ان کی سب سے اہم خصوصیت علم کی وسعت وگہرائی ہے، انہوں نے اپنا مطالعہ کسی فکر و خیال یا کسی ایک تہذیب وتمدن تک نہیں رکھا بلکہ انہوں نے ایک مایہ ناز محقق کی حیثیت سے تمام آداب وعلوم کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اپنی رائے پیش کی۔ تدریس میں عربی زبان وادب ان کا خاص موضوع ہے، عربی ادب کے مصادر ومراجع پر مشتمل ہے، عربی زبان وادب کے آخری دور یعنی عصر حدیث کے ادباء کی خدمات وحیات پر مشتمل ایک شاندار وشاہکار کتاب ''أعلام الأدب العربی فی العصر الحدیث'' کے نام سے تالیف کی، یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں دار الرشید لکھنؤ سے چھپی ہے اور مولانا محمد الرابع حسنی ندوی، ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب کے قیمتی مقدموں سے زیت تن ہے، یہ کتاب ۳۳۵ صفحات

پر مشتمل ہے، مؤلف نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ معاصر عربی ادب کے خصائص ومیزات پر مشتمل ہے اور نئے نئے موضوعات کے عناصر ترکیبی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، مؤلف نے اس باب میں ادب اسلامی کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد مصطفیٰ ہدارۃ کا نہایت قیمتی و پرمغز معلومات مقالہ شامل کیا ہے، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ ہدارۃ نے نہایت تفصیل سے جدید عربی ادب پر یورپی ادبیات کے اثرات وخصوصیات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ عربی ادب کے احیاء کا آغاز ۱۸۹۸ء میں فرانس کے مصر پر تسلط سے ہوا، فرانسیسیوں نے مصر میں اس سائنسی نقطۂ نظر اور تہذیب جدید کے دیگر لوازمات کی بنیاد رکھی جن سے عرب اور خاص طور سے اہل مصر اب تک ناواقف تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ مطبع کا قیام تھا جس سے نشر واشاعت کا آغاز ہوا۔(۱)

مصر پر نپولین (۱۷۶۹-۱۸۲۱) کے حملہ کا مقصد مصریوں کی خدمت نہیں تھا، دراصل فرانسیسی اس سے اور اس طرح کے دیگر اقدامات کے ذریعہ خود اپنی مقصد برآوری کے خواہش مند تھے، ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایک طرف انگریزوں کے ہندوستان پہنچنے کی راہ مسدود کر کے انہیں کمزور کر دیا جائے اور دوسری طرف ہندوستان میں ان کے مفادات کو نقصان پہنچایا جائے، یہی وجہ ہے کہ یہ اقدامات عربی ادب کے لئے براہ راست سود مند نہیں ثابت ہوئے، جن اخباروں کا فرانسیسیوں نے اجراء کیا وہ بھی اہل مصر کے لئے مفید نہیں تھے، کیوں کہ ان کی زبان فرانسیسی تھی، (۲) بالآخر فرانسیسیوں کو تین سال کی مختصر مدت میں مصر سے واپس چلا جانا پڑا۔(۳)۔

محمد علی (۱۸۰۵-۱۸۴۹) جو ترکش فوج میں ایک افسر تھا اس ملک کا حاکم بن گیا، اس نے علم وفن کی ترویج پر خصوصی توجہ مبذول کی، اس نے سب سے پہلے جدید تعلیم کے اداروں کی بنیاد رکھی جن میں سب سے اہم ''مدرسۃ الألسن'' تھا جس کا قیام ۱۸۳۶ء میں عمل میں آیا۔ اس سے قبل ۱۸۲۲ء میں بولاق، پرنٹنگ پریس کی داغ بیل پڑ چکی تھی، اور ۱۸۲۸ء میں عربی کا پہلا جریدہ ''الوقائع المصریۃ'' جاری ہو گیا تھا۔ مؤلف کتاب نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں مطالعہ وصحافت کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے مدارس واسکول بھی کھولے گئے اور اس زمانے کے ادباء نے فارسی، یونان اور ہندوستانی ادبیات سے استفادہ کیا، ان میں سب سے اہم نام رافع رفاعۃ طھطاوی (۱۸۰۱ء-۱۸۸۷ء) کا ہے، جو ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فرانسیسی زبان سیکھنے کے لئے یورپ گئے اور مصر واپس آ کر ''مدرسۃ الألسن'' میں ترجمہ نگاری کے کام میں مشغول ہو گئے۔(۴)۔

مؤلف کتاب نے دوسرے باب میں ان جدید ادباء وشعراء کے تراجم وکارناموں کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے اس تحریک جدید میں حصہ لیا، اور اپنی نگارشات سے جدید عربی ادب کے فروغ میں نمایاں مقام حاصل کیا، ان میں مصطفیٰ لطفی منفلوطی، محمد عبدہ، عقاد، المازن، محمود تیمور، طہ حسین، نجیب محفوظ جیسے ادباء قابل ذکر ہیں، مؤلف نے ان کے افکار اور ان کی نگارشات کی مثالیں پیش کی ہیں۔

مؤلف نے تیسرے باب کو خالص ادب اسلامی کے لئے مخصوص کیا ہے اور ادب اسلامی کے بڑے ادباء واساتذہ کے حالات قلم بند کئے ہیں نیز ان کے اسلوب کا نمونہ بھی بیان کیا ہے، جن میں سب سے پہلا ترجمہ عبدالرحمٰن الکواکبی (۱۸۴۸ء-۱۹۰۲ء) کا ہے ان کے اشعار کے نمونے بھی قلم بند کئے ہیں، اسی طرح الاستاذ محمد کرد علی، سید قطب الشھید، شیخ محمد غزالی، الاستاذ انور الجندی جیسے اسلامی اسکالرس کے حالات اور کارناموں کا ذکر ہے، اور ادب اسلامی میں انہوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں ان کا بھرپور تفصیلی ذکر کیا ہے۔

منجملہ یہ کتاب ریسرچ اسکالرس وعربی زبان وادب کے طالب علموں کے لئے نہایت ہی مفید وکارآمد ہے، اور عصر حدیث کے ادباء کے کارناموں کے نئے نئے دریچے کھولتی ہے۔

حواشی:

(۱) ماہر حسن فہمی: تطور الشعر العربی فی مصر: ص۹۲، القاہرۃ ۱۹۵۸ء

(۲) محمد فؤاد شکری: الحملۃ الفرنسیۃ وظھور محمد علی: ص۵۶، مطبع المعارف، مصر بدون السنۃ

(۳) شوقی ضیف: الأدب العربی المعاصر فی مصر: ص۱۲، قاہرۃ ۱۹۷۴ء

(۴) واضح رشید حسنی ندوی: أعلام الأدب العربی فی العصر الحدیث، ص۳۶، لکناؤ، ۲۰۰۹ء

☆☆☆

نظامِ تعلیم وتربیت (اندیشے، تقاضے اور حل)-ایک جائزہ

محمد حماد

ریسرچ اسکالر شعبۂ سنی دینیات، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ

خداوندِ قدوس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اور اس کی عزت وشرافت کا مدار جن اشیاء پر رکھا ان میں علم کو سب سے اہم اور مہتم بالشان شئ قرار دیا۔ کیوں کہ علم ہی وہ جوہر ہے جس کے ذریعہ انسان اچھے برے اور صحیح وغلط میں تمیز کر کے دیگر حیوانوں سے ممتاز ہو سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی تخلیق کے مقصدِ اصلیہ یعنی عبادتِ الٰہی کو بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔

علم کی قدر ومنزلت کی وجہ سے ہی مختلف ادوار میں اس کے حصول کے لئے الگ الگ نظام وجود میں آتے رہے اور اس وقت کی ضروریات کے مطابق حیاتِ انسانی کی ترقی اور بہتر کے حصول کا ایک اہم ذریعہ بنتے رہے۔ لیکن دورِ جدید میں معیارِ علم میں جس تیزی سے تنزلی آئی ہے، وہ تمام انسانیت کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہے، جس کو حل کرنے کے لئے بڑے بڑے قلم کاروں نے اپنے تجربات ومشاہدات اور تاریخی شواہد کو تحریری وتقریری شکل میں دنیا کے سامنے رکھا اور اس سنگین مسئلہ کا حل پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض نے قدیم نظامِ تعلیم وتربیت کی مکمل مخالفت کی اور اس کو غیر ضروری ٹھہراتے ہوئے نئے تقاضوں کے مطابق نصابِ تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینے کے مشورے دیئے۔ اور ان ہی میں سے بعض نے قدیم نصاب میں معمولی سے معمولی تبدیلی کو بھی گوارہ نہ کیا۔

ان کے علاوہ بعض ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے قدیم نصاب کی خصوصیات، مثلاً اخلاص وایثار، درس میں انہماک، طلبہ کا اساتذہ واہلِ دل سے تعلق اور اصلاحِ باطن وغیرہ کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں کے مطابق ایک ایسا نصاب مرتب کرنے کا مشورہ دیا جو زہر آلود مواد سے پاک ہو اور جس کی بنیاد مادہ پرستی، مذہبی تعصب اور طاقت وقوت کے حصول پر نہ ہو۔

ان ہی اعتدال پسند شخصیتوں میں سے ایک نام ہندوستان کی عظیم علمی درسگاہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے معتمدِ تعلیم مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کا بھی ہے۔ مولانا نے اپنے بعد ہزاروں کتب، مضامین، مقالات اور خطبات کی شکل میں اہلِ اسلام ہی نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے وہ سرمایہ چھوڑا جو اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے اسی غیر معمولی سرمایہ میں سے ایک مجموعۂ مضامین ''نظامِ تعلیم وتربیت: اندیشے، تقاضے اور حل'' ہے، جس کا مختصر سا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

نظامِ تعلیم وتربیت: اندیشے، تقاضے اور حل:

یہ، عالمی شہرت یافتہ رسائل وجرائد میں مولانا سید واضح رشید ندویؒ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جن کا تعلق تعلیم وتربیت اور اس کو پیش آمدہ مسائل کے حل سے ہے، جیسا کہ اس مجموعہ مقالات کے نام ''نظامِ تعلیم وتربیت: اندیشے، تقاضے اور حل'' سے مکمل وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین عربی میں تھے جن میں سے اکثر مضامین کا اردو ترجمہ ندوۃ العلماء لکھنو کے استاد عربی ادب وتفسیر مولانا محمد وثیق ندوی صاحب نے کیا ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

''بعض مضامین تعلیم کے موضوع پر ہونے والے سمیناروں میں پیش کئے گئے، اس میں ایک مضمون ندوۃ العلماء میں نصاب تعلیم کے

موضوع پر منعقد سمینار میں پیش کیا گیا، وہ عربی میں تھا اور اس کا ترجمہ مولوی محمد اکرم ندوی نے کیا تھا۔ بعض مضامین ''الرائد اور البعث الاسلامی'' میں شائع ہوئے ان مضامین کا ترجمہ مولوی محمد وثیق ندوی نے کیا، اس میں فقہ اکیڈمی میں پیش کئے گئے مضامین بھی ہیں اور علمی مجلّات میں شائع ہونے والے مضامین بھی'' (۱)

مذکورہ مجموعہ مضامین ۱۳۶ر صفحات پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جو آج کے مغرب زدہ ماحول میں انتہائی مفید اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی اجمالی ترتیب کچھ یوں ہے کہ فہرست مضامین کے بعد مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کی پیش گفتار ہے، جس میں آپ نے علم کی ضرورت، مغربی اور مشرقی نظام تعلیم کا فرق اور قدیم وجدید نظام تعلیم کے درمیان توازن کے ساتھ ساتھ مذکورہ مجموعہ کی افادیت واہمیت کو انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

پیش گفتار کے بعد مصنفؒ کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے جس میں آپ نے اس پورے مجموعہ مقالات کے نچوڑ کو بہت ہی عام فہم اور سادہ انداز میں بیان کیا ہے اور مغربی نظام تعلیم کے جو اثرات عائلی وسماجی زندگی پر پڑتے ہیں ان کو کھول کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''مغربی نظام تعلیم کی بنیادی خصوصیت اس کا مادی ضرورتوں سے مربوط ہونا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔جسکا اثر عائلی زندگی اور سماجی زندگی پر نمایاں طور پر محسوس کیا جاتا ہے'' (۲)

اس کے بعد ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کا ایک وقیع اور جامع مقدمہ ہے جس میں علم کی ضرورت، موجودہ عہد میں نظام تعلیم سے متعلق چند تلخ حقائق اور پھر ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مجموعہ مضامین کی اہمیت وافادیت سے بحث کی گئی ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ، ان شاء اللہ مذکورہ حقائق سے جو ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں واقفیت کا اچھا ذریعہ بنے گا'' (۳)

مقدمہ کے بعد مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب کی تقریظ ہے جو اس اعتبار سے موضوع سے مکمل مناسبت رکھتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ندوہ کے فارغ التحصیل اور تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر سے وابستہ ہیں، بنابریں آپ نے مشرق ومغرب اور قدیم وجدید نظامہائے تعلیم کو بہت قریب سے دیکھا اور تجربہ کیا ہے۔ آپ نے ۱۰ر صفحات پر مشتمل اس تقریظ میں ،عیسائی مبلغین ومفکرین کے نظریات، اسلام کے تئیں ان کے بغض وعناد اور مشنری کالجز واسکولوں کے مقصدِ قیام کو بیان کیا ہے۔ وہ مشنری اسکولوں اور تعلیمی اداروں کا مقصد اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فرنگی تہذیب کو مزید مستحکم کرنے اور ممکن حد تک اسلام کے دینی وثقافتی اثر کو ختم کرنے کیلئے عیسائی مشنریوں نے مسلمان ملکوں میں اعلی معیار کے اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کئے'' (۴)

پیش گفتار، پیش لفظ، مقدمہ اور تقریظ کے بعد اصل مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو کہ کل گیارہ مضامین ہیں۔ یہ تمام کے تمام اپنے انداز تحریر، فکری اسلوب، تاریخی حقائق، عینی شواہد، قصص وواقعات، امثال وحکم اور دیگر خصوصیات کی بنا پر اپنی مثال آپ ہیں۔ اور آیت قرآنی کے جز '' رأیت احد عشر کو کبا'' کے مماثل فکر اسلامی کے فلک پر چمکنے والے ایسے ستارے ہیں جن کی روشنی میں مغرب زدہ نابینا مقلد کو اسلام وانسانیت کی صحیح روشنی میں صراط مستقیم نصیب ہوسکتی ہے، بشرط یہ کہ وہ تعصب کی عینک کو اتار کر عقل سلیم کے ساتھ غور وفکر کرے۔

مولانا محمد واضح رشید صاحب چوں کہ دینی علوم میں مہارت اور ادب عربی میں تخصص کے ساتھ ساتھ مغربی نظام تعلیم وتمدن، مغربی نظام حیات اور مغربی فکر وفلسفہ سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے، اس لئے اعتماد، حق جوئی، اعتدال اور رائج الوقت نظامہائے تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں سے واقفیت آپ کا خاصہ رہا ہے، اور یہی چیز آپ کے ان تمام مضامین میں نظر آتی ہے، اگر ان مضامین کی فہرست اور عناوین پر نظر ڈالی جائے تو وہ کچھ یوں ہے کہ پہلا مضمون ''صلیبی جنگوں کے بعد'' ۱۲ر صفحات پر مشتمل ہے، دوسرا ''تجدد کے نام پر تقلید مغرب کی دعوت'' ۷ر صفحات پر، تیسرا ''سامراجی ذہنیت'' ۵ر صفحات پر، چوتھا ''سامراجی تربیت کے اثرات'' ۴ر صفحات پر، پانچواں ''تعلیم وتربیت کے قدیم

وجدید عناصر''، ۱۴؍صفحات پر، چھٹا ''قدیم نظامِ تعلیم کی خصوصیات''، ۷؍ صفحات پر، ساتواں ''نصابِ تعلیم اور دعوتی تقاضے''، ۱۴؍صفحات پر، آٹھواں ''نصابِ تعلیم میں عربی زبان وادب کی اہمیت''، ۱۰؍صفحات پر، نواں ''اسلامی نظامِ تربیت کے اثرات''، ۱۶؍صفحات پر، دسواں ''ثقافتی پروگرام اسلامی تناظر میں''، ۷؍صفحات پر اور گیارہواں وآخری مضمون ۶؍صفحات پر مشتمل ہے، جس کا عنوان ہے ''نصابِ تعلیم سے زہر آلود مواد کے ازالہ اور عمدہ نصابِ تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت''۔

اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو یہ سب مضامین ایک دوسرے سے ایسے مربوط ہیں کہ قاری کو یہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ سب کے سب الگ الگ مواقع اور ماحول میں، علیحدہ علیحدہ مقالہ خوانوں اور سامعین کے پیشِ نظر مختلف جرائدورسائل کے لئے تحریر کئے گئے ہیں؛ پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ مقالات نہیں، مستقل طور پر لکھی گئی کوئی کتاب ہے۔ جس میں ہر بعد والا مضمون ماقبل سے کلی طور پر مربوط ومنضبط ہے۔ جس کی وجہ سے مصنف کے استحضارِ ذہنی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مصنف کا منہجِ تحریر:

مولانا محمد واضحؒ ایک ادیب، صحافی، ماہر استاذ اور معتمد تعلیم ندوۃ العلماء جیسے غیر معمولی عہدوں پر برس ہا برس جلوہ افروز رہے۔ آپ نے دنیا کی بے شمار اقوام وملل کے عروج وزوال کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی نفسیات کو بہت قریب سے پڑھا ہے۔ بطورِ خاص مغربی تہذیب وثقافت پر آپ کو مکمل عبور حاصل ہے۔ اور اس تہذیب وثقافت کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ بھی آپ کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ ہندوستان پر برطانیہ کی فکری وثقافتی یلغار کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں بھی برطانیہ نے یہی طریقہ اپنایا، اس نے انگریزی زبان کو تہذیب وثقافت اور عام بول چال کی زبان بنانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، حالاں کہ خود ہندوستان بہت سی مقامی ترقی یافتہ زبانوں کا گہوارہ ہے۔'' (۵)

اس مجموعۂ مضامین کے مطالعہ سے جو بات سب سے زیادہ عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آج ہم جس نظامِ تعلیم کو سب سے زیادہ مؤثر اور فائدہ مند تصور کرتے ہیں؛ یعنی مغربی نظامِ تعلیم وتربیت اس کی بنیاد دراصل اس بغض وعناد پر ہے جو عیسائی مبلغین کو اسلام اور مصادرِ اسلام قرآن وحدیث سے ہے۔ جیسا کہ مصنف مبلغین عیسائیت کی آرا کو ذکر کرتے ہوئے لویس ماسینیون کا قول تحریر فرماتے ہیں:

''وہ مشرقی طلبہ جو فرانس تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں ان کو عیسائی رنگ میں رنگنا ضروری ہے۔'' (۶)

اس مجموعہ میں ایک مضمون ''تجدد کے نام پر تقلیدِ مغرب کی دعوت'' ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر نتیجہ کو بلا کسی روک ٹوک اور لاگ لپٹ کے پوری ایمانداری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہیں بھی قاری کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیا کہ اب جب کہ مسلم ممالک میں اپنی بے شمار جامعات اور مدارس موجود ہیں تو وہ پھر کیوں کسی ذہنی غلامی کا شکار ہوں گے؟ اس سوال کے جواب کے طور پر آپ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی اس ترقی کے بعد آج بھی ان اداروں میں، افراد میں جس جوہر اور جس متاعِ گرانمایہ کی کمی ہے وہ ہے آزادیٔ فکر، خود اعتمادی، اجتہاد اور اختراع۔ وہ آج مغرب سے آزاد ہو کر بھی ذہنی غلامی کے شکار ہیں۔'' (۷)

اس مجموعۂ مضامین کے مصنف چوں کہ ایک متدین اور اسلامی شعائر کے پابند ہیں، چوں کہ مذہب انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ مذہبی تعلیمات کے بغیر اس عالمِ فانی میں کوئی انسان کسی بھی کام کو بحسن وخوبی انجام نہیں دے سکتا؛ لیکن سمجھا یہ جاتا ہے کہ مغربی ثقافت کی ترقی کا راز مذہب سے بغاوت ہے۔ اسی وجہ سے مصنفؒ مذہب کی ضرورواہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مذہب ایک انسانی ضرورت ہے، اور کوئی بھی انسان اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ مذہب ہی انسان کے لئے کامیابی وکامرانی اور روحانی سکون کا سرچشمہ ہے۔ اور اس روحانی سعادت سے محروم کوئی بھی معاشرہ حقیقی سعادت حاصل نہیں کرسکتا۔'' (۸)

اس مجموعہ میں شامل مضامین کا ایک خاص منہج یہ بھی ہے کہ اس میں مصنفؒ نے صرف واقعات کے ذکر اور تعلیمی وتربیتی نظاموں کی

خامیوں اور خوبیوں کو ہی بیان نہیں کیا ہے؛ بلکہ ان کی وجوہات سے بھی مکمل بحث کی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر علم کا حصول صرف مال و جاہ کی خاطر ہو، اور بڑی بڑی ڈگریاں اس لئے حاصل کی جائیں تاکہ ان کی وجہ سے ''تعیش، نفس پرستی، لذتوں اور عیاشیوں کا گر سیکھا جا سکے'' تو پھر تعلیم یافتہ اور جاہل کے درمیان اخلاقیات، ادائیگیٔ حقوق، چال چلن اور سماجی و معاشی معاملات میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ تعلیم یافتہ طبقہ کی برائیوں کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آج تعلیم یافتہ طبقہ میں جو خرابیاں اور اخلاقی وفکری انحراف پایا جاتا ہے اس کا.....سب سے بنیادی سبب تعلیم کا ملحدانہ اور مادی فلسفہ ہے۔ جو مادہ پرست اور ملحدانہ مغربی تہذیب کی دین ہے۔''(۹)

ان تمام مضامین سے مصنفؒ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ دنیا میں رائج قدیم وجدید نظامہائے تعلیم وتربیت کی تاریخ پر روشنی ڈالیں اور بس۔ بلکہ ان کا مقصدِ اصلی طالبانِ حق کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا ہے جو موت کے دہانے پر کھڑی انسانیت کے لئے نجات دہندہ کی حیثیت رکھتا ہو اور جس کو رائج کر کے ایسے علماء وفضلاء تیار کئے جاسکتے ہوں جو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ جدید ضروریاتِ زندگی سے بھی مکمل واقفیت رکھتے ہوں۔ اس وجہ سے موصوفؒ نے اولاً ان تمام خرابیوں کو ذکر کیا ہے جن کے رہتے ہوئے کوئی بھی نظام جامع اور مکمل نہیں ہوسکتا۔ اور پھر ان اسباب کو ذکر کیا ہے جو ایک عمدہ نظامِ تعلیم وتربیت کے لئے ازحد ضروری ہیں۔

اس مجموعہ میں مصنفؒ نے صرف تصورات وخیالات پر کسی نظام کی تائید وتردید نہیں کی؛ بلکہ اگر کسی نظام کی تردید کی ہے تو اس کے لئے دلائل، تاریخی شواہد اور ان حضرات کے اقوال نقل کئے ہیں جو اس نظام کے روحِ رواں مانے جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ نظامِ تعلیم وتربیت کی آڑ میں عیسائیت کی ترویج اور اسلام دشمن عناصر کی پشت پناہی پر دلائل پیش کرتے ہوئے عیسائی مبلغہ انا مالیگاں کا قول نقل کرتے ہیں:

''اسلام کے قلعہ تک پہونچنے کا راستہ، تعلیم کے راستے سے مختصر کوئی راستہ نہیں ہے، بلاشبہ یہ تعلیم نئی نسل کو مذہب سے قریب کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اور اس سے جو اثر ڈالا جائے گا وہ اثر نہ مٹنے والا ہوگا۔ اور اس کا اثر ان لوگوں پر بھی پڑے گا جو عنقریب اپنے ملکوں کے رہنما بنیں گے۔''(۱۰)

مصنفؒ کا تعلق چوں کہ ''مہد تا لحد'' عربی زبان وادب سے رہا ہے اس لئے ان کی دوسری نگارشات کی طرح ان مضامین میں بھی عربی سے ان کے لگاؤ اور اس کے لئے ان کی تڑپ صاف ظاہر ہوتی ہے۔ پھر چوں کہ عربی اسلام کے مصادرِ اصلیہ کی بھی زبان ہے؛ اس لئے جدید نظامِ تعلیم میں دیگر اسلامی شعائر کی مانند اس زبان کے ساتھ بھی بغض وعناد کا معاملہ روا رکھا گیا۔ عیسائی سامراج نے فصیح عربی زبان کے خلاف مہم چلائی اور اس کی تعلیم وتربیت کو غیر ضروری قرار دیا۔ اسی لئے مصنفؒ نے عربی کی اہمیت وافادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''نصابِ تعلیم میں عربی زبان وادب کی اہمیت'' کے عنوان سے دس صفحات پر مشتمل ایک جامع مضمون تحریر فرمایا ہے۔

مذکورہ مضامین کے مصنف کا پیدائشی اور تعلیمی وتربیتی تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جس کو اسلامی تہذیب وثقافت کی فکر کا ایک وافر حصہ عطا کیا گیا ہے۔ اور بطورِ خاص آپ نے اس شخصیت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے جس کو مفکرِ اسلام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس لئے آپ کی تحریروں میں بھی اسلامی تہذیب وثقافت کی فکر کا پایا جانا لازمی امر ہے۔

ان مضامین کے قاری کے سامنے جو ایک خاص بات عیاں ہوتی ہے وہ مصنفؒ کا ''حکیمانہ طرز'' ہے۔ یعنی جیسے ایک حکیم اولا مرض کی تشخیص کرتا ہے، پھر مریض کو چند ادویہ کے ساتھ کچھ اشیاء سے پرہیز کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح سید واضح صاحبؒ نے پہلے نظامِ تعلیم وتربیت میں پائے جانے والے امراض، جیسے: مادہ پرستی، سامراجیت اور مذہبی بغض وعناد کی تشخیص کی ہے اور پھر طالبِ علم کے لئے ایک صحیح نظام پیش کیا ہے۔ اس نظام میں کچھ چیزوں سے پرہیز کی بھی تلقین ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ اس مجموعۂ مضامین کے آخر میں رقم طراز ہیں:

''اس لئے حالات کا تقاضہ ہے کہ نوخیز بچوں کی عمدہ تعلیم وتربیت کے لئے نہایت مؤثر ودل آویز اور دل چسپ ادبی کتابیں

تصنیف کی جائیں۔ درحقیقت یہ صرف عرب دنیا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری اسلامی دنیا کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان کے نصابِ تعلیم میں بھی شدت سے ہمیں اس کمی کا احساس ہے۔ صرف درسی کتابوں کی تہذیب وتنقیح، نصابِ تعلیم سے زہرآلود مواد کا ازالہ اور عمدہ نصابِ تعلیم مرتب کردینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ثقافتی میدان میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔'' (۱۱)

خصوصیات:

اس مجموعہ میں شامل تمام مضامین بے شمار خصوصیات کے حامل ہیں۔ پھر دورِ حاضر میں نصابِ تعلیم وتربیت میں ہورہی دن بدن تنزلی کے پیش نظر تو ان مضامین کی وقعت اور قدر ومنزلت اور دوچند ہوجاتی ہے اور اس مجموعہ میں پیش کردہ ہر ہر مشورہ اور زیادہ مخصوص ہوجاتا ہے۔ ان میں سے چند خصوصیات درجِ ذیل ہیں:

(۱) اس مجموعہ مضامین کی سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ، یہ اپنے قاری کی قوتِ فکر کو مہمیز کرتا ہے۔

(۲) اس میں مغربی مفکرین کی، ثقافتِ اسلامیہ کے بغض وعناد سے پر وہ تحریریں اور اقوال ہیں جن کو مصنفؒ نے بطورِ استدلال ذکر کیا ہے۔

(۳) یہ تمام مضامین اپنے قاری کے سامنے مغربی نظامِ تعلیم کی صحیح اور صاف ستھری تصویر کشی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے تمام غلط فہمیوں کا مکمل ازالہ ہوجاتا ہے۔

(۴) ان تمام مضامین میں قاری کے سامنے ایک ایسے نظامِ تعلیم کو پیش کیا گیا ہے جو ایک طرف تو قدیم نظامِ تعلیم کی طرح اخلاقِ حسنہ، ایثار اور اخلاص جیسے اوصافِ عالیہ سے متصف ہو اور دوسری جانب دورِ حاضر کے تمام تقاضوں کی بحسن وخوبی تکمیل کرتا ہو۔

(۵) دورِ حاضر میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت کے پیشِ نظر، اس میں ذرائع ابلاغ کے صحیح استعمال اور نظامِ تعلیم وتربیت میں اس کے اثرات کو انتہائی عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۶) اس میں نظامِ تعلیم وتربیت پر پڑنے والے ثقافتی اثرات کو بھی عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

(۷) برِصغیر میں ایک طویل عرصہ سے رائج نظامِ تعلیم ''درسِ نظامی'' اور اس کے فوائد ونقصانات کو بھی عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۸) ان مضامین میں صرف نظامِ تعلیم وتربیت کو ہی بیان نہیں کیا گیا؛ بلکہ مغرب کو اسلام سے بحیثیت دین ومذہب جو بغض وعناد ہے اس کو بھی مکمل دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(۹) یہ مجموعہ اپنے قاری کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیتا؛ بلکہ اس کو ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے، اور احساسِ برتری کی ضرورت کو بھی بیان کرتا ہے۔

(۱۰) اس مجموعہ کی ایک خصوصیت اس کا حکیمانہ پہلو ہے، کہ یہ پہلے نظامِ تعلیم وتربیت میں پائی جانے والی خامیوں اور امراض کی تشخیص کرتا ہے، پھر ان کا علاج تجویز کرتا ہے اور زہرآلود مواد سے پرہیز کا بھی مشورہ دیتا ہے۔

الغرض سید مولانا محمد واضح رشید ندویؒ کے مضامین کا یہ مجموعہ ''نظامِ تعلیم وتربیت'' بے شمار عینی شواہد، تاریخی دلائل، اور دیگر خصوصیات سے آراستہ ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی اقدار میں تنزلی اور معیارِ تعلیم میں درستگی، جیسے مسائل کے لئے یہ ایک عمدہ اور بہترین حل پیش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جو مغربی تعلیم کے مطابق تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بھی اتنا ہی کارگر اور مفید ہے جتنا کہ دینی تعلیم کے پروردہ حضرات کے لئے۔

حوالے:

(۱) مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ، نظامِ تعلیم وتربیت: اندیشے، تقاضے اور حل (ترجمہ وترتیب: محمد وثیق ندوی) ناشر: دارالرشید لکھنؤ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰۱۳ء، ص: ۱۸
(۲) ایضاً، ص: ۱۶
(۳) ایضاً، ص: ۲۳
(۴) ایضاً، ص: ۲۷
(۵) ایضاً، ص: ۳۶
(۶) ایضاً، ص: ۳۸
(۷) ایضاً، ص: ۴۹
(۸) ایضاً، ص: ۵۸
(۹) ایضاً، ص: ۷۱
(۱۰) ایضاً، ص: ۳۸
(۱۱) ایضاً، ص: ۱۳۶

☆☆☆

تاریخ درگذشت

دانشمندِ بزرگ مولانا واضح رشید حسنی ندوی

حیف آن واضحِ رشید کہ بود
بردہ از اھلِ عصر و مصر سبق
درھمہ قول وفعل و خواندو نوشت
از برای علای کلمۂ حق
حامیِ اتحادِ ملت ھا
دور تر از نزاعھای فرق
عابد و زاھدِ خجستہ خصال
عالمِ بی ھمال و عارفِ حق
چون بہ ناگاہ سوی خلد شتافت
ھمچو تیری کہ می جھد زر شق
خویش و بیگانہ نہ را گذاشتہ در
لجّۂ درد و اضطراب و قلق
سالِ فوتش رئیسِ غمدیدہ
خواست چون ثبت ساختن بہ ورق
گفت ھاتف کہ با ا ضا فۂ ''نام''
۹۱
''دست او را گرفت رحمتِ حق''
۱۹۲۸
۹۱
۲۰۱۹ء (۱۴۴۰ھ)

اثر قلم:

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی